

سخنوران
شاہجہانپور

میاں اکرم

**Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.**

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ



سُخْرُورِ اَبِشَاهِجَانِ پُورِ

ایک تذکرہ

مُصَنَّف:



مُبَارِک شمیم

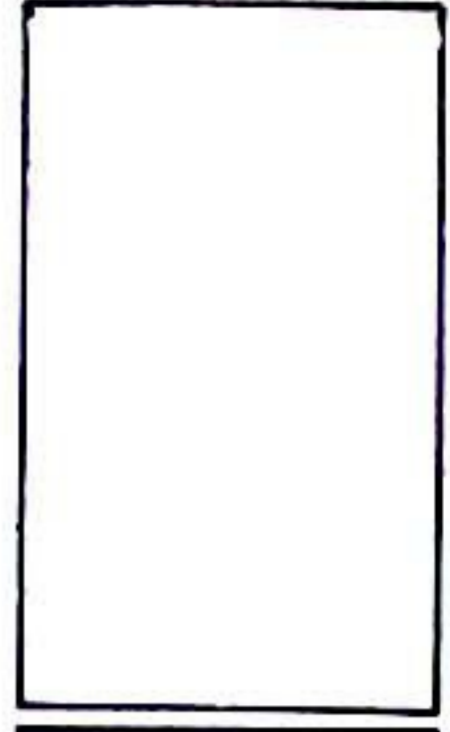
زیر اہتمام



تخلیق کار پبلیشرز

۱۷۷۹-کوچہ دکھنی رانے، دریا گنج، نئی دہلی، ۲۰۰۰۱۱

129957



- نام کتاب : سُخنوران شاہجہاں پور
- ناشر و مصنف : مبارک شمیم
- پتہ : محلہ احمد پورہ، شاہجہاں پور۔ ۲۲۴۰۱ (یو پی)
- اشاعت : انیس سو پچانوے (۱۹۹۵ء)
- تعداد : ۲۰۰ چار سو
- قیمت : ایک سو پچاس روپے @ Rs. 150/-
- زیر اہتمام : انیس امر وہوی
- تخلیق کار پبلشرز، ۱۷۷۹۔ کوچہ دکھنی رائے، دریا گنج، نئی دہلی، ۱۱۰۰۰۲
- کتابت : محمد عارف، سہسوانی
- سرورق : ساجد
- مطبوعہ : ٹمرا فینٹ پرنٹرس، ۱۳۰۸، کلاں محل، دریا گنج، نئی دہلی، ۱۱۰۰۰۲

صلنے کے پتے:

- اہلو والیہ بک ڈپو، ۹۹۸۸/۲۹، نیورہنٹ روڈ، نئی دہلی، ۱۱۰۰۰۵
- ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، گلی کیس، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی، ۱۱۰۰۰۴
- موڈرن پبلیشنگ ہاؤس، ۹۔ گولامارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی، ۱۱۰۰۰۲
- مکتبہ جامعہ ٹیڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی، ۱۱۰۰۰۴

T.P. 32

SUKHANVARAN-E-SHAHJAHANPUR

1995

By, Mubarak Shameem

@ Rs. 150/-

Published by:

Takhleeqkar Publishers, 1779, Kucha Dakhni Rai, Daryaganj, New Delhi-2

برادر عزیز

قہر ریسرچ

کے نام

جو شاہجہاں پور کی ادبی اور تہذیبی روایت کا امین ہے

اور جس کی مسلسل تحریک و تاکید سے یہ تذکرہ تکمیل کو پہنچ سکا۔

○

اس کے کتابے کو اشاعت میں فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ
انٹرنیشنل کالجز و میڈیکل کالج لکھنؤ شامیل ہے

فہرست

مقدمہ _____ مصنف

شعرائے قدیم

- | | | | |
|----|-------|---------------------------------|-----|
| ۳۰ | _____ | مولوی سید عبدالنبی کانٹوی | -۱ |
| ۳۲ | _____ | نواب بہادر خاں چغتیا بہادر | -۲ |
| ۳۳ | _____ | نواب زین الدین خاں بہادر زین | -۳ |
| ۳۸ | _____ | لالہ سکھ رائے مسرور | -۴ |
| ۵۰ | _____ | محمد عمر خاں وہبی | -۵ |
| ۵۱ | _____ | مولوی سید غلام جیلانی رفعت | -۶ |
| ۵۲ | _____ | شیخ احمد خاں ملّا منوں نثار | -۷ |
| ۵۳ | _____ | دیوان دولت رائے مبتہج | -۸ |
| ۵۴ | _____ | منشی رام کشن فرحت | -۹ |
| ۵۵ | _____ | لالہ پران سکھ مشہور | -۱۰ |
| ۵۵ | _____ | لالہ بہت پرشاد مسرور | -۱۱ |
| ۵۷ | _____ | مولوی محمد عابد خاں مجروح | -۱۲ |
| ۵۸ | _____ | منشی عوض رائے مسرت | -۱۳ |
| ۶۱ | _____ | ملّا سید شیر علی عاجز | -۱۴ |
| ۶۲ | _____ | نواب فیض الدین خاں امید | -۱۵ |
| ۶۳ | _____ | پیرزادہ شمس الدین سعدی میاں سعد | -۱۶ |
| ۶۴ | _____ | لالہ موتی لال ساقی | -۱۷ |

- ۱۸- نواب غلام حسین خاں حسین ۷۵
- ۱۹- قاضی سید سرفراز علی سید ۷۶
- ۲۰- شیخ احمد خاں اظہر ۷۷
- ۲۱- منشی آننت رام خاموش ۷۸
- ۲۲- لالہ بساون لال مخطوط ۷۹
- ۲۳- لچھی نارائن مخطوط ۸۰
- ۲۴- منشی نند کنوار نیاز ۸۱
- ۲۵- مولوی قطب الدین طالب ۸۱
- ۲۶- منشی رفعت علی رفعت ۸۶
- ۲۷- منشی سوہن لال حقیر ۹۰
- ۲۸- قاری شیخ بہادر علی قاری ۹۱
- ۲۹- منشی سید آل نبی فگار ۹۳
- ۳۰- شیخ کریم بخش فرقت ۹۴
- ۳۱- شیخ ستار بخش راقم ۹۵
- ۳۲- حکیم حافظ محمد معشوق علی جوہر ۹۶
- ۳۳- سید امداد علی میاں ملا شاد ۹۸
- ۳۴- یونس خاں یونس ۱۰۰
- ۳۵- لالہ لکھپت رائے باقل ۱۰۱
- ۳۶- خان زادہ مینڈو خاں خان ۱۰۱
- ۳۷- حافظ سید حبیب الحق حبیب ۱۰۳
- ۳۸- رائے کرشن سہائے فرحت ۱۱۱
- ۳۹- سید محمد حسن میاں عرشی ۱۱۳
- ۴۰- حافظ شہار احمد خاں تائب ۱۱۶
- ۴۱- مولوی سخاوت حسین سنخا تلہری ۱۱۷
- ۴۲- منشی احسان علی خاں احسان ۱۲۱

۱۲۳	نواب محمد جمیل الدین خاں یاس	-۴۳
۱۲۴	محمد وصی علی خاں وصی	-۴۴
۱۲۵	علیم احمد حسین خاں دانش	-۴۵
۱۲۶	عظمت علی ارشاد	-۴۶
۱۲۷	میر فضل علی فضل	-۴۷
۱۲۸	سید شریف الحسن فوق	-۴۸
۱۲۹	سید محمد علی میاں خیال	-۴۹
۱۳۳	سید منور علی سحاب	-۵۰
۱۳۵	بابورام بہادر احقر	-۵۱
۱۳۵	لالہ یگانہ	-۵۲
۱۳۶	نواب کرامت اللہ خاں کرامت	-۵۳
۱۳۷	شیخ عنایت حسین عنایت	-۵۴
۱۳۷	منشی سیوارام جوہر	-۵۵
۱۳۸	منشی امین خاں امین	-۵۶
۱۳۹	سید احمد شاہ مشیر	-۵۷
۱۳۹	محمد ریاض الرضا خاں فروغ	-۵۸
۱۴۰	منشی ہری رام خورم	۵۹
۱۴۰	منشی دیارام دانا	-۶۰
۱۴۱	مولوی دوست محمد خاں	-۶۱
۱۴۱	منشی پدم سکھ فائر	۶۲
۱۴۲	فدا "دی سلیو آف لو"	-۶۳
۱۴۳	بابو محمد حسن خاں احسن	-۶۴
۱۴۳	منشی محمد عزیز اللہ خاں اثر	-۶۵
۱۴۳	منشی عطار اللہ خاں عطا	-۶۶
۱۴۴	منشی حسمت اللہ خاں حسمت	۶۷

۱۴۵	_____	رائے اجودھیا پر شاد زیبا	۶۸
۱۴۵	_____	منشی اسرار حسن خاں اسرار	۶۹
۱۴۶	_____	منشی سخاوت علی خاں سخا	۷۰
۱۴۶	_____	لالہ مہتاب رائے رغبت	۷۱
۱۴۷	_____	محمد حسن علی خاں حسن	۷۲
۱۴۷	_____	منشی محمد فرحت اللہ خاں فرحت	۷۳
۱۴۸	_____	مولوی احمد خاں احمد	۷۴
۱۴۸	_____	امام الدین خاں ناظر	۷۵
۱۴۹	_____	منشی مقصود علی خاں مقصود	۷۶
۱۴۹	_____	ہدایت اللہ ہدایت	۷۷

بیسویں صدی کے شعراء

۱۵۲	_____	حکیم مولوی ضمیر حسن خاں دل	۷۸
۱۵۶	_____	روشن علی خاں روشن وارثی	۷۹
۱۵۷	_____	سید حسین احمد میاں بیباک	۸۰
۱۵۹	_____	نواب ناظم علی خاں ہجر	۸۱
۱۶۳	_____	منظہر علی خاں ابرہ	۸۲
۱۶۴	_____	انوری جہاں بیگم حجاب	۸۳
۱۶۶	_____	منشی شیخ علی اختر اختر	۸۴
۱۶۷	_____	منشی سید منظور علی - ارشاد	۸۵
۱۶۸	_____	پنڈت جگموہن ناتھ رینہ شوق	۸۶
۱۷۰	_____	سید تصدق حسین قرارہ	۸۷
۱۷۰	_____	مولوی عبدالحکیم سیف	۸۸
۱۷۳	_____	حکیم سلامت اللہ خاں قادری سلامت	۸۹

۱۷۵	نواب حیدر علی خاں حیدر	-۹۰
۱۷۶	حاجی میر تمبل حسین تمبل	-۹۱
۱۷۶	حکیم حشمت اللہ خاں قیس	-۹۲
۱۷۷	منشی عابد حسین عابد مینائی	-۹۳
۱۸۰	سید ظہور احمد وحشی	-۹۴
۱۸۶	محمد علی حسین خاں برق	-۹۵
۱۸۷	حاجی محمد عتیق اللہ خاں آذر	-۹۶
۱۸۸	مولوی سید شرف الدین یاس	-۹۷
۱۸۹	فقیر محمد خاں فقیر	-۹۸
۱۹۰	مولوی حمید الزہاں خاں حمید	-۹۹
۱۹۲	شہید اشفاق اللہ خاں حسرت وارثی	-۱۰۰
۱۹۲	نواب نیاز الدین خاں نیاز	-۱۰۱
۱۹۵	شیر محمد خاں شفق	-۱۰۲
۱۹۶	محمد اللہ خاں عشق	-۱۰۳
۱۹۷	محمد مقبول حسن خاں شیدا	-۱۰۴
۱۹۸	منشی محمد آل نبی خاں ارمان	-۱۰۵
۱۹۸	منشی نیاز حسن خاں بیدل	-۱۰۶
۱۹۹	لارہ منوں لال روشن	-۱۰۷
۲۰۰	منشی منی لال درس	-۱۰۸
۲۰۰	پروفیسر عبدالسمیع خاں نکہت	-۱۰۹
۲۰۳	مولانا ابوالوفار عارف	-۱۱۰
۲۰۵	علامہ اختر علی تلہسری	-۱۱۱
۲۰۹	حضرت صدیق حسن اسعد	-۱۱۲
۲۱۲	سید مختار احمد میاں مختار	-۱۱۳
۲۱۳	بابو طفیل احمد نامی	-۱۱۴

۲۱۳	مخفوظ علی محفوظ	-۱۱۵
۲۱۵	محمد جمیل احمد خاں کوکب	-۱۱۶
۲۱۸	مولوی انوار احمد انوار	-۱۱۷
۲۲۰	بابو جگدیش سہائے سکسینہ	-۱۱۸
۲۲۳	منشی محمود حسن زار	-۱۱۹
۲۲۴	کریم الرضا خاں رضا	-۱۲۰
۲۲۵	فضل الرحمن خاں رحمن	-۱۲۱
۲۲۶	علیم حبیب الرحمن خاں حبیب	-۱۲۲
۲۲۷	سید امانت حسین ربطا	-۱۲۳
۲۲۸	نبی حسین خیال مینائی	-۱۲۴
۲۳۰	اشفاق حسین رمز	-۱۲۵
۲۳۲	شیخ فیض الدین اثر	-۱۲۶
۲۳۳	شاہ محمد ہاشم - ہاشم	-۱۲۷
۲۳۳	منشی عبدالقدوس بیدل	-۱۲۸
۲۳۴	منشی پیارے لال پذیر تلہری	-۱۲۹
۲۳۴	منشی سخاوت حسین سخا	-۱۳۰
۲۳۵	منشی عبد الحفیظ عیش	-۱۳۱
۲۳۶	حبیب حسن خاں حبیب	-۱۳۲
۲۳۶	سید محمد سلطان سلطان	-۱۳۳
۲۳۷	منشی شفیع اللہ خاں شفا	-۱۳۴
۲۳۸	مفتی سید محمد مہدی حسن آزاد	-۱۳۵
۲۳۹	بابو مکٹ بہاری لال حرماں	-۱۳۶
۲۳۹	منشی چھیدا لال شیدا	-۱۳۷
۲۴۰	ممتاز اللہ خاں ممتاز	-۱۳۸
۲۴۱	سید احمد حسین شوق	-۱۳۹

۲۴۲	منشی مقبول حسن خاں کیت	-۱۴۰
۲۴۳	عبدالجمیل خاں جمیل	-۱۴۱
۲۴۴	ماسٹر شانتو سنگھ باریق	-۱۴۲
۲۴۵	سید ارشاد حسین پیارے میاں رشید	-۱۴۳
۲۴۷	اشفاق علی خاں اشفاق	-۱۴۴
۲۴۹	عبدالماجد محمد میاں شفق	-۱۴۵
۲۵۰	محمد عشرت اللہ عشرت	-۱۴۶
۲۵۱	حامد علی خاں حامد مینائی	-۱۴۷
۲۵۲	حامد حسین حامد مینائی	-۱۴۸
۲۵۳	حکیم احمد علی خاں وفا	-۱۴۹
۲۵۵	محمد صنعت اللہ خاں صنعت	-۱۵۰
۲۵۶	مظفر شاہ بھہا پوری	-۱۵۱
۲۵۷	سید حسن اختر	-۱۵۲
۲۵۸	راز شاہ بھہا پوری	-۱۵۳
۲۵۹	منشی محمد اظہار حسین اظہر	-۱۵۴
۲۶۰	مبارک شمیم	-۱۵۵
۲۶۳	مشیر جھنجھانوی	-۱۵۶
۲۶۵	عاشق علی عاشق	-۱۵۷
۲۶۶	احمد اللہ خاں کنفی	-۱۵۸
۲۶۷	عبدالرحیم خاں درد	-۱۵۹
۲۶۸	شمس الدین احمد شمس	-۱۶۰
۲۶۹	لیاقت حسین لیاقت تلہری	-۱۶۱
۲۷۱	حنیف اسعدی	-۱۶۲
۲۷۳	شبیم رومانی	-۱۶۳
۲۷۴	قمر رئیس	-۱۶۴

۲۸۰	قمر الدین قمر	-۱۶۵
۲۸۱	خالد یوسف	-۱۶۶
۲۸۳	نکبت بریلوی	-۱۶۷
۲۸۵	سید فضل حق حسرت	-۱۶۸
۲۸۶	ہدایت اللہ خاں بیڈھب	-۱۶۹
۲۸۸	محمد خاں شاگر	-۱۷۰
۲۸۹	احمد اللہ خاں شاکی	-۱۷۱
۲۹۰	بابور امیشور پر شاد چوچ	-۱۷۲
۲۹۱	ریاست علی خاں ریاست	-۱۷۳
۲۹۲	نشئی فتح چند شاداں	-۱۷۴
۲۹۳	محمد عبدالحی خاں آشفہ	-۱۷۵
۲۹۴	شفیق حسن خاں شفیق مینائی	-۱۷۶
۲۹۷	آنند سروپ سری واستوا حق	-۱۷۷
۲۹۷	اونکار سہائے سکسینہ میکش	-۱۷۸
۲۹۹	محبوب حسن خاں نظر	-۱۷۹
۳۰۰	رحمت شاہ خاں رزمی	-۱۸۰
۳۰۱	مطیع اللہ خاں حسرت کمالی	-۱۸۱
۳۰۲	سید احمد سحر رشیدی	-۱۸۲
۳۰۵	عزیز احمد خاں عزیز	-۱۸۳
۳۰۶	اسرار حسین خاں اسیر	-۱۸۴
۳۰۷	محمد احمد خاں سرور رومانی	-۱۸۵
۳۰۸	اختیار حسن خاں اختر	-۱۸۶
۳۰۹	طاہر تلہری	-۱۸۷
۳۱۰	محمد نسیم خاں نسیم	-۱۸۸
۳۱۳	سید رونق رضا رونق	-۱۸۹

۳۱۳	عبدالواجد انور جمال	-۱۹۰
۳۱۵	ارشاد احمد خاں ساغر وارثی	-۱۹۱
۳۱۶	محبوب حسن جمال	-۱۹۲
۳۱۷	یوسف علی خاں گوہر	-۱۹۳
۳۱۸	محبوب حسن اجتم	-۱۹۴
۳۱۹	رام کشن زیبا	-۱۹۵
۳۲۰	سید صابر علی قبیر شکیلی	-۱۹۶
۳۲۱	محبوب حسن محبوب	-۱۹۷
۳۲۲	رباب رشیدی	-۱۹۸
۳۲۳	مولانا بدرالدین عاقل	-۱۹۹
۳۲۵	اسرار حسین خاں تبسم	-۲۰۰
۳۲۵	سید نسیم طاہر زیدی گار	-۲۰۱
۳۲۷	اختر علی خاں اختر	-۲۰۲
۳۲۸	حکمت شاد	-۲۰۳
۳۲۹	خالد علوی	-۲۰۴
۳۳۰	مختار حسن واصف	-۲۰۵
۳۳۱	رفیع اللہ وقت	۲۰۶
۳۳۲	شبیر احمد شانگل و جدانی	-۲۰۷
۳۳۳	مرغوب حسن خاں فضا	-۲۰۸
۳۳۳	نور ضیاء الدین نور	-۲۰۹
۳۳۳	ثریا خاتون خزیم	-۲۱۰
۳۳۴	فصیح اکمل قادری	-۲۱۱
۳۳۷	حکیم عبدالواسع رشک	-۲۱۲
۳۳۸	ایوب حسن خاں اثر	-۲۱۳
۳۳۹	رونق علی مصوّر	-۲۱۴

۳۴۰	محمد شمیم انصاری شمیم	۲۱۵
۳۴۱	سیدہ شفق آرا شان معراج	۲۱۶
۳۴۳	فرزادہ شفق فرزانہ	۲۱۷
۳۴۴	ڈاکٹر ممنون حسن خاں ممنون	۲۱۸
۳۴۵	شمیم بیگم شمیم	۲۱۹
۳۴۶	سردار آصف آصف	۲۲۰
۳۴۶	محمد عظیم عظیم	۲۲۱
۳۴۷	جاوید اللہ خاں جاوید	۲۲۲
۳۴۸	رئیس احمد نعمانی رئیس	۲۲۳
۳۴۹	ترنم ضیاء ترنم	۲۲۴
۳۵۰	عزیز احمد خاں شفق طاہری	۲۲۵
۳۵۲	قمر شاہ جہاں پوری	۲۲۶
۳۵۳	محمد وسیم وسیم مینائی	۲۲۷
۳۵۵	راشد ندیم	۲۲۸
۳۵۷	کتابیات	۲۲۹



مقدمہ

یہ ۱۹۷۹ء کا ذکر ہے، اپنے اولین انتخاب غزلیات 'نقشِ نوا' کی اشاعت کے بعد دوسرے انتخاب کے لیے غزلیں چن رہا تھا کہ ذہن میں ایک خیال از خود ابھرا اور اس پر چھا گیا، ہر برس بے شمار شعری کتابیں چھپتی ہیں اور جلد ہی منظر سے غائب ہو جاتی ہیں۔ میر وغالب۔ انیس و ذبیر زندہ ہیں اپنے کلام کے سبب لیکن اب میر وغالب کہاں۔ کیوں نہ وہ کام کیا جائے جو افادی ہو اور کچھ دن زندہ بھی رہے۔ کچھ غور و فکر کے بعد نظر تذکرہ شعرا شاہ جہانپور پر جاٹھیری جونبتاً اچھوتا عنوان و موضوع تھا اور کسی نے اب تک اس جانب توجہ نہیں دی تھی۔ ایسے تحقیقی اور صبر آزما کام کا کوئی تجربہ تھا نہ یہاں کا تذکرہ میری نظر سے گزرا تھا البتہ تاریخِ صبیح، میں مؤلف [مولوی صبیح الدین مرحوم] نے شعرا کا ایک باب قائم کر کے گنتی کے منتخب شاعروں کا حال اور نمونہ کلام ضرور لکھ دیا ہے۔ یقیناً ان کے علاوہ بھی ایک بڑی تعداد "رکارڈ باہر" رہ گئی ہوگی، سب کو تلاش اور یکجا کر کے ایک جامع تذکرہ ترتیب دیا جائے، تاریخِ مظفری، خواجہ مولوی مظفر سلیمانی شاہ آبادی (ضلع ہردوئی) بھی بالکل تاریخِ صبیح کی طرز پر تصنیف و تالیف کی گئی ہے اگر کوئی امتیازی بات ہے تو یہ کہ مولوی صبیح الدین میاں نے شاہ جہانپور کے تفصیلی حالات "تحریر کیے ہیں اور شاہ آباد کا ضمناً تذکرہ کیا ہے جبکہ مولوی مظفر سلیمانی مرحوم نے شاہ آباد ————— کا تفصیلی حال تحریر کیا اور شاہ جہاں پور کا اجمالاً ذکر کیا ہے، علاوہ ازیں خان بہادر ڈپٹی مطبع اللہ خاں صاحب نے 'تاریخِ مطبع' کے نام سے چار ضخیم جلدوں میں اس شہر کی تاریخِ مکتل کی مگر قبل طباعت ۱۹۲۵ء میں رحلت فرما گئے۔ یہ تاریخ اب تک غیر مطبوعہ ہے، باوجود کوششِ راقم اس مسودہ کی کوئی جلد حاصل نہ کر سکا، متذکرہ تین تاریخی کتابوں کے ماسوا ایک تاریخِ احسانی بھی ہے جس کو منشی احسان علی خاں احسان مختار نے تالیف و

تصنیف کی، یہ تین ضخیم جلدوں میں تھی، صد افسوس کہ طباعت سے قبل اس کے مصنف بھی اللہ کو پیارے ہو گئے، تینوں جلدیں بھی کچھ مدت بعد غائب ہو گئیں۔ پہلی اور تیسری جلد کا اب تک پتہ نہیں دوسری جلد راقم نے دیکھی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہی وہ وسیلہ خاص ہے جس سے سخنوران شاہ جہاں پور کی ترتیب کے خیال کو تقویت پہنچی، اس میں شعراء کا تذکرہ کہیں زیادہ ہے، میں نے اس کتاب سے کما حقہ، استفادہ کیا اور شعراء کے حالات یا تو من وعن نقل کر دیئے یا پھر غیر ضروری حصہ نکال کر ان کے احوال کو مختصر کر دیا تاریخ صبیح سے استفادہ کی بھی یہی صورت رہی اگر تاریخ احسانی قلمی جلد دوم اور تاریخ صبیح مطبوعہ دستیاب نہ ہوتی تو سخنوران شاہ جہاں پور، کسی طور مکمل نہ ہوتی تو کم از کم اس تعداد میں شعراء کے حالات اس کتاب میں اکٹھا نہ کیے جاسکتے تھے۔ اس دوران جب یہ کہیے مواد کی تلاش میں مارا مارا اور در در کی خاک چھانتا پھرتا تھا مجتبیٰ رباب رشیدی سے معلوم ہوا کہ شہر کے ایک بزرگ شاعر شمس الدین احمد شمس شعراء شاہ جہاں پور کا تذکرہ لکھ رہے ہیں مگر پیرانہ سالی کے سبب ان کو ایک معاون کی ضرورت ہے اپنی خدمات پیش کرنے کے خیال سے ایک روز میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شمس صاحب ایک پلنگ پر نیم دراز تھے۔ ایک اسٹول پر چند رسائل اور پڑانے لگے سنتے بھی رکھے تھے اور ایک بچوں والی کاپی سر ہانے تھی، سرسری گفتگو کے بعد راقم نے ادب سے استفسار کیا کہ اب تک کہاں تک کام ہو چکا اور مواد کی دستیابی کی نوعیت کیا ہے۔ ان بزرگ نے کاپی اور اسٹول پر رکھے رسائل و گلدستوں کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جو کچھ ہے وہ یہ ہے لیکن جی چاہتا ہے ایک ایسا تذکرہ تالیف ہو جائے جو آبادی شہر کے زمانہ سے لے کر اب تک کے حالات پر پھیلا ہو اس عالم پیری میں یہ کام میرے بس کا نہیں، کاش کوئی بھلا آدمی یہ کام انجام دے دے تو کتنا اچھا ہو، میں نے اپنا خیال ان پر ظاہر کر دیا اور عرض کیا کہ اگرچہ میں ایسے دشوار اور سنگین ادبی کام کا اہل نہیں ہوں مگر گوشتش کروں گا شمس صاحب نے وہ کاپی رسائل اور گلدستے میرے حوالے کر دیئے۔ گھر لاکر دیکھا تو کاپی میں چند شاعروں کے نام اور کسی کسی کا نمونہ کلام درج تھا مگر حالات زندگی نہیں تھے۔ غالباً گلدستوں اور رسالوں سے شاہ جہاں پور کے شاعروں کے نام اور کلام کے نمونے نوٹ کیے گئے تھے بعد میں خود میں نے ان شاعروں کے حالات زندگی تلاش کیے۔ کچھ کے دستیاب ہو گئے اور کچھ کے نہیں ہوئے 'تاریخ مظفری'، 'تاریخ صبیح' اور 'تاریخ احسانی' سے جتنا مواد دستیاب ہوا وہ نا کافی تھا۔ ابتداء میں خیال تھا کہ کام زیادہ مشکل نہیں۔ سوچا کہ مدرس دارالمطالعیہ اور اہل علم حضرات ضرورت کا مواد فراہم کر دیں گے، قاعدے سے ترتیب دے کر تذکرہ تیار کر لیا جائے گا۔ اس میں ایک سال کی مدت کافی ہوگی لیکن یہ ذمے داری اوڑھ لینے کے بعد خیر ہوئی کہ میں جان لیوا خوش فہمی کا شکار تھا۔ کام آسان نہیں، جسم و جان تحلیل ہو جانے کے امکانات بھی تھے۔ میری دشواریوں کا آغاز

ہو چکا تھا۔ شہر کے تعلیمی ادارے چھانے، اہل علم سے رجوع کیا۔ اجاب کو ٹٹولا اور کتب خانوں کی ورق گردانی کی مگر مشے از خردارے کے مصداق ہاتھ کچھ نہ آیا۔ دارالمطالعہ شاہ جہاں پور نے سب سے زیادہ مایوس کیا قوی امید تھی کہ کتابوں کے اس خرابے میں پرنے اخبار، رسائل، گلڈستے، ذکر نامے بڑے مشاعروں کی رودادیں نیز ضرورت کی کتابیں وقت کی پُرشکن تہوں میں کہیں نہ کہیں ضرور پوشیدہ ہوں گی اور میں ڈھونڈ نکالوں گا لیکن وہاں ناقابل بیان منظر دیکھا۔ سر دست یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ جگہ کبھی دارالمطالعہ ضرور ہوگی لیکن جس وقت میں پہنچا اس وقت نہ تھی ایسا نہ ہونے کے اسباب بھی ہیں، ضروری نہیں کہ ظاہر کر کے دارالمطالعہ کو بحث کا موضوع بناؤں اور بلاوجہ الجھنوں کو دعوت دوں۔ جو کچھ حاصل ہوا وہ ”اربابِ قلم“ کراچی کی نگارشات تھیں جس میں چند ایسے پاکستانی شاعروں کا کلام بھی موجود تھا جن کے بزرگوں کا شاہ جہاں پور سے کبھی تعلق تھا، جس سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں وہ امیدیں دارالمطالعہ کے گرد و غبار میں کھو گئیں۔ اربابِ ذوق اور اہل علم و فن کے توسط سے جس قدر حالات دستیاب ہوتے رہے انھیں ترتیب دیتا رہا۔ حیدرآباد، اورنگ آباد، دلی، رام پور اور لکھنؤ پاکستان میں لاہور، کراچی، اسلام آباد، راولپنڈی، شکارپور، سکھ اور جنگ شاہی (ٹھٹھہ) میں مقیم شاہ جہاں پوری خاندانوں سے بذریعہ مراسلت ربط قائم کیا لیکن متوقع کامیابی نہ ملی۔ قرب و جوار کے چند شہروں مثلاً بریلی، لکھیم پور، پہلی بھیت اور ملیح آباد خود گیا تاکہ خط و کتابت میں وقت برباد نہ ہو مگر لا حاصل شعرا کی فہرست ایک سال میں بھی تیار نہ ہو سکی۔ پہلے اور دو سکر دور کے سخن گو بزرگوں میں کم و بیش وہی شعرا نظر آئے جن کو تاریخِ مہیج اور تاریخِ احسانی میں شامل کیا جا چکا تھا۔ اب جو نام سامنے آتے گئے ان کے حالات اور کلام تلاش کر کے تحریر کرتا رہا، فائل کا حجم بڑھتا گیا۔ اسی کے ساتھ ہمت و حوصلہ بھی بڑھا۔ بعض اجاب اور بزرگوں نے خلوص و محبت سے گرانقدر مشوروں سے نوازا اور ہاتھ بٹایا۔ طالبِ علمی کے زمانے کے میرے استاد گرامی مولوی سید یعقوب حسن میاں مرحوم ضعیفی کے عالم میں جن کی یادداشت حیرت انگیز تھی نہایت علم دوست صاحبِ ذوق و شوق، سخن فہم اور نکتہ گو تھے۔ یادگار زمانہ مشاعروں اور اس دور شاعری کی نشستوں کا آنکھوں دیکھا حال سناتے تو پوری تصویر اتار دیتے تھے۔ پسندیدہ غزلیں مطلع سے مقطع تک سنا جاتے کہیں ٹھہر کر ان کو سوچنے کی ضرورت نہ ہوتی میاں صاحب کشادہ دل و دماغ کے نہایت پاکیزہ بزرگ تھے، میرے کام کا بہت سا بار کتابیں تلاش کر کے فراہم کرنے کی شکل میں اٹھا لیا۔ خدا ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ میرے ہم جماعت و ہم عصر محبِ مکرّم حکیم احمد علی خاں وقار مرحوم نہایت سادہ لوح اور وفا شعار دوست تھے

خداوند کریم مرحوم کو جنت میں اعلیٰ درجات عطا فرمائے۔ جو از خود میرے لیے ضرورت کا مواد تلاش کرتے رہے اور خود ہی میری قیام گاہ پر شوق شوق زحمت اٹھا کر پہنچاتے رہے اور بھی احباب ہیں جن کی ہمدردیاں شامل حال رہیں اس عمل کے برخلاف کچھ مہربانوں نے اپنے بزرگوں کے حالات اور کلام دینا تو دور کی بات بتانا اور دکھانا بھی گوارا نہیں کیا دوسرے ذرائع بھی ایسے شعرا کے حالات حاصل کرنے میں کام نہ آئے اور مجبوراً ایسے شاعروں کو چھوڑ دینا پڑا۔ ان کوتاہ میں اور نادان حضرات نے اپنے بزرگوں کے ساتھ نا انصافی کی اور ارباب فکر و فن کے ساتھ ظلم کیا۔ بہر طور ایسے لوگوں کو اپنے بزرگوں کو گت نام رکھنے کا حق پہنچتا ہے ورنہ سخنوران شاہ جہاں پور میں شامل ہونے کے بعد وہ مدتوں زندہ رہتے اور لوگ ان کے فنی کمالات پر ناز کرتے۔ تلماش و تحقیق کے زمانے میں قلمی بیاضیں، مسودات نیز تاریخ احسانی قلمی جلد دوم ایسے حضرات سے دستیاب ہوئیں جن کے پاس ایسی نادر و کمیاب دستاویزات موجود ہونا تعجبات سے ہے۔ شبہ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ لوگ جو علم و ادب سے بے خبر روزی روٹی کی فکر میں گرفتار ہیں ادب کے ایسے گرانمایہ خزانے کے امین و تحویلدار بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اگر ان اعلیٰ نفس حضرات کی بے غرض مدد شامل نہ ہوتی تو سو سو اشعار کے تذکرے تک پہنچتے پہنچتے کام ختم ہو جاتا اور اتنی تعداد پر مجبوراً اکتفا کرنا پڑتا۔ چودہ۔ پندرہ سال کی تلاش و جستجو میں جتنا مواد فراہم ہوا کم و بیش اتنا ہی عالم خفا میں ہو گا شاہ جہاں پور کے شب و روز میں تین عظیم حادثات آئے جو یہاں کا علمی و ادبی سرمایہ تباہ و برباد کر گئے۔ بہا لے گئے۔ پہلا حادثہ ۱۸۵۷ء کا مشہور زمانہ حادثہ ہے جب یہ شہر جنگ آزادی کے مرکزوں میں ایک اہم مرکز تھا اور تسلط کے بعد جس کو انگریز غاصبین نے خوب لوٹا اور لٹوایا۔ افراتفری کے عالم میں شہر کا شہر خالی ہو گیا تھا۔ دلی، لکھنؤ، رام پور اور دیگر شہروں کی مانند یہ شہر بھی علی ادبی، دینی اور تخلیقی درس گاہ و تربیت گاہ تھا۔ مدت سے مقامی اور بیرونی علاقوں کے طالبان علم اس نوآباد شہر کے باکالوں سے فیض پارہے تھے۔ مولوی صبیح الدین میاں نے عہد رفتہ کے شاہ جہاں پور کا علمی بیان یوں فرمایا "ایک زمانے میں علماء حرمین شریفین شاہ جہاں پور کے علماء سے سزا فضیلت حاصل کرنے کو موجب افتخار سمجھتے تھے۔ اکناف عالم کے تشنگان علم یہاں آکر سیراب ہوتے تھے شاہ جہاں پور قرطبہ و بخارا سمجھا جاتا تھا۔ جامع ازہر کے پیمانہ پر متعدد درس گاہیں کھلی ہوئی تھیں جن میں متبحر علماء درس دیا کرتے تھے" اس شہر کا زوال و کمال بھی مغلیہ سلطنت کے کمال و زوال سے ہم رشتہ رہا۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کے آشوب میں آخری تاجدار قلعہ معلیٰ سراج الدین ظفر پر آنسو بہانے کے جرم میں نوابی سے محروم کر کے ملکہ و کٹوریہ فرمانرے انگلستان کی علم برداری میں ازراہ لطف و کرم شامل کر لیا گیا۔

بانی شہر نواب بہادر خاں کا وسیع و عظیم الشان قلعہ جس کو انیسویں صدی کے آغاز میں دیکھ کر ایک سیاح ہشپ ہیر شاہی محل سمجھ بیٹھا تھا معتمد الدولہ نواب یعقوب علی خاں بہادر کا شاندار قلعہ جو دریائے کھنوت کے قریب بجانب مشرق خواجہ فیروز نامی بستی کے باہر ایک بلند مقام پر تعمیر ہوا تھا شہر کی بے شمار سنگی عمارتوں کے ساتھ ڈھا کر زمین کے برابر کر دیا گیا۔ نواب بہادر خاں اور نواب عبدالعزیز خاں کے مقابر نیلام کر دیئے۔ قبروں کے سنگ مرمر کے تعویذ نکال کر بیچ دیئے گئے نواب بہادر خاں کے خاندان پر مصائب کے پہاڑ پھٹ پڑے تھے۔ بہت سے گرفتار ہو کر پھانسی پر چڑھا رہے گئے، کچھ نامراد جزیرہ اندمان بھیج کر روحانی اور جسمانی عذاب میں ڈلے گئے اور کچھ شہر چھوڑ کر دیار غیر جا بسے؛ شرفار شہر، علماء فضلہ فنکار، اہل علم و ادب محفوظ شہروں اور دیسی ریاستوں میں منتقل ہو گئے۔ علمی ادبی محفلیں سونی ہو گئیں اور یہ بد نصیب شہر اپنی صدا کی بازگشت میں مدتوں ڈوبا رہا۔

دوسرا بد انجام واقعہ تقسیم ملک تھا جب تبادلاً آبادی کا آغاز ہوا۔ ہر شعبہ زندگی سے نکل نکل کر لوگ بسرعت تمام ایک نوزائیدہ ملک پاکستان کی جانب تیز رفتاری سے دوڑے جا رہے تھے۔ شہر میں باعتبار تعداد مسلمان زیادہ تھے اور ہر محلے بستی میں چھوٹے بڑے زمیندار تھے۔ امرا و شرفاء اور تعلیم یافتہ طبقے کی بنی لائبریریاں موجود تھیں، دیوان خانوں میں دوچار سوکتا میں موجود ہونا شانہ مامارت سمجھا جاتا تھا۔ ہجرت کرنے والے پڑھے لکھے لوگ اہم ترین بیاضین، قلمی مسودات، دواوین گراہیا مطبوعہ نسخے اپنے ساتھ لے گئے یا عجلت میں ناقدروں کے سپرد کر گئے۔ علمی سرمایہ دوبارہ بکھر گیا جو نوے سال کی طویل مدت میں رفتہ رفتہ شاہجہاں پور آیا اور بجھا ہوا تھا۔ اس دوسری بار کے سیلاب میں قریب قریب سبھی کچھ بہ گیا تھا۔ یہ غم بھوے نہ تھے کہ تین سال کے اندر ہی ہیبت ناک فرقہ وارانہ فساد رونما ہوا۔ دہشت اور وحشت کے لہورنگ دھوئیں میں شہر و دیہات روپوش تھے۔ ۱۹۵۰ء کا یہ تیسرا حادثہ تابوت کی آخری کیل تھا۔ چہار اطراف سے مسلمان بھاگ کر شہر میں اکٹھا ہوتے اور قافلے بنا کر پاکستان روانہ ہو جاتے۔ دیہاتی پناہ گیزوں کی ناقابل دید و ناگفتہ بہ حالت زار سے اہل شہر پر مسراسمگی طاری ہو گئی تھی اور وہ بھی قافلوں میں شامل ہو ہو کر جاتے رہے۔ ہر شخص دیوانہ وار اقساں و خیزاں بھاگا جا رہا تھا۔ بیوی بچے ماں باپ بھائی بہن ایک دوسرے سے کچھ تو ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے، کچھ پناہ گزینوں کی صورت میں بعد ایک مدت پاکستان کے کسی شہر میں جھگی جھونپڑی میں پھٹے حالوں ملے۔ جائیدادیں، بینکوں اور ڈاکخانوں میں محفوظ رقم، بیوپاریں لگا سرمایہ، رہائشی کوٹھیاں حویلیاں، پختہ و نیم پختہ مکانات بمعہ ساز و سامان اسی طرح چھوڑ کر گھر میں موجود نقدی مختصر سامان

اور بال بچے سنبھال کر یہاں سے جاتے اور شہر و دیہات خالی کرتے رہے۔ دو ماہ کے اندر اندر شہر و دیہات کے تقریباً پچھن ہزار مسلمانوں نے لیڈروں کی سیاسی غلطیوں کی ہولناک اور بھیانک سزا پائی۔ جس دھرتی کی دھول میں لوٹ پوٹ کر بڑھے پلے اسی دھرتی نے بلیدان مانگ لیا، جنم جنم کے باشندوں کو کھڑکڑ کر اپنی حدوں سے باہر دھکیل دیا۔ ان ہجرت کرنے والوں کی املاک لوٹ کی نذر ہوئیں اور ان کے بھسکے پڑے مکانوں میں پاکستان سے آئے ہوئے پناہ گزین بسا دیئے گئے اور قلیل علمی سرمایہ جو تقسیم ملک کے بعد بیچ رہا تھا دوکان داروں کے کام آیا۔ کچھ تعلیم یافتہ عمر رسیدہ باہر سے آئے لوگوں نے مکانوں پر قبضہ کر کے قابل قدر کتابیں احتراماً محفوظ رکھیں یا پرائی کتابوں کے متلاشیوں کے ہاتھوں برائے نام قیمت پر فروخت کر دیں۔ اللہ اللہ خیر سلّا۔

راقم نے جن حالات میں اس کتاب کی تالیف و ترتیب کا بیڑہ اٹھایا وہ یہی حالات تھے۔ اب سے تقریباً اسی ساڑھے سال قبل مولوی صبیح الدین صاحب مرحوم مؤلف "تاریخ صبیح" نے تالیف و تحقیق کے زمانے میں جو دشواریاں محسوس کی تھیں ان کا اظہار ابتداء کتاب میں یوں فرمایا۔

"یہ ہمارا فرض تھا کہ ہم اپنے بزرگان دین اور نامور اصحاب کے صحیح حالات لکھ کر طبع کر دیتے۔ شاہ جہاں پورا ابتداء سے شرفار کی بستی رہا ہے۔ یہاں کی خاک پاک سے بکثرت صوفی عالم، فاضل اور مشاہیر زمانہ اصحاب اٹھے اور اپنے علم و فضل اور فیوض باطنی سے ایک عالم کو مستفیض کر کے گوشہ تنہائی میں جا کر ہمیشہ کے لئے میٹھی نسید سو گئے ان کا جاگنا اب قیامت پر موقوف ہے۔ ان میں سے اکثر حضرات نے کچھ اس طرح منہ چھپا لیا کہ باوجود سخت کوشش اور تلاش کے ان کے حالات کا پتہ نہیں چلتا ہے اگر ان کے کارنامہ حیات مرتب ہوتے تو آج ہمارے لئے اور نیر آئندہ نسلوں کے واسطے مشعل راہ کا کام دیتے۔ اگرچہ اس فرض کو نواب محبت خاں و نواب محمد خاں و نواب احمد خاں و نواب مرتضیٰ خاں اور بہت پر ساد سرور نے ایک حد تک انجام دیا مگر ان حضرات نے اول تو نہایت اختصار سے کام لیا اور دوسرے یہ کہ بعض نے صرف اپنے خاندان کے حالات اور واقعات کو قلمبند کر دیا اور بعض نے محض اپنے اجاب کے حالات پر اکتفا کی اور بعض نے صرف اپنے ہم مذاق اصحاب کے تراجم تحریر کیے حالاں کہ ان کے لئے یہ بہت آسان امر تھا کہ وہ اپنے عہد تک کی ایک مکمل و مبسوط تاریخ قلمبند کرتے تو آج یہ دقت درپیش نہ ہوتی اور کوئی نامور بزرگ بقائے دوام

کی فہرست سے نہ چھوٹنے پاتا مگر پھر بھی ان حضرات کی یہ کوشش قابل مشکوری ہے کہ ان کی بدولت آج ہم کو بہت سے اصحاب کے حالات مل گئے اور خوش قسمتی سے مجھ کو یہ نایاب ذخیرہ کرم خوردہ مل گیا۔

میاں صاحب آگے رقمطراز ہیں: "نواب عبداللہ خاں مرحوم نے مجھ کو 'مجت فانی' تلاش کر کے منگوادی اور میرے ہم غلہ عباس علی خاں نے 'تذکرۃ الاحباب' اور 'انبار البحر' عنایت کر دی۔ ان کتب کے مل جانے سے مجھ کو ایک گونہ تقویت حاصل ہوئی اور میں نے ثقہ معمر حضرات سے گزشتہ حالات و واقعات کی تلاش شروع کر دی اور جن کتب و رسالہ جات میں یہاں کے حالات کا پتہ چلا ان کو منگا کر ورق گردانی میں مشغول ہو گیا، مزید فرماتے ہیں، 'اسی زمانہ میں مجھ کو معلوم ہوا کہ منشی احسان خاں مختار اور خان بہادر مطیع اللہ خاں ڈپٹی کلکٹر مرحوم شاہجہانپور کی تاریخ لکھ رہے ہیں مجھ کو اطمینان ہو گیا اور میں نے (تصنیف و تالیف کا کام قطعاً اپنا ارادہ بدل دیا مگر یہ امید بھی پوری نہ ہوئی اور دونوں مولف یکے بعد دیگرے پیوند خاک ہو گئے۔ حسن اتفاق سے مجھ کو یہ دونوں کتابیں دیکھنے کو مل گئیں، میں نے ان کو اول سے آخر تک بلا استیباب پڑھایا دونوں تاریخیں تین تین چار چار جلدوں میں تھیں۔ مختار صاحب نے اپنی کتاب میں صحت روایات اور تاریخی واقعات میں صحت اور تحقیق کا چنداں لحاظ نہیں کیا، ان کا ماخذ زیادہ تر زبانی روایات پر مبنی ہے انھوں نے اصول روایت و درایت سے کوئی سروکار نہیں رکھا البتہ مولف تاریخ مطیع نے انتہائی کوشش اور جانکاہی سے مولف کتاب کی ذمہ داری کو مد نظر رکھتے ہوئے پوری تحقیقات اور صحت سے واقعات اور حالات کو جمع کیا مگر روزانہ کاٹ چھانٹ کے وہم سے وہ اس کو مکمل نہ کر سکے اور انھوں نے اپنی کتاب میں ان واقعات اور ان مشاہیر کے حالات کو بھی سمیٹ لیا جو اتفاقاً طور پر شاہجہانپور میں آئے تھے اور جن کا اس شہر سے کوئی خاص تعلق یا واسطہ نہ تھا اس سے کتاب کی ضخامت تو بہت زیادہ ہو گئی مگر مقامی بزرگوں کے بہت سے نام چھوٹ گئے۔ جس طرح انھوں نے کتابی معلومات حاصل کرنے میں کوشش و محنت کی ویسی ہی مقامی حالات کی فراہمی میں ایک حد تک سہل انگاری سے کام لیا نیز اپنے زمانے کے حکما و شعرا و اہل فن حضرات کو قطعاً قلم انداز کر دیا جس کی وجہ خاص سمجھنے سے قاصر ہوں، مزید فرماتے ہیں، 'اگرچہ میں نے حتی الامکان تلاش و کوشش میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں ہونے دیا ہے مگر پھر بھی میں یہ دعویٰ سے نہیں کہہ سکتا ہوں کہ میں یہاں کے حالات فراہم کرنے میں پورے طور پر کامیاب ہو گیا ہوں، ناظرین کتاب پر یہ امر بخوبی روشن ہے کہ شاہجہانپور میں کوئی کتب خانہ نہیں ہے اور شخصی حیثیت سے جو کتب خانے تھے یا تو وہ کیتروں کی غذا ہو گئے یا نااہل اولاد کے ہاتھوں وہ بیشس بہا

سرمایہ پٹناریوں کی پٹریوں کی نذر ہو گیا یا کوٹریوں کے مول دوسری جگہ کے اہل علم لے گئے۔ علاوہ بریں بہت سے نجیب الطرفین ذی علم خاندان اس تین سو سال کی مدت میں ایسے مٹے کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔ مستزاد برآں ۱۸۵۷ء کے عالم آشوب ہنگامے میں دیگر اسباب کے ساتھ یہاں کے علمی سرمائے بھی غارت ہو گئے اور جو واقف کار لوگ تھے وہ بھی رفتہ رفتہ قبروں میں جا کر سو رہے تو ایسی مجبورانہ صورت میں ایک حد تک معزور بھی سمجھا جاسکتا ہوں خوش قسمتی سے یا حسن اتفاق سے جو سرمایہ مجھ کو مل گیا ہے اگر اس کو بھی ٹھکانے نہ لگا دیا جاتا تو اندیشہ تھا کہ یہ بھی کیڑوں مکوڑوں کی خوراک ہو جاتا۔“

تاریخ صبیح سے مندرجہ بالا عبارت صرف اس لئے پیش کی ہے کہ قارئین میری ان دشواریوں کو محسوس کریں جو تاریخ صبیح کی تالیف کے ساٹھ سال بعد ایسے حالات میں ممکن ہیں اور جن پر قب ابو نہ پانے کی صورت میں اس مفید کام سے دستبردار ہو جانے کو بار بار جی چاہتا ہے جو دقتیں زائد از نصف صدی قبل مولف تاریخ صبیح کے سامنے تھیں ان سے کہیں زیادہ سنگین دشواریاں میرے پیش نظر رہیں۔ شاہجہانپور کے ادبی خزانے جو ۱۸۵۷ء کے شعلوں سے محفوظ رہے تھے ۱۸۷۷ء اور ۱۹۵۰ء کے جگہ جگہ جلتے الاؤ میں جل کر راکھ ہو گئے اور اردو مخالف ہواؤں کے ساتھ کہیں دور چلے گئے۔ وہ شہر جو علم و فن کا نرم رو سرد و شیریں چشمہ تھا ایک خشک ہو گیا اور اس کی گزر گاہیں بھی گردنا قدری کی تہوں میں معدوم و بے نشان ہو گئیں۔ جس شہر میں اردو اور فارسی سے جدی تعلق رکھنے والے لوگ زندہ و سلامت تھے اسی شہر میں بلا لحاظ مذہب و ملت ان خوبصورت زبانوں سے ناتہ توڑنے والے پیدا ہو گئے۔ سخنوران شاہجہانپور کی تکمیل میں بسبب تلاش و تحقیق وقت زیادہ صرف ہوا۔ سب سے زیادہ پریشانیوں اس وقت سامنے آئیں جب موجودہ دور کے شعرا سے رابطہ قائم کیا اور حالات و مقالات کی درخواست کی جو "آج اور کل" کے وعدوں پر تلتی رہی۔ خود کو خوش نصیب سمجھتا تھا جب کوئی مہربان ۵-۶ بار کے تقاضوں پر اپنے حالات زندگی اور نمونہ کلام سے نواز دیتا تھا ورنہ دس دس بار بلکہ ان گنت مرتبہ حاضری دینے پر بھی کل کا وعدہ نصیب ہوا۔

شعرا کے تذکرے کے پہلو بہ پہلو شاہجہانپور کے حالات تاریخی پس منظر کے طور پر سپرد قلم کرنا نہایت ضروری سمجھ کر اختصار کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔

ہندوستان کے قدیم شہروں میں شاہجہانپور شمار نہیں ہوتا۔ اس کا وجود میں آنا بھی اتفاق وقت کی بات ہے۔ نواب سرابندال خاں المخاطب بہ اعتماد الدولہ نواب بہادر خاں چغتیا پسر نواب دریا خاں کی جاگیر قنوج۔ کالپی سے ملا ہوا یہ علاقہ جہاں اب یہ شہر آباد ہے قدیم زمانے میں گنگا درگا کے نام سے

مشہور تھا۔ گھنے جنگلوں سے ڈھکی ہوئی یہ سرزمین دامن کوہ میں واقع ہے اور اس کے درمیان کئی دریا زمینوں کو سیراب کرتے گزرتے ہیں۔ یہ علاقہ آب و ہوا، تازگی و شادابی میں بے مثل ہے۔ "گنگا درگا" کے علاوہ اس کو کھٹیر بھی کہتے تھے۔ کٹیار راجپوتوں کا گڑھ تھا۔ پچاس سے زائد زمیندار یہاں کے حاکم تھے اور ان سب پر راجہ منگھی سنگھ حاکم اعلیٰ تھا۔ راجپوتوں اور ٹھاکروں کے علاوہ چمار، پاسی، اہیر، کوری اور دوسری اقوام و اعلیٰ ذات کے لوگ بھی آباد تھے۔ جنگلات کے سبب ٹھگی اور رہنری عام تھی۔ زمیندار بھی لٹیروں سے ساز باز کھتے تھے اور ان کے پشت پناہ تھے۔ پورے علاقے میں بد امنی اور لاقانونیت پھیلی ہوئی تھی۔ متصلہ سرکاری سرکشوں کو دبانے میں ناکام رہیں تو مرکزی قوت حرکت میں آئی اور نواب بہادر خاں جو اپنی جاگیر قنوج پر موجود تھے ان سرکش زمینداروں کی سرکابی اور تادیب کے لئے دربار شاہجہانی سے مامور کئے گئے۔ نواب ممدوح نے اپنے برادر خورد نواب جلال الدین خاں المعروف بہ نواب دلیر خاں اور اپنی فوج کے ایکہ، آزمودہ کار افسر شہباز خاں کو گنگا درگا کی طرف روانہ کر دیا۔ چند روز تک مفسد فوجی دباؤ برداشت کرتے رہے الحاصل بے دست و پا ہو کر ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہوئے رہنوں اور سرکشوں کی پناہ گاہیں نیز زمینداروں کی گڑھیاں زمین کے برابر کرادی گئیں۔ جنگلات کٹوا کر راستوں کو محفوظ کیا گیا اور مسافروں کی آمد و رفت کے لئے ضروری انتظامات عمل میں آئے نواب دلیر خاں نے اپنے بھائی نواب بہادر خاں کو کامیابی کا ثرہ سنایا تو اس مقام کی عمدگی اور قدرتی خوبیاں بھی لکھ بھیجیں۔ نواب بہادر خاں خوش ہوئے اور دلیر خاں کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اس مقام پر نوآبادی قائم کرنے اور شہر بسانے کی درخواست بذریعہ اپنے وکیل دربار، بارگاہ سلطانی میں پیش کر دی درخواست کی منظوری کے ساتھ بیس ہزار بیگہ زمین بھی آبادی کے لئے عطا ہوئی۔ سیاسی، انتظامی اور فوجی حکمت عملیوں کو کامیاب بنانے کے یہ آباد کاری ضروری قرار پائی تھی۔ شاہجہانپور کے مزید حالات سامنے لانے سے قبل عمدۃ الملک نواب ابدال خاں المخاطب بہ نواب بہادر خاں چغتیا جاگیر دار سپہ سالار افواج شاہ جہانی صاحب قرآنی کا نیم تفصیلی تعارف مناسب ہے تاکہ قارئین بانی شہر کے جدی، نسی اور ذاتی حالات کی روشنی میں اس شہر کے خط و خال کا صحیح تصور قائم کر سکیں اور اسی روشنی میں ہمدرفتہ کے شہر شاہجہانپور کے کوچوں محلوں میں چلیں پھریں اس میں بسے ہوئے کنبوں اور نواب بہادر خاں کے مجوزہ شاہجہانپور اور اس کے عظیم الشان خواب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں جو بانی شہر کی جوان مرگی کے باعث شرمندہ تعبیر ہو سکا شاہجہانپور کا سنگ بنیاد ۱۶۳۰ء میں رکھا گیا اس وقت نواب ممدوح ۲۳-۲۴ سال کے ہوں گے ۱۰۵۹ء میں بمقام قندھار انتقال فرمایا۔ اس درمیانی

مدت میں نواب صاحب بدقت تمام موقع نکال کر صرف دو بار یہاں تشریف لائے، اگر زندہ رہتے تو وہ اس شہر کو افغانستان ثانی بنا دیتے۔

مشرقی افغانستان کے بربرنامی علاقے کے موروثی خان دریا خاں پسر ابراہیم خاں باقر زئی بسلسلہ تجارت وارد ہندوستان ہوئے تو نور الدین جہانگیر شہنشاہ ہند تھے اور نور جہاں ملکہ ہند۔ دریا خاں حسن پور (جو اب مراد آباد کا ایک قصبہ ہے) میں اپنے ہم قبیلہ رکن الدین خاں بازید خیل کے مہمان ہوئے جو ایک بزرگ شخص اور شاہی منصب دار تھے۔ ذی عزت اور عالی مرتبت میزبان نے اپنی بیٹی بڑی کو دریا خاں کے قبائلیہ نکاح میں دے دیا۔ یہی بیوی نواب بہادر خاں، محمد خاں اور عنایت خاں کے والدہ ذی وقار قرار پائیں اور انھیں دریا خاں کی نسل از اول تا آخر مغلیہ دور کے کمال و زوال کے اہم حلوں میں ہم رکاب رہیں۔ دریا خاں کا محب و محسن خان جہاں لودی سپہ سالار اعظم افواج جہانگیری تھا جس کی بدولت دریا خاں کو شاہی منصب داری ملی۔ سہ ہزاری منصب کے علاوہ شہزادہ خرم ولی عہد بہادر کی اتالیقی کا عظیم مرتبہ بھی حاصل تھا۔ یادو (بہادر خاں) تیرہ سال کی عمر میں ولی عہد سلطنت کی مصاحبت میں داخل ہو گئے باپ بیٹے کی شاہی منصب داری اور مصاحبت کے وہ شب و روز دونوں کے واسطے فیصلہ کن تھے۔ دریا خاں کا ستارا خان جہاں لودی کے ستارے کی پشت پر پہنچ کر ہمیشہ کے لئے بے نور ہو گیا اور بہادر خاں کا طالع شہنشاہ شاہجہان کے ستارہ اقبال کے گرد طواف کرتا رہا اور شاہ خاور کی تابانی سے نور علی نور بہادر دریا خاں نے بھی راہ وفا پر چل کر اپنے محسن اور محب صادق خان جہاں پر جاں نثار کر دی، بہادر خاں بھی راہ خلوص و وفا میں تا حیات رواں دواں رہے اس وقت بھی وہ آقا کے وفادار و جاں نثار رہے جب ۱۰۵۵ھ کی ہم بلخ کے سلسلے میں بہادری کے تاریخی تقاضے پورے کر دینے کے بعد نوازشات شاہی کے امیدوار ہوئے مگر حاسدوں کی سازشوں کے طفیل عذاب و عتاب کی آزمائش میں پڑے منصب اور جاگیر سے محروم کئے گئے سلامی اور حاضری دربار بند ہوئی۔ ہم چشمونیزامرا نامور میں رسوا و خوار ہوئے۔ بہادر خاں بھی داؤد زئی قبیلے کے ایک نام آور سردار، مثالی وفادار دوست اور چار ہزاری امیر و عہدہ دار دریا خاں کے غیور فرزند تھے۔ نسبی غیرت کے تقاضے کچھ اور تھے لیکن وضع داری و وفاداری اور ایمان داری کے کچھ اور۔ نواب بہادر خاں میدان کارزار میں ایک رخ سے شیر نیستاں تھے تو دوسرے رخ سے شاطر بے عدیل، وہ دیکھ چکے تھے کہ کھلاڑیوں میں کون کس کو دبا رہا ہے اور مہر کس کی حد میں داخل ہو کر ہار جیت کے قریب ہیں۔ وہ ایک عرصہ دور اندیش اور جنگی حکمت عملی کے ماہر سالار کے علاوہ اعلیٰ پایے کے سیاست داں اور مدبر بھی تھے

ان کے وکیل اور خیر طلب امراء و وزراء بہادر خاں کی خیر خواہی کا حق بارگاہِ سلطانی میں ادا کرتے رہے بعد تحقیق سارے الزامات مثل شاہی امانت میں خیانت، مہیم بلخ کی بلغاروں اور مقابلوں میں کمزور بازوؤں کو مدد نہ پہنچانا۔ وانی توران نظر محمد خاں کا فرار ہونا اور تعاقب کر کے گرفتار نہ کرنا اور شہزادہ اورنگ کے حضور آداب شاہی کا لحاظ نہ رکھنا وغیرہ بے وزن و بے بنیاد ثابت ہوئے۔ حاسدوں اور رنج بیجا پہنچانے والوں کے رنگ پھیکے پڑ گئے اور دیدہ جوہر شناس میں ان نامرادوں کی قیمت گر گئی۔ بہادر خاں کے اعزازات اور درجات بلند ہوئے۔ اعیان دولت میں ممتاز و منفرد کہلائے قبل اس کے وہ امراء سلطنت مغلیہ کی آخری منزل ہفت ہزاری تک پہنچتے پنج ہزاری منصب داری اور امارت کے زمانے میں آخری کارنامہ جنگ واقع قندھار شاہ عباس ثانی وانی ایران کے خلاف قندھار کی ہم ۱۰۵۹ء مطابق ۲۲ جولوس میں جب شہزادہ اورنگ زیب کو اس کی تادیب کے لئے مامور کیا گیا عین عالم جنگ میں ضیق النفس کا شکار ہوئے اور ۱۹ رجب ۱۰۵۹ء بمبر چوالیس سال سفر آخرت اختیار کیا۔ نعش شاہجہاں پور لا کر دفن کر دی گئی۔

عمدۃ الملک، نواب، بہادر خاں، چغتائواب ممدوح کے وہ خطابات و اعزازات ہیں جن کے لئے امراء دولت ترستے اور خطاب یافتہ ان پر رشک کرتے تھے مگر نواب بہادر خاں کی اولاد میں نواب غیرت خاں المناط بے دلاور خاں اور سب سے چھوٹے فرزند عبدالعزیز خاں المناط بے بہادر خاں دربار مغلیہ کے آخری خطاب چغتائواب سے سرفراز تھے نواب عبدالعزیز خاں ہفت ہزاری امیر، جاگیر دار و منصب دار بھی ہوئے اورنگ زیب عالمگیر کے ارکان دولت میں اہم ترین امیر شمار ہوتے تھے۔ نواب بہادر خاں کی سولہ اولادیں مختلف بیگموں کے بطن سے تھیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

اول بیوی جن کا نام بانو تھا : بہادر خاں کے چچا ہندال خاں کی بیٹی تھیں۔ ان کا لقب کلاں محل تھا۔
دوسری بیوی کا نام جان بی بی تھا : یہ برکی قبیلے کی تھیں۔
تیسری بیگم حنانا نامی تھیں : یہ قبیلہ نرین کی تھیں اور خورد محل کہلاتی تھیں۔
چوتھی بیگم چتر تھیں : یہ راجہ بھوپ سنگھ بندیلہ کی بیٹی تھیں۔ مسلمان ہو کر 'بوستان' نام پایا۔
پانچویں چندر بدن تھیں : یہ پر بہار راجپوتی تھیں۔ اسلام قبول کر لیا تھا۔
چھٹی بیگم صاحبہ خاتون : قوم نوحانی سے تھیں۔ نوحانی خاندان اپنے وقت کا بااثر اور طاقتور خاندان تھا۔
ساتویں بیگم دکھنی بی بی : کہلاتی تھیں جن کا سنزنی قبیلے سے تعلق تھا۔

نواب بہادر خاں کی اولادوں میں چھ لڑکیاں اور دس لڑکے تھے جن کا ذکر ذیل میں درج ہے۔

دختران

سودابی بی ، زلیخا بی ، خدیجہ بی بی ، زہرہ بی بی ، زینت بی بی اور چھٹی بیٹی کا نام
مانکی بی بی تھا

دس فرزند یوں تھے

نواب دلاور خاں : بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ نواب بہادر خاں کے انتقال کے وقت پندرہ سال کے تھے۔ دو ہزاری منصب تک پہنچے تھے کہ ۱۰۶۸ھ میں بمقام کابل عین عالم جوانی میں رحلت فرمائی۔ 'خانی' کے خطاب سے بھی سرفراز تھے۔ ہم قندھار میں شہزادہ دارا شکوہ ولی عہد سلطنت کے ہم رکاب تھے اور بہادرانہ کارنامے انجام دیئے تھے۔ نعش کابل سے شاہجہانپور لاکر مقبرہ بہادر خاں میں دفن کی گئی۔ صرف پچیس سال زندگی پائی۔ ان کے نام سے محلہ دلاور گنج اور چند دیہات منسوب ہیں۔

نواب اختیار خاں : صاحب منصب تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں وفات پائی۔ [کب انتقال ہوا اور کہاں مدفون ہیں معلوم نہیں۔] ان کے نام سے چند دیہات منسوب ہیں۔

نواب مظفر خاں : منصبدار تھے عہد اورنگ زیب میں متعدد معرکوں میں شریک رہے اور عالم گیری عہد میں فوت بھی ہوئے۔ موضع بادشاہ نگر کے جو شہر کے جنوب مغرب میں مشہور دیہات میں ہے [پختہ باغ میں مدفون ہوئے جس کو خود ہی نصب کیا تھا۔ ان کے اکلوتے بیٹے نواب شجاعت خاں بھی ان کے پہلو میں دفن ہیں جن کے نام سے موضع شجاعت پور آباد ہے۔ شجاعت خاں کے لاولد بھنے سے سلسلہ ختم ہو گیا۔ نواب مظفر خاں کے نام سے بازار اور محلے موجود ہیں۔

نواب فتح خاں : عہد عالم گیری میں لاہور کے صوبیدار تھے اور وہیں انتقال ہوا۔ غصہ ور تھے۔ مزاج کی تندہی و تیزی کی وجہ سے غیر مقبول ہو گئے تھے شہر کے مشرقی حصے میں ان کے نام سے محلہ فتح پور آباد ہے۔ اسی محلے میں ان کے محلات تھے جن کے کھنڈرات پر اب عالی شان مکانات تعمیر ہو گئے ہیں۔

نواب حسین خاں : ان کے سن وفات اور دفن کی کچھ خبر نہیں لیکن اورنگ زیب کے عہد حکومت میں صاحب منصب تھے۔ محلہ حسین پورہ نواب صاحب کا آباد کردہ ہے۔ چند دیہات بھی ان کے نام سے منسوب ہیں۔

نواب دلیر بہت خاں : نہایت دلیر و بہادر تھے۔ متعدد فوجی معرکوں میں ان سے بہادرانہ

کارنامے ظاہر ہوئے۔ صاحبِ خطاب تھے۔ ان کے نام سے دلیر باغ اور بازار و محلہ دلیر گنج موجود ہے۔ عالم شباب میں انتقال ہوا۔ کب اور کہاں فوت ہوئے اور کس جگہ دفن ہوئے نامعلوم ہے۔ تاریخ بھی اس باب میں خاموش ہے۔

نواب رنمست خاں؛ نواب بہادر خاں کے بہادر بیٹے تھے لیکن حد درجہ تند خو تھے اور ان کی جوانمردی کا سبب بھی ان کی شعلہ مزاجی اور آبلہ پائی ہوا۔ تاریخ صبح میں جو واقعہ بیان ہوا وہ کچھ اس طرح ہے کہ ان کے چچا نواب دلیر خاں کا بازدار باز لئے جا رہا تھا رنمست خاں نے باز طلب کیا، بازدار نے انکار کر دیا یہ طیش میں بھکر چچا سے شکایت کرنے گئے۔ قضا مارا بازدار بھی اسی وقت آپہنچا۔ چچا دلیر خاں نے بھتیجے رنمست خاں کی شکایت کو درخور اعتنا نہ سمجھا تو اسی طیش کے عالم میں بازدار سے ٹھپن کر نواب دلیر خاں کے سینے پر باز دے مارا۔ چچا دلیر خاں نے بظاہر اثر ظاہر نہیں ہونے دیا لیکن بعد میں قتل کر دیا۔ رنمست خاں بھی اورنگ زیب اور داراشکوہ کے درمیان تاج و تخت کی جنگ میں شریک تھے اور آسام میں دلیر خاں کے ساتھ ہتات میں بھی شریک رہے تھے۔ منصبدار و خلعت یافتہ تھے۔ سال وفات اور مدفن کا حال معلوم نہیں۔

نواب غیرت خاں چغتآ؛ نواب بہادر خاں کے دو عظیم المرتبت بیٹوں میں ایک یہ تھے درجہ امارت میں صرف اپنے سب سے چھوٹے بھائی نواب عبدالعزیز خاں سے کمتر تھے ورنہ خطاب یافتہ تھے اور آخری عظیم ترین خطاب چغتآ سے سرفراز تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ سلطنت میں شباب کو پہنچے اور خوب خوب معرکے سر کئے۔ بہادر باپ کے سچے جانشین یہی ثابت ہوئے۔ بہترین خدمات کے صلے میں شاہ جہاں پور کی نوابی دوبارہ حاصل کی جو نواب بہادر خاں کے انتقال کے بعد خالصہ میں شامل کر لی گئی تھی اور اولاد بہادر خاں کو نوابی سے محروم کر دیا گیا تھا۔ نواب غیرت خاں والئی شاہ جہاں پور قرار دیئے گئے اور آخر تک ان کی نسل یہاں کی والی رہی اگرچہ چھوٹے بھائی نواب عبدالعزیز خاں شاہ جہاں پور کی نوابی حاصل کرنے میں مسلسل مصروف رہے، اسی بنیاد پر دونوں بھائیوں کے درمیان افتراق رہا جو بعدہ دونوں کی اولادوں میں منتقل ہو گیا۔ غیرت خاں کا منصب پانچ ہزاری ذات اور پانچ ہزار سوار کا تھا۔ ایک جنگ میں اس طرح زخم آئے کہ چہرہ بگڑ گیا جس کے سبب دربار جانا بند کر دیا تھا۔ بعمر ساٹھ سال ۱۷۰۲ء ذی الحجہ ۱۱۲۰ھ شاہ عالم بہادر شاہ اول کے دور میں انتقال کیا اور نواب بہادر خاں کے مقبرے میں جاسوئے نہایت غریب نواز اور فراخ دل امیر تھے۔ دو بیٹے مبارز خاں اور زین الدین خاں تھے۔

نواب بختیار خاں: دور شاہجہانی میں منصبدار ہوئے اور عہد عالم گیری میں ترقی پائی۔ قصبہ بہلول پور میں ۱۱۰۸ھ میں انتقال ہوا۔ شاہجہانپور کے منفرد شاعر نواب غلام حسین خاں حسین نواب بختیار خاں ہی کی نسل سے تھے۔

نواب عبدالعزیز خاں بہادر چغتائے: نواب بہادر خاں کے انتقال کے وقت شیرخوارگی کی عمر میں تھے۔ ان کی والدہ صاحبہ خاتون نے جو قبیلہ نوحانی سے تھیں ان کی پرورش و تربیت کی اور اورنگ زیب عالم گیر کے زمانہ حکومت میں ملازم شاہی ہوئے۔ بھائیوں میں ہفت ہزاری امیر دوسرا نہ تھا لیکن چغتائے کے معزز ترین خطاب سے ان کے علاوہ ان کے بڑے بھائی نواب غیرت خاں بھی سرفراز تھے۔ نواب عبدالعزیز خاں کی ناناہال اپنی تمول اثر و قوت میں مشہور تھی۔ جمال خاں و پہاڑ خاں اس قبیلے کے نام آور سردار تھے اسی سبب دربار شاہی میں عبدالعزیز خاں کا زیادہ رسوخ تھا۔ نواب موصوف اورنگ زیب کے عہد سے محمد شاہ کے عہد تک دربار سے وابستہ رہے اور ہمیشہ سرفروہ رہے۔ تاج و تخت سے وفادار رہنا ان کا ایمان تھا اور سدا اس کا دامن تھا ما جو صاحب تلج و تخت ہوا۔ سادات بارہ زمانہ فرخ سیر میں حاکم کل تھے۔ انھوں نے جب نواب عبدالعزیز خاں کو بھی اپنا ہم خیال بنا کر فرخ سیر کو معزول کرنا چاہا تو یہ آمادہ نہیں ہوئے اور یہ کہتے ہوئے مجلس سے اٹھ گئے کہ میں اور میرے ابا تخت سلطنت کے ہمیشہ وفادار رہے ہیں مجھ سے یہ نمک حرامی نہیں ہو سکتی ہے۔ اس وقت سادات بارہ کے خلاف اس طرح علانیہ بات کہنا آسان نہ تھا۔ نواب صاحب ہمیشہ گروہ بندی سے الگ رہے اور ایک دوسرے کی سازشوں میں کبھی شریک نہ ہوئے ان کے اعلیٰ کردار اور جذبہ وفاداری کے تقاضے تھے جن پر تاحیات عمل کیا۔ وہ صرف فوجی کماندار ہی نہ تھے مدبر بھی تھے اور دور بین بھی لیکن خاندانی اور خانگی معاملات میں اعتدال سے اس حد تک آگے نکل چکے تھے کہ اہل خاندان ہی نہیں بھائیوں کے درمیان بھی غیر مقبول و ناپسندیدہ رہے۔ شاہجہانپور کے والی بن جانے کی آرزو نے زندگی بھر ان کو بے چین رکھا اور کبھی سکون سے رہنے نہ دیا۔ یہ محض اپنی بلندی مرتبہ اور امارت کے بل پر نواب بننے کا حق منوانا چاہتے تھے۔ خاندان والے نواب غیرت خاں کے دل سے طرفدار تھے۔ بہادر خاں کے انتقال کے بعد شاہجہانپور کی جاگیر خالصہ بنائی گئی تھی۔ نوابی صرف بہادر خاں کے دم تک تھی۔ شاہجہانپور کو الہمتا کرنا آسان نہ تھا یہ کارنامہ غیرت خاں نے انجام دیا جو اپنی جان پر کھیلے اور ایسے ایسے معرکوں میں فن سپہگرمی کے جوہر دکھائے جہاں شیروں کے پتے پانی ہو جائیں، جاں سپاری اور جاں نشاری کے صلے میں بطور انعام التمنا حاصل کیا اور وہی ریاست

شاہجہانپور کے والی و نواب قرار پائے، وارث نوابی غیرت خاں کی اولاد ہوئی نہ کہ نواب عبدالعزیز خاں اور ان کی اولاد۔ نواب ممدوح نے پانچ مغلیہ سلاطین کی نہایت وفاداری سے خدمت انجام دی اور نظروں میں سر بلند رہے، ان کا سر بلند ہونا یونہی نہ تھا، سرفروشی کے موقع پر کبھی آنکھ بچانی نہ جی چھوڑا۔ میدان کارزار میں ہمیشہ سرخرو ہوئے مگر درباری سازشوں سے دور اور گروہ بندیوں سے بے تعلق رہے ان کے فرزند نواب تہور خاں بھی محمد شاہ کے زمانے میں باپ کی مانند ہفت ہزاری امیر تھے۔ باپ بیٹے نے پوری قوت سے سادات بارہ کا مقابلہ کیا جب وہ محمد شاہ کو بھی فرخ سیر کے مانند معزول کرنے پر تل چکے تھے۔ اس مقابلے میں نواب عبدالعزیز خاں کو شاہ پور (SHAH PUR) کے مقام پر شاندار فتح حاصل ہوئی سادات بارہ تحس ہمیشہ کے لئے بے وقعت ہو گئے اور یہ دونوں باپ بیٹے بارہ شکن کہلائے۔ ۱۱۳۵ھ ہجری میں بمراسی سال نواب عبدالعزیز خاں فوت ہوئے اور اپنے مقبرے میں جس کو اپنے والد نواب بہادر خاں کے مقبرے کے مقابل تعمیر کرا چکے تھے دفن کئے گئے۔ شاہجہانپور میں ان دو مقابر کے علاوہ یہاں وسیع و شاندار جامع مسجد تعمیر کرائی۔ کٹرہ عزیز گنج اور چند دیہات ان کے نام سے منسوب ہیں۔ دلی اور آگرہ میں مملات تعمیر کئے اور بستیاں و محلے بھی اپنے نام سے آباد کئے تھے۔

بانی شہر نواب بہادر خاں کو بیس ہزار بیگہ زمین آبائی شہر کے لئے اور چند دیہات بمنزلہ محال بارگاہ سلطانی سے عطا ہو گئے تو انھوں نے اپنے معتمد خاص خواجہ بلند کے ہمراہ انور مہار کو ضروری ہدایات کے ساتھ نواب دلیر خاں کے پاس بھیج دیا جو اس وقت یہاں موجود تھے۔ دلیر خاں اس وقت ابھرتے ہوئے نائب سالار تھے۔ شاہجہانپور کی تعمیر ان کی نگرانی میں ہوئی اور انھوں نے ہدایت کے مطابق شہر کا خاکہ مکمل کرایا۔ عالی شان قلعہ اور دیگر عمارات تعمیر کرائیں۔ نواب صاحب کو توطن کے لئے کسی مناسب جگہ کی مدت سے جستجو تھی۔ پہلے بہادر گڑھ بسایا مگر وہاں دل نہ لگا قنوج۔ کاپی جاگیر تھی۔ قنوج پر نظر گئی، محل سرا تعمیر کرا کر بود و باش اختیار کر لی اور بہادر گڑھ مع عمارات اپنے بھائی عنایت خاں کے حوالے کر دیا۔ قنوج کے قیام کے زمانے میں بعد تادیب باغیان گنگا درگا کی زرخیزی اور آب و ہوا دیکھی تو باغ باغ ہو گئے اور اسی سر زمین کو اپنا وطن قرار دیا۔ ۱۱۴۶ھ مطابق ۱۶۳۶ء شہر کا سنگ بنیاد رکھا گیا (یہ سن متنازع ہے) دس سال میں شہر کی تعمیر مکمل ہو گئی۔ گڑھی رنوںہر جو ایک بلند اور پُر فضا مقام پر واقع تھی ڈھادی گئی اور اسی کھیرے پر بانی شہر کا پر شکوہ قلعہ تعمیر ہو گیا۔ ماتحت فوجی افسروں نے پسندیدہ زمینات پر حویلیاں بنوائیں۔ قریب قریب بھی

سپاہیوں نے بودوباش اختیار کر لی۔ شہر آباد ہو گیا جس کا نام آقا کے نام کی نسبت سے شاہجہانپور رکھا۔ اس نوآباد شہر کو دوسرا افغانستان بنانے کا خواب لئے ہوئے ۱۰۵۴ھ میں نواب بہادر خاں افغانستان پہنچے تو نو ہزار پٹھانوں کا قافلہ اپنے بھائی اور چچا کی رہبری میں شاہجہانپور روانہ کیا اس کے بعد آنے والے مسلسل آتے اور توطن اختیار کرتے رہے۔ قلیل مدت میں یہ جنگل ایک خوبصورت شہر اور فولادی قلعہ بن گیا۔ بغیر تحریص و ترغیب ہندوستان کے بہت سے مقامات سے افغانوں کے چھوٹے چھوٹے گروہ آکر یہاں آباد ہو گئے اور یہ سلسلہ نواب بہادر خاں کی زندگی تک جاری رہا۔ قنوج سے بہادر خاں کے رشتہ داروں اور قرابتداروں نیز لشکریوں نے بھی شاہجہانپور کا رخ کیا اور ایک ایک دو دو خاندان منتقل ہوتے رہے اور بودوباش اختیار کرتے گئے۔ جس انتظام اور منصوبہ بندی سے شہر آباد کیا گیا تھا اس وقت پورے ملک میں اس کی نظیر کوئی دوسرا نوآباد شہر نہ تھا۔ بانی شہر کو دوسرا افغانستان وضع کرنے اور اس شہر کو مثل افغانستان ڈھال دینے کی دلی تمنا تھی۔ انھیں بنیادوں پر قبیلوں کو الگ الگ آباد کرنے کا منصوبہ عمل میں لایا گیا۔ باون قبائل جو آئے ان کے نام پر محلوں کے نام رکھے اور علیحدہ علیحدہ بسائے گئے ہر محلے کا اپنا انتظام اور اپنی پنچایت تھی، بین القبائل شادی بیاہ کی ممانعت اس غرض سے تھی کہ نسلی اعتبار سے ہر قبیلہ خالص رہے اور ایک کا خون دوسرے قبیلے کی شریانون میں نہ دوڑنے پائے اگرچہ سو ڈیڑھ سو سال بعد یہ پابندی باقی نہیں رہی اور قبیلے ایک دوسرے میں ضم ہو گئے۔ شہر کے چند گھرانے آج بھی خود کو خالص بتاتے ہیں ممکن ہے یہ دعویٰ غلط نہ ہو۔ شہر کے اطراف میں افغانوں کو بسا کر شہر پناہ کی مضبوط چہار دیواری کھڑی کر دی گئی۔ وسط شہر میں غیر مسلم پٹھان جو افغانستان سے ہجرت کرنے والوں کے ہمراہ آئے تھے بنظر تحفظ آباد کئے گئے۔ اس شخصی دور میں اس سے زیادہ حفاظت ممکن نہ تھی۔ منہ میں زبان کی مانند یہ غیر مسلم محفوظ و مامون تھے۔ بعد میں آنے والی آفات کے وقت نواب بہادر خاں کی دردمندانہ اور دور اندیشانہ حکمت عملی کا تجربہ بھی کیا گیا۔ جو کچھ گزری وہ باہر کی آہنی دیواروں پر گزری جو اپنی سچائی کا ثبوت دینے صدیوں سے کھڑی تھیں۔ وسط شہر میں پٹھانوں کے غیر مسلم خاندان آج بھی موجود شاد و آباد ہیں۔ انھیں کی نسلیں پھیل پھول رہی ہیں۔ یہ گھرانے کھتری کہے جاتے ہیں۔ پٹھانوں جیسا قد و قامت اور ناک نقشہ پہلی نظر میں افغانی نظر آتے ہیں۔ مفتوحہ علاقوں کے قدیم باشندوں کو از سر نو دیہات میں اور شہر میں مناسب مقامات پر آباد کیا گیا۔ ہر محلے کے بازار اور کارگزار مقرر کر دیئے تاکہ آبادی کو ضرورت کے لوگ

مثل کاری گر، ہنرمند، دھوبی، موچی، بہتر، مزدور، کھار وغیرہ دستیاب ہونے میں دشواری پیش نہ آئے
افغانہ میں ممتاز قبیلے نواب صاحب کی ترغیب پر آکر آباد ہوئے تھے جن کو حسب حیثیت و مرتبہ
زمینات و مراعات دی گئی تھیں۔ اس قدر دانی نے اہل افغانستان کو حوصلہ دیا تھا اور وہ نواب بہادر خاں
اور ان کی اولاد کے ہمیشہ جاں نثار و وفادار رہے۔ نواب مدوح کے انتقال کے بعد آنے والے پٹھانوں
کے قافلے شاہ آباد (ضلع ہردوئی) کی جانب بڑ گئے جہاں نواب دلیر خاں ان کی پیشوائی کے لئے چشم براہ
تھے شاہجہانپور کی نوابی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ فرزند ان بہادر خاں کے درمیان کشمکش شروع ہو چکی تھی۔
نواب دلیر خاں نے ممکن ہے رفع بشر کی خاطر املاک بہادر خاں بھائیوں میں تقسیم کر دی اور کسی
ایک بیٹے کو افسر خاندان نہیں بنایا۔ بہت ممکن ہے کوئی دیگر مصلحت مخفی ہو کیوں کہ خود ان کی اپنے
ریاست شاہ آباد شاہجہانپور کی مدد سے ملی ہوئی تھی۔ اس تقسیم ریاست و وراثت کے بعد عملی طور
پر اجتماعی قوت منتشر ہو گئی۔ شہر کے محتاط و غیور پٹھان جانبداری کے الزام سے محفوظ رہنے کے لئے
دور و نزدیک کی جاگیرات، ریاستوں اور شہروں میں جا بسے یا فوج میں بھرتی ہو کر شہر اور دیہات خالی
کرتے رہے اس طرح معتد بہ آبادی منتقل ہو گئی جبکہ نواب بہادر خاں نے اپنی حیات میں اس شہر کو
فولادی قلعہ کا مکمل خاکہ دے دیا تھا مگر وارثان کی خود ستانی، خود غرضی اور کم بینی نے وہ موقع ہاتھ سے
کھو دیا جو دوبارہ ہاتھ نہ آیا یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کی سسی ناکام کے نتیجے میں نواب بہادر خاں کا خوبصورت
خواب شاہجہانپور کی خاک کا پیوند ہو گیا۔ جس طرح شاہجہاں کے بعد سلطنت کو گھن لگنا شروع ہو
گیا تھا اسی طرح نواب بہادر خاں کے خاندان کا زوال نواب بہادر خاں کے انتقال کے بعد نظر آنے لگا تھا
جیسے جیسے مغلیہ حکومت کا سورج ڈوب رہا تھا بہادر خاں کا گھرانہ بھی گہنایا ہوا چاند دکھائی دے رہا تھا
اور ۱۸۵۷ء میں آخری جھلک دکھا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ نواب عبداللہ خاں ابن نواب زین الدین
خاں ابن نواب غیرت خاں ابن معتد الدولہ نواب بہادر خاں چغتاجو تھی پشت میں آخری والی شاہجہانپور
تھے۔ ۱۶۳۷ء میں شاہجہاں پور کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا ۱۸۵۷ء میں دوسو بیس سال بعد تختہ پلٹ
گیا۔ نواب رحمت خاں والی روہیلکھنڈ کے خلاف نواب شجاع الدولہ والی اودھ نے انگریزوں کے
معیث میں فوج کشی کر کے بعد فتح وسیع علاقے اودھ میں شامل کر لئے تھے ان میں شاہجہانپور بھی
شامل تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۸۰۱ء میں وہ علاقے نواب اودھ کی عملداری سے نکال کر اپنی نگرانی
میں لے لئے۔ نواب عبداللہ خاں کی پنشن مقرر کر دی اور نواب کا خطاب موروثی تسلیم کر لیا۔ نواب
عبداللہ خاں کے بعد ان کے فرزند کلاں نواب فیض اللہ خاں برائے نام نواب رہ گئے تھے۔ احمد شاہ نے

سہ ہزاری منصب اور خطاب سے بھی سرفراز کیا تھا۔ کمپنی نے زمینداری اور تاجری کسٹم جاری کر دیا جاگیریں اونچی بولیوں پر دی جانے لگیں۔ نواب فیض اللہ خاں کی بنی جائیدادیں محفوظ تھیں مگر ۱۸۵۷ء میں وہ بھی وارثوں سے چھین کر ابن الوقت قسم کے لوگوں کو دے دی گئیں۔ ان کی حویلیاں، محلات اور کوٹھیاں ضبط کر کے انگریزوں نے دریادلی سے تابعداروں اور نمک خواروں کے حوالے کر دیں۔ بہادر خاں اور عبدالعزیز خاں کے مقابلہ نیلام کر دیئے جو بعد ایک مدت واکزار کر کے گئے۔ جن نواب زادوں، خانزادوں اور غیور پٹھانوں نے آزادی وطن کے لیے جانیں دیں، گھر مٹوائے، جاگیریں ضبط کر لیں، قلاکش و دست نگر ہوئے انھیں کی نسلیں ذلیل و خوار ہوئیں نواب بہادر خاں کے وطن میں ذلت و خواری کا سلسلہ ہولی کے نواب کے روپ میں آج بھی جاری ہے۔

اس شہر کی علمی ادبی اور ثقافتی زندگی کا آغاز اس کی تکمیل سے قبل ہو چکا تھا۔ جب تنظیم و تعمیر سے فراغت حاصل ہو گئی تو درس و تدریس کے لیے باقاعدہ تعلیم کاہیں قائم ہو گئیں۔ علمی سرگرمیوں کی رفتار تیز ہو گئی۔ جن میں علماء، شعراء اور دانشوران قصبہ کانت پیش پیش تھے شاہجہاںپور سے بجانب جنوب و مغرب ۱۲-۱۳ کلومیٹر کی دوری پر کانت کے نام سے یہ قصبہ آباد ہے جو دور اکبری میں ایک اہم مرکزی مقام تھا۔ ملاً عبدالقادر بدایونی یہاں جسٹس کے منصب پر فائز تھے۔ کانت کا سرکاری مرتبہ کمشنری کے برابر تھا۔ اس قصبے میں ہر علم و فن کے ماہرین موجود تھے۔ ابتداء آبادی شاہجہاں پور کے وقت افغانستان سے آکر توطن اختیار کرنے والوں میں اصحاب سیف کے علاوہ ارباب قلم بھی تھے۔ صوفیائے کرام، شیوخ، علماء دین، ماہرین فنون بھی تھے۔ زبان فارسی اور پشتو کے شاعر اور ادیب و شاعر بھی۔ فارسی کا چلن تھا، عوام و خواص روزمرہ میں یہاں کی زبان (اردو) بولتے اور خال خال لکھتے بھی تھے لیکن فارسی کو جو فوقیت حاصل تھی وہ اردو کو نہ تھی درس و تدریس کا آغاز زبان فارسی میں ہوا۔ پہلے پہل روحانی پیشوا اور عالم دین تشریف لائے۔ ان میں حضرت آدم بنوری کے چار خلفاء حاجی ابوسعید شیخ عثمان نقشبندی، شاہ امان اللہ نقشبندی، ملاً سید احمد نقشبندی اور شیخ عبدالنبی نقشبندی تھے حضرت عبدالقادر گیلانی قدس اللہ سرہ سے دسویں پشت میں سید ابواسحاق ابراہیم حموی گیلانی علیہ بعد شاہجہاں وارد ہند ہوئے۔ نواب بہادر خاں کو ان کے خاندان سے عقیدت تھی وہ ان کو باصرار شاہجہاں پور لے آئے۔ آپ نے جس مقام پر سکونت اختیار کی وہ اب جھنڈا کلاں کے نام سے معروف ہے جہاں آپ کی اولاد آباد ہے۔ ان پاکیزہ ہستیوں کے علاوہ بے انتہا شیوخ اور درویشوں نے اس گلستاں تازہ کو روشنی اور رنگ و بو عطا کی جن کے کمالات

روحانی سے زمانہ واقف ہے۔ مدارس قائم کرنے میں اولیت کا سہرا حضرت خواجہ خضر کے سر ہے یہ پہلا مدرسہ تھا جو خواجہ خضر نے اپنے مسکن مکان واقع محلہ گاڑی پورہ میں قائم کیا تھا جس کے اخراجات اور کفالت کے لیے نواب بہادر خاں نے ایک چک آراضی عطا فرمایا تھا جو چک خواجہ فیروز کے نام سے اب ایک گنجان آبادی والا محلہ ہے۔ مدرسہ بحر العلوم جس کو بارہویں صدی ہجری میں نواب عبداللہ خاں نے محلہ باقرزی میں قائم کیا تھا تمام مدارس میں افضل تھا۔ اس ادارے سے بے شمار عالم و فاضل فارغ ہو کر اکناف عالم میں علم کی روشنی پھیلاتے رہے تھے۔ بحر العلوم کے بعد دو سکس نمبر پر ظریف خاں والا مدرسہ تھا جس کی عمارت نواب حافظ الملک نے تعمیر کروائی تھی۔ یہ مدرسہ بلحاظ فضیلت ممتاز تھا۔ بیرون ملک کے بے شمار طالبان علم فارغ ہو کر یہاں کا نام روشن کرنے لگے تھے۔ آخری دور کے مدارس میں مدرسین العلوم مدرسہ جامع مسجد اور مدرسہ فیض عام درس و تدریس کا حق ادا کرتے رہے ہیں۔ مدارس عربیہ اگرچہ زوال پزیر ہیں مگر اب بھی ان کا معیار تعلیم کم و بیش ویسا ہی ہے جیسا آزادی سے قبل تھا۔ اس دور آخر کے علماء شہر میں مولوی کفایت اللہ مولوی عبدالغنی صاحب سید مولوی مہدی حسن صاحب تھے۔ مذکورہ تینوں علماء مفتی اعظم ہند کے عظیم دینی منصب پر فائز رہ چکے تھے۔ مولوی ریاست علی خاں صاحب مولوی مجتبیٰ حسن خاں صاحب اور مولوی کفایت اللہ (معلم اول مدرسہ جامع مسجد) معتبر علماء میں شمار ہوتے تھے۔ اس دور سے قبل کے زمانے میں مشہور زمانہ مولوی مدن صاحب اور ان کے بھائی مولوی سدن صاحب تھے۔ مولوی نظام الدین۔ مولوی قطب الدین خاں صاحب مولوی عبدالرحمن خاں اور دو سکس بہت سے علماء موجود تھے جو اس شہر کی آبرو تھے۔ اول دور کے فضلاء میں قاضی لقمان، ملا زاہد، مولوی عبدالحلیم، ابوالعلماء مولوی حاجی عبداللہ خاں صاحب جیسے علم کے سمندر تشنگان علم کی تشنگی مٹاتے اور علم کی تخم ریزی کیا کرتے تھے جن کی فصلوں سے زمانہ اب تک فیض پارہا ہے۔ یہاں کے علماء کا یہ مرتبہ تھا کہ حرمین شریفین کے عالم بعض مسائل میں علما شاہ جہاں پور سے رجوع ہوتے تھے اور یہاں کے فیصلوں کو معتبر سمجھتے تھے۔ جامعہ ازہر کے درجے کی درسگاہیں تھیں۔ اللہ اللہ کیا زمانہ تھا اور کیا مقام تھا اس شہر کا جس کی عظمت سے اہل شہر بے خبر ہیں۔ باہر سے آکر یہاں قیام کرنے والے ارباب علم و فن کے علاوہ یہاں کے قدیم لوگوں میں بھی اہل علم موجود تھے جنہوں نے آنے والے کو فراخ دلی سے لٹیک کہا اور ان میں جذب ہو گئے فن شعر و ادب کی ابتدائی سرگرمیوں میں باقاعدگی لانے کا سہرا لاد سب سکھ رائے مہرور کے سر ہے جو قصبہ کانٹ کے سید عبدالنبی کے شاگرد تھے۔ مسرور خود بھی فاضل ہندی، سنسکرت، اردو و فارسی ادب

تھے اور متعدد اہم تصانیف کے مصنف بھی۔ ان کے ہم عصروں میں شیخ فصیح الزماں کانٹوی، شیخ احمد خاں عرف ملامتوں نثار، محمد عمر خاں وہبی لالہ بیگانہ۔ شیخ احمد خاں اظہر وغیرہم ہوئے ہیں۔ ملامتوں نثار ہندی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر خوب کہتے تھے۔ ان کے بعد والے شعراء میں سید غلام جیلانی رفعت، نواب غلام حسین خاں حسین، موتی لال ساقی منشی عبوض رائے مسرت، میوارام جوہر اور کرشن سہلے فرحت تھے۔ یہ سبھی شعراء اصحاب تصنیف تھے سخن گوئی میں منشی عبوض رائے مسرت اور نواب غلام حسین خاں حسین کی شہرت ملک کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک پھیلی ہوئی تھی، نواب صاحب کی نکتہ رسی، شاعرانہ بیانت اور سخن فہمی کی فراخ دلی سے داد دینے والوں میں سودا اور غالب بھی تھے۔ مسرت نے بھی میدان شاعری اور نثر نگاری میں ایسے ایسے کمالات دکھائے کہ اہل علم و فن دنگ رہ گئے۔ ان کے تلامذہ میں سیوارام جوہر، ہمت پرشاد سرور، خلیفہ سمیع اللہ۔ مولوی فخر الدین احمد دہلوی، حکیم محمد شاہ عالم لکھنوی کے ماسوا دیگر بہت سے شاگرد معروف و مشہور تھے۔ آشوب ۱۹۵۷ء میں ان میں سے بیشتر شعراء کا کلام تلف ہو گیا۔ اس ہنگامے نے اس شہر کی علمی ادبی اور ثقافتی زندگی تباہ کر دی تھی۔

ماہرین، فنون لطیفہ اور تعلیم یافتہ شہری بڑی تعداد میں دوسرے محفوظ علاقوں اور ریاستوں میں جا پھڑے۔ ایک مدت تک علمی اور تہذیبی سرگرمیاں بیخ بستہ رہیں۔ رفتہ رفتہ حواس بجا ہوئے تو چہل پہل نظر آنے لگی، وہی سیر و شکار وہی بزم آرائیاں اور پھر وہی سرگرمیاں شروع ہو گئیں مگر قدرے بدلی ہوئی شکل میں۔ نوابین اور امرار شاہجہانپور کی جاگیرات اور زمینداریاں بحقے سرکار ضبط ہو کر ان ہاتھوں میں پہنچ گئی تھیں جو غدار وطن اور دشمن آزادی تھے۔ ان ابن الوقت قسم کے لوگوں نے انگریز کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے کا کام سنبھال لیا تھا جن کو وہ شاندار دعوتوں، سیر و تفریح اور اظہار امارت کے وسیلوں سے ادا کرتے تھے علمی ادبی کام کرنے والوں نے کام شروع کر دیا تھا، تصنیف و تالیف نشستیں، مشاعرے اور مذاکرات کا دور پلٹ آیا تھا۔ ۱۹۵۷ء کے بعد مشاہیر شعراء میں حافظ نثار احمد خاں عرف بدھن خاں نائب، منشی محمد رفعت علی رفعت، سید محمد علی میاں خیال، حسین احمد میاں بیباک۔ نواب ناظم علی خاں، بجر اور منشی احسان علی خاں احسان وغیرہم تھے۔ بیسویں صدی کے ممتاز شعراء میں اعتبار الملک ضمیر حسن خاں دل، سید مختار میاں مختار۔ حضرت صدیق حسن اسعد کے علاوہ دوسرے

کچھ شعرا بھی اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ موجودہ دور میں بھی شعر و شاعری کی روایت قائم ہے۔ اس شہر کے معیار علم و فن کا جو دبہ تھا وہ تو اب واقعی نہیں رہا تاہم جو عزت و آبرو محفوظ ہے وہ بھی کم نہیں۔ اہل علم اٹھتے جاتے ہیں۔ اردو۔ فارسی جاننے والے خال خال رہ گئے ہیں، کچھ مدت بعد یہ بھی نہ رہیں گے۔ اس کتاب کی تالیف کے زمانے میں یہاں کی اہم علمی شخصیات بھی جدا ہو گئیں اور شہر علم و فن کے ذخیروں سے محروم ہو گیا۔ حکیم حبیب الرحمن خاں حبیب، حضرت جمیل احمد خاں کو کتب، سید ارشاد حسین عرف حضرت پیارے میاں رشید اور اب چند سال قبل پروفیسر عبدالسمیع خاں صاحب نکمت بھی داغ مفارقت دے گئے۔ ان مرنے والوں میں سے کسی کی کمی پوری ہونا ممکن نہیں یہ سب اعلیٰ وارفع قسم کے اہل علم تھے اور جن کے دم سے شہر بھاری بھر کم نظر آتا تھا اگرچہ یہاں کے پروردہ و تربیت یافتہ ملک اور بیرون ملک میں شاہجہانپور کی نسبت سے نام آور ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ عملی طور پر ان کا تعلق آبائی وطن سے ٹوٹ چکا ہے تاہم اہل شہر ان کو اپنا مان کر خوش ہوتے ہیں اور ان کی نام آوری کو اپنے وطن کی آبرو مانتے ہیں۔ باہر جا بسنے والوں میں ہر علم و فن کے لوگ ہیں مگر یہاں میری مراد محض شعر و ادب کی محترم جماعت سے ہے ان میں ممتاز دانشور برادر مابوسلمان شاہجہانپوری ثم کراچی۔ برادر رشید حسن خاں مقیم دہلی اور پروفیسر قمر رئیس دہلی یونیورسٹی لائق حوالہ ہیں برادر شبنم رومانی اڈیٹر اقدار اور برادر گرامی حنیف اسعدی معروف و مقبول نعت گو پاکستان ہیں شاہجہانپور کا نام روشن کیے ہوئے ہیں۔ یہاں غالب، امیر مینائی، داغ، مصحفی، جلال اور آرزو کے شاگرد ہوئے ہیں۔ مشہور پردہ نشین نابینا شاعرہ محترمہ جناب حضرت جلال سے تلمذ تھیں۔

زبان اردو کا مستقبل موجودہ دور کے حالات کے پیش نظر اگرچہ تابناک نہیں ہے لیکن نامراد آسانی سے نہ مٹائی جاسکے گی جب تک کہ اردو والے خود اس کو مٹانے پر تیار نہ ہوں۔ ہر دیہات قصبہ اور شہر میں اردو لکھنے پڑھنے والے کبھی موجود تھے مگر آج کسی اردو داں کی حاجت ہو تو تلاش کرنے پر بھی دستیاب نہیں ہوتا اس کے باوجود اردو شاعروں کی تعداد کم نہیں ہے۔ روہیلکھنڈ اور اودھ میں لکھنؤ سے مراد آباد تک کی پٹی معہ بدایوں اردو کی پرورش گاہ ہے۔ معیار شاعری کے لیے شاہجہانپور کا مقام مشہور ہے، یہاں کے شاعر فن شاعری کے آداب کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہے ہیں۔ اگرچہ شاعروں میں ترقی پسند شاعر بھی موجود ہیں اور وہ بھی ہیں جو تجریدی شاعری کے مدد خواں ہیں مگر ان کے دوش بدوش روایت پسند اور کلاسیکی روایات کا احترام کرنے والے شاعر بھی زندہ و تابندہ ہیں جن کے دم سے فن شاعری اب تک زندہ ہے۔ یوں تو شہر اور اس کے آس پاس کے قصبات میں شاعروں کی تعداد سینکڑوں سے کم نہ ہوگی

لیکن معتبر اور قادر الکلام اساتذہ برائے نام ہیں۔ حضرت دکن مرحوم کی حیات تک اردو شاعری کا شکوہ کم نہ ہوا تھا اور شاہجہاںپور گئے ہوئے مقامات کی فہرست میں ممتاز شعری و ادبی درجہ رکھتا تھا ان کے بعد حضرت عابد جانشین دکن نے روایات برقرار رکھنے کی حتی المقدور کوشش کی اور وہ بھی اپنی حیات تک کامیاب رہے۔ اشفاق علی خاں صاحب اشفاق، مولوی انوار احمد انوار، حضرت پیارے میاں رشید، حضرت جمیل احمد خاں کوکتب، جناب پروفیسر عبدالسمیع خاں نکمت وغیرہم اساتذہ بھی رہبری کا کما حقہ حق ادا کرتے رہے۔ صد افسوس کہ دنیا نے علم و ادب کے یہ اکابرین بھی اٹھ گئے مگر اپنی ایسے کچھ لوگ ضرور چھوڑ گئے ہیں جو ایک مدت تک فن شعر و ادب کی خستہ حال حویلی کی حفاظت کرتے رہیں گے۔

ناسپاس گزاری اور ناشکری ہوگی اگر ان مجبان گرامی کا ذکر خیر نہ کروں جو "سخنورانے شاہجہاںپور" کی تیاری میں میسر شریک حال رہے۔ اگر ان حضرات کی پُر خلوص توجہ اور اس فراخ دلی سے ہمت افزائی نہ ہوتی تو یہ حقیر کاوش منظر عام پر نہ آ پاتی۔ یوں تو ایسے کرم فرما اجاب اور صاحب ذوق معاونین کی فہرست طویل ہے مگر برادر م رباب رشیدی شاہجہاںپوری ثمثہ لکھنوی برادر م شبیر حسن خاں جن کو مرحوم بھتے کیلچہ منہ کو آتا ہے۔ حضرت خالد علوی، جناب رونق رضا مرحوم، جناب عزیز خاں عزیز۔ عزیز نسیم شاہجہاںپوری، عزیز محمد نسیم خاں شہاب برادر م شبنم رومانی (پاکستان) حضرت حامد شاہ جہاں پوری (اورنگ آباد) برادر م ذکی تالگانوی مدیر 'ابر' (بدایوں)۔ برادر م خان بہیم مدیر 'لمحے لمحے' (بدایوں) برادر م اسیر شاہجہاںپوری اور عزیز محترم سید احمد سحر کے اسمار گرامی کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں۔ شکر یہ ادا کرنا رہی بات ہے جس کو خلوص و محبت کا بدل نہیں کہہ سکتے، ان سب کو دعاؤں میں یاد رکھنا بھی حد درجہ ضروری سمجھتا ہوں۔ برادر محترم پروفیسر تنویر احمد علوی (دتی یونیورسٹی) خصوصی شکر یہ اور دعاؤں کے مستحق ہیں جنہوں نے اپنی مصروفیت کے باوصف مسودے کو از اول تا آخر پڑھا اور مفید مشوروں سے نوازا۔ عزیز میاں عبداللطیف رشیدی نے قدم قدم پر سہارا دیا اور بلا تکلف ہاتھ بٹایا موسموں کی ہلاکت خیزیوں کے باوجود جاڑا، گرمی اور برسات کا لحاظ کئے بغیر میسر پاس آتے اور بھاگ دوڑ کرتے رہے۔ یہ بھی اپنے نیک عمل کے لیے میری دعاؤں کے حقدار ہیں ان کو اپنے اس زمانہ نوخیزی میں زندگی و تابندگی کی پُر خلوص دعائیں درکار ہیں جو میرے ہونٹوں پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اجر عظیم عطا فرمائے (آمین)

مسودہ کئی سال سے طاق نسیاں کی زینت تھا اور میں اس کو تقریباً بھلا چکا تھا مگر عزیز قمر رئیس اس کی تکمیل لئے بار بار تقاضے کرتے رہے۔ میں ہوں ہاں کر کے ٹاٹا رہا اور انتشار ذہنی کے سبب یکسوئی سے کام کرنے پر آمادہ نہ ہوا مگر ان کے آخری حربے نے مجھ کو بے دست و پا کر دیا۔ تیر ٹھیک نشانے پر آ بیٹھا۔ فروری ۱۹۴۷ء میں جب وہ وطن آئے تو چلتے وقت مجھ سے بولے۔ "اب میں شاہجہانپور اسی وقت آؤں گا جب آپ مسودہ مکمل کر کے مجھے بھیج دیں گے۔ برہمی طنز، حکم اور گزارش کی ملی جلی کیفیت تھی۔ میں خود بھی بار بار کے تقاضوں سے عاجز تھا۔ اپنی علالت، صنعت بدنی و دماغی کے باوجود مسودہ لے کر بیٹھا اور واقعی مکمل کر کے ان کے حوالے کر دیا۔ اگر قمر رئیس یہ روش اختیار نہ کرتے تو جس طرح اب تک ہوتا رہا وہی ہوتا اور کچھ عرصہ بعد یہ برسہا برس کی محنت اکارت جاتی۔ قمر رئیس کا یہ بڑا کارنامہ ہے، جزاک اللہ فی الدارین خیرا۔"

اب یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ میں نے کوئی اہم کام نہیں کیا۔ محض بکھرے ہوئے کچھ میرے موتی کنکر پتھر یکجا کر دیئے۔ اس کام کو قارئین ادب کی کسی کسوٹی پر نہ پرکھیں نہ میزان فن تذکرہ نگاری پر تولیں۔ یہ فرض کر کے نظر ڈالیں کہ اس میں استقام زیادہ ہیں۔ تسامحات بہت ہیں۔

شاہجہانپور کے شعرا کا تذکرہ صرف ایک موضوع سخن نہیں ہے۔ موضوعات بکھرے پڑے ہیں۔ میں شہر کے تعلیم یافتہ اور صاحب ذوق نوجوانوں کو دعوت دیتا ہوں کہ اس ادھورے تذکرے کو پورا کرنے کے ماسواً شہر کا سیاسی، سماجی، تہذیبی، معاشی اور علمی جائزہ لیں اور اپنی اپنی پسند کا موضوع انتخاب کر کے کام کا آغاز کریں۔ کئی پہلوؤں سے اس شہر کی اہمیت ہے اور یہاں کا ذرہ ذرہ اپنی آب و تاب ظاہر کرنے کے لیے بے تاب ہے۔ آج وہ گنگا جمنی تہذیب اور اس کی سیکولر اقدار جانکنی کے عالم میں ہیں جن کی آبیاری اس شہر نے کی تھی۔ ہمارے ایشیاٹک بزرگوں نے کی تھی۔ نئی سماجی تہذیب کی حرص و حوس کا سیلاب اُسے بہائے لئے جا رہا ہے کم از کم ہم اسے محفوظ رکھیں کہ آنے والی پٹریاں اس آئینہ میں اپنے اجداد کی تخلیقی، روحانی اور اخلاقی فتوحات کا نظارہ کر سکیں۔

مبارک شمیم
۵ مارچ ۱۹۹۵ء

مولوی سید عبدالنبی کانٹوی

شاہجہاں پور کی آبادی سے پہلے قصبہ کانٹ ہی اس نواح میں شرفا کا مسکن تھا۔ اس زمانہ میں کانٹ مثل ایک ضلع کے سرکار بدایوں سے متعلق تھا۔ نائب ناظم رہتے تھے۔ آبادی بھی اچھی خاصی دور دور تک پھیلی ہوئی تھی جس کے آثار آج تک ملتے ہیں۔ مسلمانوں میں شیخ زادوں اور سیدوں کے بہت گھر تھے۔ کالیستوں کے پُرانے خاندان بھی موجود تھے مگر جب شاہجہاں پور آباد ہوا تو اکثر شرفا قصبہ، شیوخ و سادات اور کالیستوں میں سے بھی کانٹ چھوڑ کر شاہجہاں پور کوچے آئے اور آباد ہو گئے۔ یہ زمانہ مسلمانوں کے علم و فضل کا تھا تحریروں میں فارسی زبان کا عام رواج تھا اردو تو اس وقت بالکل بے زبان بچہ تھی کوئی زبان بھاشا کو بھی تحریر میں نہ لاتا تھا۔ کسی کو کہیں خط بھیجنے کی ضرورت ہوتی تھی تو کسی مولوی یا کالیستہ کے پاس چلے گئے اور فارسی زبان میں خط لکھوا کر روانہ کر دیا۔ کالیستہ اہل علم کے قدم بقدم چلنے والے تھے مسلمانوں کے فیض صحبت اور کمال شوق سے تحصیل علم کی طرف جھکے ہوئے تھے کیوں کہ شاہی درباروں اور امر کی سرکاروں میں بغیر علم و فضل کے اور کوئی معقول طریقہ قدر و عزت حاصل کرنے کا نہیں تھا۔ اس علم کی بدولت ان کو اچھے اچھے عہدے ملتے تھے۔ دیوان۔ منشی۔ محاسب اور قانون گو وغیرہ یہی کالیستہ ہوتے تھے انہیں میں جو موزوں طبع نکلتے تھے وہ شاعری کی بدولت مشاعروں میں نام پلتے اور جا بجا مشہور ہوتے تھے۔

پٹھانوں کے حالات پیش نظر رکھ کر کہ آبادی شہر کے ابتدائی دور میں یہ بات کہاں ممکن تھی کہ عالم و فاضل شاعر و ادیب پیدا ہوتے کم از کم پچاس برس یا ایک صدی تک انتظار کرنے کا موقع تھا البتہ اس زمانے میں بوجہ سکونت شیخ و سید قصبہ کانت ہی ایسا تھا کہ جہاں کوئی عالم کوئی شاعر موجود ہوتا چوں کہ ہم کو سب سے پہلا زمانہ طبقہ شعرا شاہجہاں پور کے لیے مولوی سید عبدالنبی کانٹوی کا ملتا ہے اس لیے ہم انہیں کا نام نامی اول نمبر پر لکھتے ہیں۔

سید عبدالنبی قصبہ کانت کے رہنے والے تھے بڑے ذی علم و زاہد و عابد اور متوکل مگر یہ نہیں معلوم کہ ان کے مورث کہاں سے آئے تھے۔ شاعر و ادیب بھی تھے تخلص کا بھی پتہ نہ چلا۔ سید صاحب آزاد مشرب اور نہایت مستعد و مستقل ارادہ شخص تھے نعت خوانی اور کتاب خوانی میں اس وقت ان کا کوئی ہمسر نہیں تھا۔ ان کی تحریر بہت بلیغ ہوتی تھی۔ لارہ سب سکھ رائے مسرور ان ہی کے شاگرد تھے اور شاگردی سے یہ قیاس بھی کیا جاسکتا ہے کہ مسرور کا خاندان قصبہ کانت ہی کا رہنے والا تھا جو بعد کو شاہجہاں پور آکر آباد ہوا۔

سید عبدالنبی کو علاوہ مطالعہ کتب کے پُرانی کتابیں لکھنے کا بھی بہت شوق تھا۔ درس طلباء سے فرصت کر کے ان کا تمام وقت گویا اسی میں صرف ہوتا تھا۔ جب انتقال ہوا ہے تو اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک ہزار جلدیں ان کے کتب خانہ میں موجود تھیں۔ اللہ اللہ کیا شوق تھا اور کتنی فرصت۔ اس سے ان کی عمر کا اندازہ بھی کر لینا چاہئے بیس برس نکال کر اگر ایک سال میں بیس کتابیں لکھی ہوں گی تو آپ ستر برس کے ہو کر مرے ہوں گے۔ ۱۱۵ھ میں رحلت کی۔ چنانچہ فقرہ 'اوستا درفتہ' سے مسرور نے آپ کی تاریخ نکالی ہے حساب بالا سے ان کی ولادت کا زمانہ عالم گیر کا عہد حکومت معلوم ہوتا ہے سید صاحب فقر و تصوف کی چاشنی سے بھی شیریں کام تھے ایک مرتبہ شاہ ابوالبرکات عشق قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت بابرکت میں مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی رباعی پر ایک رباعی تصنیف کر کے بھیجی تھی جس کی ان کو بہت داد ملی چوں کہ تذکرہ میں صرف وہی رباعی ملی ہے اس لیے بطور نمونہ کلام کے خریبہ کی جاتی ہے اور ایک شعر بھی لکھا جاتا ہے۔

رباعی

اے آنکہ بصد صفات و ہم حسنات ست
عشقی ست خطاب عاشق آنات است
ذاتش نہ چناں مصدر برکات شود
نامش برکات صاحب برکات است

رشتہ جاں ز رشتہ دگر است تار زلفت سرشتہ دگر است
ان کے حالات زندگی اس سے زیادہ مفصل معلوم نہ ہو سکے۔

عمدۃ الملک نواب بہادر خاں چغتہ۔ بہادر بانی شہر شاہجہاں پور

نواب بہادر خاں کا اصل نام سر ابدال خاں تھا۔ عمدۃ الملک۔ بہادر خاں اور چغتہ معزز خطابات تھے جن سے شہنشاہ ہندوستان شاہجہاں صاحب قرآن نے ان کو سرفراز فرمایا تھا۔ والد ماجد کا نام دریا خاں تھا جو گھوڑوں کی تجارت کے سلسلے میں اپنے وطن موضع بربر مضافات پیشاور سے بھد جہانگیر وارد ہندوستان ہوئے۔ دریا خاں بہ تعلق ہم قومی و قرابت سابقہ، رکن الدین خاں المخاطب بہ نواب شیر خاں افغان بازیدخیل داؤد زئی سے بغرض ملاقات موضع بسبی ضلع بلند شہر تشریف لے گئے نواب شیر خاں نے بہت خاطر تواضع کی۔ عرصہ تک مہمان رکھا بعدہ اپنی دختر مسماۃ بی بی سیری کا ان کے ساتھ عقد کر دیا۔ بعد وفات رکن الدین نواب دریا خاں شاہی فوج میں منصب دار ہو گئے اور جہانگیر کے عہد میں چار ہزاری منصب پر فائز ہوئے مگر نظام الملک خاں جہاں لودی کی بغاوت کے وقت بادشاہ کے خلاف خانجہاں کے معین و مددگار تھے جنگ میں مارے گئے۔ نواب بہادر خاں شاہجہاں کے ایام شہزادگی سے ان کے مصاحبین میں تھے۔ اپنے باپ نواب دریا خاں کے باغی ہو جانے کے بعد بھی اپنے ولی نعمت شاہجہاں کے ساتھ رہے اور درجہ بدرجہ ترقی پاتے رہے یہاں تک کہ اپنی وفات کے وقت پنج ہزار ذات و پنج ہزار سوار دو اسپہ و سہ اسپہ پر فائز تھے۔ ان کی جاگیر قنوج سے کالپی تک پھیلی ہوئی تھی۔ بند لیکھنڈ اور ملتان کے گورنر رہ چکے تھے۔ آپ شجاعت میں فرد۔ عالی حوصلہ۔ منظم۔ خوش اخلاق اور نہایت دیندار و خدا پرست امیر تھے حضرت شیخ آدم بتوری رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے اور فقر و صلحا کی بہت تعظیم و تکریم فرماتے تھے۔ روایت ہے کہ کسی درویش نے آپ کو دعادی تھی کہ آپ کا فیضان ہمیشہ سوا ہاتھوں سے معمور رہے گا۔ اس دعا کی برکت سے ان کے میخانے میں کبھی سوا ہاتھوں سے کم نہیں رہے تعمیر عمارات و آبادی مقامات کا بھی نواب کو بدرجہ کمال شوق تھا۔ علاوہ قصبہ بہادر گڑھ و شہر شاہجہاں پور مختلف شہروں میں آپ نے عالی شان مکانات و محلے بصر کثیر تعمیر و

آباد کیے تھے۔ الہ آباد و لاہور میں حویلیاں پُرانی دہلی میں محلہ بہادر پورہ معہ حویلی و مسجد۔ شہر آگرہ میں دریائے جمنا کے جانب مشرق ایک وسیع محلہ جو بعد میں آپ کے فرزند کشید نواب عزیز خاں بہادر چھٹا ہفت ہزاری کے نام سے کٹرہ عزیز خاں کے نام سے مشہور ہوا۔ قنوج و کالپی میں متعدد محل۔ سرائے، باغات اور بڑے بڑے چاہ پختہ بنوائے۔ شیخ کبیر بالا پیر کا قنوج میں پختہ مزار تعمیر کرایا جس پر فارسی کا کتبہ موجود ہے ”اس گنبد عالی در زمان دولت نواب معالی القاب بہادر خاں ابن دریا خاں افغان غوریہ خیل داؤدزی عمارت پذیرفت“ مکن پور میں حضرت شاہ بدیع الدین صاحب معروف شاہ مدار نور اللہ مرقدہ کے احاطہ درگاہ کے اندر زائرین کے قیام و آسائش کے لیے آپ نے پتھر کا ایک عالیشان دالان تعمیر کرایا تھا جو آج بھی موجود ہے اس پر فارسی کا یہ قطعہ کندہ ہے۔

قطعہ

مدار عالم و علم و عمل بدیع الدین	بر آستانہ مہر سپہر عین یقین
کہ شد ز لطف عییش جہاں پر آئیں	بعہد شاہجہاں بادشاہ دیں پرور
کشید سر بفلک اس عمارت سنگیں	با اعتقاد دل نیت بہادر خاں
کہ گفت حضرت عیسیٰ بچرخ جبل متیں	بحشم اہل یقین اس مقام محمود است

نواب بہادر خاں کی علمی قابلیت بھی اچھی تھی اور ان کی طبیعت میں شعر گوئی کا بھی مذاق تھا۔ ممدوح کی ایک فارسی غزل جس سے ان کے دلی جذبات کا اظہار ہوتا ہے ناظرین کی دلچسپی کے لیے درج کی جاتی ہے

نواب بہادر خاں کی یہ غزل تاریخ صبیح میں جس طرح درج ہے ”یادگار سلف“ تاریخ بارہ سبستی افغانان مؤلفہ محمد عبید اللہ خاں خلت حافظ محمد عبدالرحیم خاں افغان ساکن موضع بہادر گڑھ ضلع میرٹھ میں بعض اشعار میں تھوڑے اختلاف کے ساتھ لکھی ہوئی ہے میں تاریخ صبیح سے غزل نقل کرتا ہوں۔

نقل غزل از تاریخ صبیح

مشکل است اس کار لیکن پیش مرد آسان بود	ترک سر کردن بمیدان شیوہ مرداں بود
ہر کہ از سرنگندہ دکنے مرداں میدان بود	مرد میدان شجاعت را نباشد بیم کرد
میکنم جنگ و جدل گر رستم دستاں بود	برنگردانم ز دشمن روئے در میدان جنگ
ہر کہ از کفار روز حرب روگرداں بود	روئے خود از قبلہ گرداند بوقت ہر نماز

قوت بازو شود از زخم تیر اندر مصاف
 پر بر آید بر تنم از تیر کاں پراں بود
 اے بہادر در جہاں ہر بلغ دارد میوہ
 میوہ باغ بہادر خنجر و پیرکاں بود
 بیجا پور کی قید سے رہا ہو کر نواب بہادر خاں جب شاہجہاں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خسروانہ
 العمامت عطا ہوئے تو آپ نے برجستہ شعر موزوں کر کے عرض کیا۔
 حیات یافت دوبارہ زلفت شاہجہاں
 چو شد بملک دکن جانفشان بہادر خاں

قدرت نے وہ سب خوبیاں مدوح کو عطا فرمائی تھیں جن کا کسی ایک ذات میں مجتمع ہونا نوادرات
 سے ہے نواب بہادر خاں ۱۰۱۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۹ ماہ رجب ۱۰۵۹ھ کو قندھار میں بعارضہ
 ضیق النفس انتقال ہوا۔ حسب وصیت نعش شاہجہاں پور لاکر دفنائی گئی۔ ان کے فرزند نواب
 عزیز خاں بہادر نے قبر پر عالیشان مقبرہ تعمیر کروایا جو آج بھی بہادر گنج میں اسی شان سے موجود
 ہے مگر صد افسوس کہ قبضہ گیروں نے قبر کا نشان بھی مٹا دیا۔ ۱۸۵۶ء کے غدر کے بعد یہ مقبرہ انگریز
 حکام نے نیلام کر دیا تھا جس کو بہت بعد میں مسلمانوں نے واگزار کر لیا۔ مقبرے کی عمارت پر
 لوگوں نے قبضہ کر رکھا ہے اور مقبرے کے اندر بانی شہر کے علاوہ ان کے خاندان کے دیگر
 افراد کی چھ قبریں تھیں ان کو بھی برابر کر دیا گیا۔ بعض حصوں کو بطور نشست گاہ استعمال کیا جا رہا
 ہے۔ نواب بہادر خاں کے سلسلہ نسل سے لوگ شاہجہاں پور میں موجود ہیں۔

نواب زین الدین خاں بہادر زین

آپ نواب غیرت خاں کے لائق فرزند اور عمدۃ الملک نواب بہادر خاں چغتیا
 بانی شاہجہانپور کے پوتے تھے۔ بڑے شجاع و دلیر تھے مگر نہایت مغلوب الغضب۔ نواب
 عبدالعزیز خاں بہادر چغتیا جو ان کے چچا اور نہایت معزز و خیر طلب منصب دار شاہی تھے ان
 کو بوجہ نزاع خانگی اپنے بھتیجے سے سخت مخالفت تھی۔ فرخ سیر کو حکومت حاصل کرنے میں جو
 خداداد مدد ملی ہے اس کا ایک بڑا حصہ نواب زین الدین خاں ہی کی بہادری اور دلیری کا نتیجہ
 تھا۔ نواب صاحب کی بابت مورخ لکھتے ہیں کہ باوجود ذی علم اور قابل ہونے کے افغانیت

کا جوش اکثر غالب ہو جاتا تھا۔ چنانچہ جب وطن سے وہ فرخ سیر کی امداد کو بنگالہ کی طرف معہ فوج روانہ ہوئے ہیں تو ایک طبع زاد شعر کا سجع بنا کر میں کندہ کر لیا تھا۔

چو بر فرخ سیر سلطانی آمد

بزین الدین بہادر خانی آمد

بعض مورخ بجائے مصرعہ مذکورہ کے اس مصرع کو لکھتے ہیں یعنی (چو فرخ شاہ تیمر ثانی آمد) زین امیر الاعظم اور رئیس معظم قلعہ شاہجہاں پور کے تھے اور چاہتے یہ تھے کہ نواب عبدالعزیز خاں بہادر کو باوجود ہفت ہزاری ہونے کے کچھ فروغ نہ ہو۔ منشی سردار نے نواب زین الدین خاں کے سلسلہ میں ایک رباعی لکھی ہے۔

روشن طبع زخاندان افغاناں

یا موج محیط خانہ دریا خاں

یا گو ہر دریائے بہادر خانی

یا زینت رزم و بزم زین الدین خاں

باوجود تیزی طبع اور گرمی مزاج کے شاعر بھی اچھے تھے مگر فارسی گو۔ طبیعت میں الفاظ ہندی کا بھی مذاق تھا اسی کا یہ اثر ہے کہ ہندی کے الفاظ کو زبان فارسی سے ادا کرتے اور بندش سے ہندی نثر اد کو ایرانی بناتے تھے کیبیشتر ان کی صحبت کا کچھ اثر تھا۔ جی چاہتا تو کبھی کبھی کبت بھی موزوں کر لیتے تھے نواب زین الدین خاں فارسی کے سوا عربی بھی جانتے تھے۔

مخار بہ فرخ سیر اور جہاندار شاہ میں ان کی شجاعت و مردانگی کا آوازہ دور دور تک پہنچنے والا تھا اس لیے ۱۱۲۴ھ میں جنگ کے دوران آپ نے کارہائے نمایاں انجام دیئے اور فرخ سیر کو حسب وعدہ مظفر و منصور بنا کر عین میدان جنگ میں درجہ شہادت پر فائز ہوئے اور اپنے ہمراہ اپنے فرزند نظام الدین خاں کو بھی لیتے گئے اس وقت کے ایک مورخ نے 'قدوہ خیل شہیداں' سے تاریخ شہادت نکالی ہے زین کے چند اشعار تحریر کیے جاتے ہیں۔

ان ترک سرخپوش سوار سمند شد

سیر چوری بدست آن نگارنا زین دیدم

چشم من چشم شد از بھرتوائے جان جہاں

بھجو سیاب گشتہ تانہ شوم

یاراں مذر کنید کہ آتش بلند شد

بشاخ ضد لے پیچیدہ مار عنبریں دیدم

تلج و راوی و چناب شد از دیدہ

نکنم ترک بے قراری ہا

چوری کا لفظ ہندی ہے نواب صاحب نے اسے مذاق طبعی کے موافق فارسی کے ساتھ

باندھ ہی دیا نمونہ کبیت زبان فارسی۔

چشم شام مستند فدائے یا بادام دل آمد اینہا
 با اینہا چوں ترک سپاہی غمزہ پناہی پرکین ہا
 سرخ و سپیدہ سیاہ عجائب روم و فرنگ جوش کزین ہا
 زین الدین را حق نگہبان بند شہدہ در این بیدینہا
 علوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب کا تخلص کوئی علیحدہ نہیں تھا۔ بجائے تخلص نام کو ہی استعمال
 میں لاتے تھے۔

نواب زین الدین خاں کے پانچ بیٹے تھے۔ نظام الدین خاں۔ تاج الدین خاں۔ لطف اللہ خاں
 عبداللہ خاں اور ظہیر الدین خاں۔ نظام الدین خاں اپنے والد نواب زین الدین خاں کے ساتھ
 نواح اکبر آباد میں جہاندار شاہ اور فرخ سیر کے درمیان جنگ میں کام آئے تھے۔ تاج الدین خاں
 بھائیوں میں سب سے بڑے تھے وہی شاہجہاں پور کے نواب ہوئے۔ لطف اللہ خاں کو جو
 کم عمر تھے فرخ سیر نے اپنے محافظ دستے کا رسالدار مقرر کیا تھا۔ فرخ سیر کو ۱۱۳۱ھ میں جب
 سادات بارہ نے قید کر لیا تو لطف اللہ خاں اپنے دستے کو جس میں زیادہ تر شاہجہاں پور
 کے پٹھان تھے لیکر قلعہ میں گھس گئے اور جنگ کرتے ہوئے معہ اپنے سپاہیوں کے فرخ
 سیر پر قربان ہو گئے۔ محافظ دستے کے صرف چند سپاہی زندہ بچے تھے۔

روایت ہے کہ نواب زین الدین خاں اور ان کے بیٹے لطف اللہ خاں بمقام کوٹلہ فیروز شاہ
 قدم رسول میں مدفون ہوئے مگر ان کے خاندان والے ان کو نواب بہادر خاں کے مقبرے میں
 مدفون بتلاتے ہیں۔ نواب محبت خاں نے قطعہ ذیل سے مادہ تاریخ نکالا ہے۔

چوں آں نواب زین الدین خاں والا	شجاعت بود از رویشس ہویدا
چو شد ہمراہ فرخ شاہ در جنگ	نصیب شاہ شد فتح و ظفر ہا
در آں میداں شہادت یافت نواب	کہ شامل بود فضل حق تعالیٰ
چو تاریخ شہادت گفت احمد	شہادت یافت شد نواب والا

نواب زین الدین خاں نے نام سے موضع زین الدین نگر۔ زین الدین باغ اور زین الدین پور
 یادگار ہیں موضع زین الدین نگر اب تک آباد ہے مگر زین الدین باغ اور زین الدین پور کہاں
 ہے کچھ علم نہیں۔

لالہ سب سکر رائے مسرور

لالہ سب سکر رائے مسرور کہتر واکا لیتھ سکسینہ محلہ مسجد گنج کے رہنے والے تھے ان کی ولادت ۱۱۱۲ھ میں ہوئی۔ ان کا خاندان پہلے سے علم و فضل میں مشہور چلا آتا تھا۔ امراء کی سرکاروں میں ان کے آبا و اجداد منشی دیوان اور محاسب وغیرہ ہوتے چلے آئے تھے انہوں نے اپنے بزرگوں کے زیر سایہ رہ کر اچھی تعلیم پائی اور فارسی میں عمدہ بیاقت حاصل کی۔ اچھا دماغ لے کر آئے تھے اور شاعری کی خداداد قوت موجود تھی۔ مسرور نے اپنی مشق اور کوشش سے شاعری میں کمال پایا تھا۔ وہ زمانہ عام طور سے فارسی گوئی کا تھا اردو کے کہنے والے نہایت کم تھے اور فارسی کے بکثرت۔ مسرور نے بھی فارسی زبان میں کہنا شروع کیا اور اس کی ضرورت سے نظم و نثر و معادانی و تاریخ گوئی وغیرہ میں قابلیت حاصل کرنا پڑی۔ مشہور ہے کہ مسرور جملہ فنون میں کامل تھے اور شاہجہاں پور میں اس وقت ان کا کوئی نظیر نہ تھا۔ بہ نسبت فارسی کے ہندی کی طرف مسرور کی توجہ زیادہ تھی اس لیے کبھی زبان ہندی کی مروجہ بحر میں فارسی کے اشعار تصنیف کرتے اور کبھی اوزان فارسی میں ہندی زبان کو چمکاتے باوجود کم فرصت ہونے کے اوزان ہندی کے ساٹھ نسخے معتبر اور مفید انہوں نے لکھے تھے۔ علم معما میں کتاب ترجمۃ النوادر بعبارت رنگین اور دیوان فارسی و انشاء افسانہ خوش سواد ان کی تصنیفات ہیں لیکن کسی کا پتہ نہیں چلتا علم باطن کی طرف آپ کی توجہ زیادہ تھی سوائے ضرورت وقتی اور کسی وقت علم ظاہری کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے مسرور نے تمام علم کسی کی ملازمت نہیں۔ شاعری کا رواج اس شہر میں ان کی ذات سے بتایا جاتا ہے پٹھانوں میں جو لوگ ذی علم تھے ان کو سوائے فقہ و حدیث کے فن شعر سے کوئی مناسبت نہیں تھی۔ مسرور کے پوتے منشی بہت پرشاد مسرور نے اپنے تذکرے میں یہ نہیں تحریر کیا کہ ان کے دادا کس کے شاگرد تھے لیکن قیاس یہ کہتا ہے کہ مولوی سید عبدالبنی کانٹوی جو شاعر بھی تھے انھیں سے مسرور نے پڑھا اور مشورہ سخن لیا۔ ۱۱۴۲ھ میں مسرور نے رحلت فرمائی۔ مسرور نے قطعات تاریخ وفات لکھے ہیں۔

سرور کہ رفت زینجہاں گزراں
براہل سخن ہزار غم بردل و جبال

افسوس سخنوراں غم اہل زبان
زیں دار فنا گنہارہ بگرفت
کال ہنرے زعالمے رفت

گفتیم دو تاریخ و فاتش انیک
اوستاد زماں بود کہ مسرور
تاریخ کنش کہ گفت ہاتف

قدیم الایام میں ایک مشہور گروہ کبیشروں کا چلا آتا تھا جو راجگان ہند کے درباری ملکی اور فوجی شاعر اور رجز خواں تھے اس وقت ان کی زبان وہی بھاشا یا پراکرت تھی۔ بعدہ جب ہندوستان پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا اور زبان فارسی کا سکھ چلنے لگا تو ایرانی شعرا بھی رفتہ رفتہ آمو جو ہوئے اور خود ہندوستان میں پیدا ہو گئے اگرچہ سلاطین و امرا کے دربار شعرا سے بھگے رہتے تھے مگر کبیشروں نے بھی اپنے قدر دانوں کا ساتھ نہیں چھوڑا وہ امرائے ہند کی سرکاروں کے یہاں بھی حاضر ہوتے اور اپنی قابلیت سے انعام و اکرام حاصل کرتے۔ کبیشروں کی شاعری کے حالات عجیب و غریب ہوتے تھے یعنی وہ ایک ایسے واقعہ کو جس کو نہ آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سنا اس طرح نظم کیا کرتے تھے گویا وہیں کھڑے ہیں اور بیان کر رہے ہیں اس کی بابت یہ کہا جاتا ہے کہ کبیشروں کی زبان میں سُرستی کا اثر ہوتا تھا کہ جس کی قوت سے وہ نادیدہ واقعہ کے مثل چشم دید کے ہو بہو نظم کر دیتے تھے۔ مورخوں نے کبیشروں کے حالات شاعری خصوصاً شہنشاہ اکبر کے زمانے کے تاریخوں میں تحریر کیے ہیں شاہجہاں پور میں بھی ایک گھرانہ کبیشروں کا تھا اور مسرور کے زمانے میں کبیشروں کی شاعری کا ایسا اثر تھا کہ مسرور خود ان کے اوزان میں قصائد وغیرہ موزوں کیا کرتے تھے۔ اگرچہ زبان فارسی تھی مگر خیالات کبیشروں کی طرح ادا کرتے تھے۔ ذیل میں اس کا نمونہ تحریر کیا جاتا ہے۔

لشکر سالاری۔ رستم داری۔ عدو شکاری دید نشان
در گنج افشانی۔ باشد بانی۔ حاتم ثانی۔ قائم خاں
بسر عدو زند شمشیرے بر شغال غالب چوں شیرے
آہو چشمے۔ صاحب جسمے۔ اندک خشمے بسا حصال
در گنج افشانی باشد بانی حاتم ثانی قائم خاں

زیب ادائی۔ حکم روانی۔ قلعه کشانی را شایان
فرزوانی فلک جنابی۔ قمر کابی ازوعیاں
سرمراں نواب بہادر۔ درج فیض راگراں بہادر
شیر شیرانگن یل پلین۔ عدو گدگ فرس رولرزاں
ستار حرم رانجش درم واکر درم واکر دکان

بحر وزن دیگر

لشکر دشمنان نہ آورد تاب در خواب ہم گزند کی تازی
دود از ہر طرف نظر بر کاب مفتاح ہر باب نواب غازی

از ہمہ کار او خاص پیک را و کرد یک شیرستان طرازی
دوشش بہروز بہ عسراود اتما در درازی

کبیت دیگر

پورغضنفر جنگ بہادر دادرواج بہ فیض رسائی رُسے خوش تدبیرے پیرے بخت جوانی
شام و صبح دعا بشارد دار دعا ملے ورد زبانی سخت برزم بہ بزم ملائم قائم باشد قائم خسانی
کبیشروں کی ذہنی قابلیت اور طبعی لیاقت کا نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

جس طرح اردو فارسی میں مصرع طرح ہوتا ہے اسی طرح کبیت کا وہ آخری مصرع ہوتا ہے جس پر کبیت موزوں کیا جاتا ہے اسے 'چہچہہ' کہتے ہیں۔ خان اعظم اکبر کو ان باتوں کا بہت شوق تھا۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ شہنشاہ اکبر کسی رانی کے محل میں شب باش ہوئے اور محبت میں اس کو آغوش میں لینا چاہا وہ فرط حیا سے اٹھ کر چلی۔ بادشاہ نے بڑھ کر ہاتھ پکڑ لیا کہ اسی کشاکش میں لہنگے کا گرہ بند ٹوٹ گیا قریب تھا کہ رانی برہنہ ہو جاتی اس لیے چالاکی اور چھرتی سے شمع روشن پر ہاتھ رکھ دیا کہ تاریکی ہو گئی مگر بوجہ سوزش کے اُف کر کے رہ گئی۔ بادشاہ نے کہا 'کہہ کارن سندر ہاتھ جری' اور یہ کہتے ہوئے اسی وقت محل سے دیوان خاص میں رونق افروز ہوئے اور 'کب گنگ' کبیشتر کو بلوا کر ارشاد کیا کہ فوراً اس چہچہہ پر کبیت تیار کر کے سناؤ۔ 'کب گنگ' نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا خداوند نعمت ابھی تعمیل ہوتی ہے۔ کبیشتر نے سستی کی مدد سے تھوڑی دیر غور کر کے یہ کبیت موزوں کیا اور شہنشاہ کو سنا دیا نئی آبلہ اس بھید نہ جاننے کی جیہ آنیہ ڈری۔ رس بات کہی جب چونک چلی۔ تب دہائے کے کنتہ نے ہاتھ دھری ان دونوں کے جبکہ پھورن میں گٹھ تاپ تس پر ٹوٹ پڑی کہ دیکھ کامن جھانپ لیو۔ یہو کارن سندر ہاتھ جری۔
بادشاہ یہ کبیت فی البدیہہ اور حسب واقعہ سن کر خوش بھی ہوئے اور متعجب بھی کہ خلوت میں موجود نہیں تھا اس کو پورا اور سچا واقعہ کیوں کر معلوم ہو گیا۔

اب حضرت سرور کا فارسی کلام دیکھئے۔

پارہ از بیقراری ہائے من سیما ببرد	تا خیال آتشیں روئے مرا از تاب برد
ورنہ قدرت چہ ادا داشت کہ شمشاد داشت	دل بجز ز خرام تو دگر یاد نہ داشت
شکر بر کی مگر قصد عبور گنگ داشت	خط سبزو کہ در موج عرق خوش نگ داشت
ماہی زور آور آور دام را از پیش برد	یار آں ساعد دل صد چاک از خویش بند
رگ گل حاجتے از نشتر فساد داشت	تا تو امے بر زدہ داماں بگستاں رفتی
ز خیرہ است بچشم من از نگاہے چند	بیا کہ بے رخ خوبت گزشت ماہے چند

علاوت سخن ترشٹی جینے ہیں برائے دفع تپ دل سکنجینے ہیں
کس ندیدم کہ دریں بزم نہ از سرافتاد زلف ساقی کہ تعلیم سیہ مستال بود

محمد مرزاں وہبی

شاہجہاں پور کے معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ عالم فاضل ہونے کے ساتھ ہی بلند پایہ شاعر و ادیب بھی تھے۔ دہلی و لکھنؤ کے علماء و فضلا اور شعراء و وہبی کو ایک باکمال شاعر تسلیم کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ آپ کے دیوان میں اسی ہزار اشعار تھے۔ وہ دیوان اب ناپید ہے دیوان کے علاوہ مثنوی لیلیٰ مجنوں۔ سیر آدم۔ رسالہ قواعد فارسی۔ انشائے وہبی تصنیفات سے تھیں جو طبع نہ ہو سکیں اور برباد ہو گئیں۔ آپ کے شاگردوں میں دیوان دولت رائے مہتج۔ دیارام۔ مولوی محمد عابد مجروح۔ سمند خاں قادری۔ یگانہ وغیرہ کے نام درج ہیں۔ وہبی نے ۱۲۰۶ھ میں انتقال کیا۔ آپ کے شاگرد مہتج نے 'عمر خاں بگرد' سے مادہ تاریخ نکالا ہے نمونہ کلام فارسی تاریخ صبیح سے درج کیا جو مولف تاریخ نے تذکرہ سرور سے نقل کیا تھا۔

ہمراہ نگہت گل بوئے خنامی آید	اے صبا طبع پریشانی تو بے چیزے نیست
وہمہ زخم دل ببلبل بیدل باشد	اے گل ایس جوش نمکدال تو بے چیزے نیست
بوئے داغ جگر از دود دلست می آید	وہبی ایس سینہ سوزاں تو بے چیزے نیست
اے فروغ عارضت بر جوش آتش خانہ ہا	جلوہ حسنت چراغ مشہد پروانہ ہا
دریں دریا کد امی ہر تاباں غوطہ زد یارب	کہ شد چاک گریباں سحر آغوش ساحل ہا
زمرگ خویش نہ ترسد سیکہ داغ نوشد	ہر اس گر یہ کجا طائر کباب کجا
دلغ بردل نالہ بر لب خوں بچشم خود پدید	ہم کلم ہم عند لیہم ہم گلستانم ہمنوز

مولوی سید غلام جیلانی رفعت

آپ کے والد ماجد سید احمد گیلانی نے شاہجہاں پور میں توطن اختیار کیا تھا۔ سید غلام جیلانی رفعت اسی شہر میں پیدا ہوئے اور تعلیم پائی۔ اس وقت ملا محمد حسن فرنگی محلی شاہجہاں پور میں قیام فرما تھے ان سے معقول میں اکتساب علم کیا اور مزید اکتساب علم کے لیے دہلی جا کر مولانا شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے علم دین سیکھا۔ دہلی کے دوران قیام ایرانیوں سے صحبت رہی جس نے فارسی میں زباں داں بنا دیا اور شعرا سے دہلی کے فیض صحبت سے شاعری کی طرف مائل ہو گئے۔ آپ کا شمار علماء و فضلاء میں ہوتا تھا اور دور دور تک مشہور تھے۔ حافظ الملک رحمت خاں نے اپنے پاس بلایا تھا ان کے واقعہ شہادت تک ان کے ساتھ رہے بعدہ والی رام پور نواب فیض اللہ خاں کی دعوت پر رام پور چلے گئے جہاں آپ کا وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔ حضرت رفعت کا حافظ غضب کا تھا جو کچھ پڑھتے یا سنتے ذہن میں محفوظ ہو جاتا تھا۔ مولانا روم کے مطلع پر مطلع موزوں کیا ہے جو قابل داد ہے۔

مطلع مولانا روم

بے خطائی ہست تیر از شست او شست او شاگرد چشم مست او

مطلع مولانا رفعت

کئے تو اوں جست از صفائے شست او قبضہ میگیرد قضا از دست او

جنگ دو جوڑہ کو منظوم کر کے اس کا نام در منظوم رکھا۔ اس جنگ میں خود بھی موجود تھے۔ اس کا ایک شعر ہے۔

برگرسی نشیناں چناں تیغ راند کہ نقش شجاعت بر کرسی نشاند

یہ جنگ دو جوڑہ کو منظوم کر کے اس کا نام در منظوم رکھا۔ اس جنگ میں خود بھی موجود تھے۔ اس کا ایک شعر ہے۔

برگرسی نشیناں چناں تیغ راند کہ نقش شجاعت بر کرسی نشاند

یہ جنگ دو جوڑہ انگریزوں کے اشارے پر شجاع الدولہ نواب اودھ کے اور حافظ الملک رحمت خاں کے درمیان ہوئی تھی مولانا کے دو فارسی دیوان رضا لائبریری میں موجود ہیں۔

نمونہ کلام

چکد رنگ نراکت بسکہ از ہر مصرع موزوں شود رنگیں ز اورا قش چو گلچیناں انا ملہا
 تماشہ کردہ ام وقت عرق افشانی رویت کہ میگرددند گرد ماہ رخسار تو اختر ہا
 بہ اندازدگر آل شوخ کافر کیشش می آید خدا حافظ نمکپاشش دل صدریش می آید

مناجات

بیا ساقی از منے جُدا کُن مرا بدریائے منے آشنا کن مرا
 بہ میخانہ عشق احمد رساں بیم بر لب جام سرور رساں

در بیان خونریزی

زامواج طوفال سیما ب نول چو کبریت احمر زمیں لالہ گول

در صفت جوش بہار

بہار است سودا چو سنبل دمید بداغ جنوں لالہ و گل دمید
 صبا گر تہہ غنچہ را چاک کرد ہوا گوہر ژالہ بر خاک کرد

در بیان کثرت لشکر مدوح

ز جوش خلاق دراں پہن دشت زمیں موجزن ہچو سیما ب گشت
 زمیں راوراں منزل و مرطہ چوارض نیشاپور صد زلزلہ
 ز جام سم اسپ در جادہا زمیں داشت سر مستی بارہا
 نئے نیز با چوں نمایاں شدہ بیاباں نیستاں شیراں شدہ
 بنا شد بعنالم چنین نیستاں کہ گردد بدوش برال رواں
 مولوی سید غلام جیلانی رفعت نے ۲۴ ذی الحجہ روز دوشنبہ بمراتنی سال انتقال فرمایا۔

شیخ احمد خاں عرف ملامنوں نثار

از روئے تاریخ صبیح ملامنوں نثار محلہ منانی کے ساکن تھے۔ علوم دیکھیہ سے فراغت حاصل کر کے شعر و سخن کی طرف مائل ہوئے۔ لالہ سب سکھ رائے مسرور سے مشورہ سخن کیا۔ استاد

کے فیض صحبت سے شاعری کا مذاق پیدا ہو گیا۔ تمام عمر اسی میں مشغول رہے۔ طبیعت موزوں پائی تھی نہایت ذہین و طباع تھے۔ زبان ہندی سے بھی بخوبی واقف تھے ہندی اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ ان کے دو دیوان تھے جو تباہ ہو گئے۔ تذکرہ سرور میں مملّا نثار کے آبا و اجداد کا ذکر نہیں ہے نہ یہ مذکور ہے کہ کب پیدا ہوئے ان کا کچھ فارسی کلام دستیاب ہوا وہی درج ذیل ہے۔

در گلستان نے کہ آن خورشید عالم تاب بود
رنگ گلہا چوں چراغان شب ماہ تاب بود
گر نہ بد بخت چمن گل تاجداری میکند
منصب بلبل کہ در گلشن بزاری میکند
بر سر خاک من آن گرو خراماں بگذرد
از لب ہر ذرہ می خیزد صدائے عندلیب
شاہجہاں پور کے کسی پٹھان کا لڑکا دریا میں ڈوب گیا اس کے غم میں مملّا نثار نے ایک مثنوی لکھی تھی جس کے دو شعر تاریخ صبیح میں یوں درج ہیں۔

بنام آنکہ شر در عشق خود غرق
بذات خویش تن زد اول این برق
مصفا چوں درون اہل معنی
یکے گرا دگر کھنوت یعنی
انتقال ۱۱۷۴ھ میں ہوا حضرت سرور نے آپ کا قطعہ تاریخ لکھا ہے۔

قطعہ

آہ گوہر سنج معنی در گزشت
آہ گوہر سنج معنی در گزشت
در غم او ہاتف این تاریخ گفت
کرد احمد مولوی جان نثار

دیوان دولت رائے مہتاج

لالہ سب سکھ رائے سرور کے فرزند تھے شاعری ورثہ میں ملی تھی اور تعلیم و تربیت بھی اپنے لائق والد کی آغوش میں ہوئی تھی اردو فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ خوش گو شاعر تھے۔ ۱۲۱۵ھ میں انتقال ہوا۔ آپ کے فرزند بہت پر شاد سرور نے مصرعہ تاریخ رحلت

۱۔ دریاے گرا۔ ۲۔ دریاے کھنوت ان دریاؤں کے درمیان شاہجہاں پور آباد ہے۔

لکھا تھا۔ شدریختہ سال فوت آل پاک رواں

اشعار مستہجہ :-

در ہجر تو دیدہ ام پر آب است
دل خانہ بدوش چوں حباب است
روئے چو گلشن بیاد دارم
ہر اشک بیدہ ام گلاب است
عمر گزشت ہائے عبث درد عامرا
آں بے وفان دید ز چشم وفامرا
امشب نگاہ من رگ یا قوت گشتہ است
شاید کہ شد بہ لعل لبش چشم وامرا
نوشہ می ز بیم اندر برات عشق از
تار ہائے اشک گلگونم برویم ببنہ است
جز عشق تو پر سال زد دل زار کہ باشد
جز فرقہ طفلان دل دیوانہ مارا
نیست اس رنگ حنا ہے برکت پائے کسے
در کوچہ و بازار خریدار کہ باشد
فتنہ خون مفت اینجا کہ بر پائے کسے

مبتہجہ عابدقہ دستار
گلر خاں سرفراز باید کرد

منشی رام کشن فرحت

منشی رام کشن کا لیٹھ تھے مگر خاندانی حالات نہ معلوم ہو سکے حضرت مسرور کے شاگرد تھے۔ تذکرہ مسرور میں فرحت کو ایک بلند خیال اور باکمال شاعر لکھا ہے۔ صاحب ذوق اور اہل علم و ہنر آپ کی قابلیت کو تسلیم کرتے تھے۔ آپ صاحب تصنیف تھے ایک مثنوی مظہر عشق، اورنگ سودا، اور انیرنگ سودا، بزبان فارسی تصنیف کی تھیں۔ آخر الذکر دونوں تصنیفات فن خوش نویسی سے متعلق تھیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ فن خوش نویسی سے بخوبی واقف تھے مگر اب ان تصانیف کا پتہ نہیں چلتا۔ تینوں کتابیں غیر مطبوعہ تھیں۔ منشی رام کشن فرحت ۱۲۱۴ھ

نمونہ کلام

میں راہی ملک عدم ہوئے
گلبن خاتمش نگر نرگس چشم مست ہم
ساتی دہر را بکت شیشہ یکے و جام وہ
کہ نخل بید مجنوں گشت شمشاد از پیدن ہا
صدائے سلسلہ و نالہ فغانے ہست
زمہستی من دیوانہ تافشانے ہست

لالا پیران سکھ مشہور

لالا پیران سکھ مشہور کا آبائی وطن قصبہ مارہرہ ضلع ایڑ تھا مگر از ابتدا تا انتہا تربیت اور پرورش اپنے نانا منشی سب سکھ رائے مسرور شاہ جہانپوری کے گھر اور ان کی آغوش میں ہوئی۔ نانا کے گھر ادبی ماحول نے وہی جو ہر ابھاردیئے جو اس گھرانے کے تھے۔ بوجہ محبت اساتذہ و تعلیم فن سخن شعر و شاعری کا شوق درجہ کمال کو پہنچا پہلے دیوان اردو کی ترتیب کی مگر اسی زمانے میں فارسی گوئی کی طرف مڑ گئے اور چند روز میں اچھے خاصے فارسی گوئی شاعر بن گئے۔ چند اشعار صرف فارسی کے دستیاب ہوئے ہیں۔

چو غنچہ کرد زراز تو پردہ دار مرا	بصد زباں کہ خسرو شمی بود شعار مرا
تظلمے کس دوسرہ در گلو ریزد	بہ طرف چشم سیاہ ہے فتاد کار مرا
کدام شب کہ ز بیداد سوز ہجر تو نیست	چو شمع گرم دُعا دست انکسار مرا
گرائی بدل از ما مکن۔ مکن اے دوست	سبک بیدہ اجاب روزگار مرا

از آں یگانہ بیگانہ وارے مشہور
بود بہ شکوہ نہاں شکوہ صد ہزار مرا

لالہ بہت پرشاد مسرور

لالہ بہت پرشاد مسرور مشہور شاعر و ادیب عالم و فاضل لالہ سب سکھ رائے مسرور کے پوتے اور لالہ دیوان دولت رائے بمتبع کے فرزند و لبند تھے۔ اپنے بزرگوں کی طرح عالم و فاضل، شاعر و ادیب اور مصنف تھے۔ منشی عیوض رائے مسرت سے آپ نے علمی ادبی اور فنی استفادہ کیا استاد کے فیضان صحبت نے آپ کو ایک صاحب علم اور نامور شاعر بنا دیا تھا علم ہندی فارسی و تاریخ و نجوم و مہا میں کامل تھے۔ شعرائے عجم و ہند، فارسی میں ان کی قابل قدر تصنیف ہے جس میں انھوں نے شاہ جہاں پور کے بہت سے شعراء و ادبا و صاحب کمال لوگوں کے حالات بھی تحریر کیے ہیں۔ اگر یہ تذکرہ نہ لکھتے تو آج ہم اس شہر کے ارباب علم و فضل سے بالکل واقف

نہ ہوتے یہ حضرت سرور کا اپنے شہر پر بہت بڑا احسان ہے۔ سرور ایک کہنہ شوق شاعر تھے۔ تقریباً ساٹھ سال ادبی خدمات انجام دیں۔ انہوں نے بہت سے لوگوں کے نوے لکھے قطعات تاریخِ رحلت موزوں کیے مگر ان کی موت پر کسی نے ان کے لیے قطعہ تاریخِ رحلت موزوں نہ کیا جس سے پتہ چلتا کہ وہ کب اس جہانِ فانی سے عالم جاودانی کو سدھارے۔ سرور نہایت ذہین اور طباع تھے آپ کی تصانیف سے فنِ ریاضی کے چند رسالے تھے۔ منتخب البدائع۔ دیوانِ فارسی وغیرہ بھی مرتب کی تھی۔ سرور مرزا فاخر مکین اور مرزا مظہر جان جاناں سے بھی ملے ہیں۔ سرور نے مرزا فاخر مکین کی خدمت میں ایک رباعی موزوں کر کے بطور مہمان نوازی کے پیش کر کے داد پائی تھی۔

رباعی

اے ذات تو فاخر بیجہاں آمدہ است اوصاف تو درورد زباں آمدہ است
اووز شہری مکین بعزت اینجا خوش طابع من و مکاں آمدہ است
آپ نے حافظ شیرازی کی غزل پر ہم قافیہ ردیف غزل لکھی ہے جس کا اظہار خود مقطع میں کیا ہے
شب حید آمدہ بہتال در میخانہ زدند ماہ دیدند و نظر بر رخ پیمانہ زدند
شعلہ آتش گل سوخت دل بلبل را آتش شمع اگر در سر پر روانہ زدند

اے سرور! میں غزلت طرحِ حزینِ حافظ

کاں دو سلطان سخنِ نوبتِ شایانہ زدند

شب کہ در چشم خیالِ حسن آں گلپوش بود خونِ بلبل در رگ تارنگہ در جوش بود
اور با کمالِ نثر نگار کے ہارے میں نہ یہ حالات بتا سکے۔ آپ کے ہم مصرعوں میں ہری رام خورم۔ مولوی
دوست محمد دوست۔ مہتاب رائے رغبت۔ مہتاب رائے کامل اور ملا شیر علی عاجز نور اللہ مرقدہ
بھی تھے۔ اندازاً آٹھ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

ز بس بیتابی دل ریزد اشکِ آتشین ما چراغِ برق را فانوسِ گرد آسین ما
عسکر از باغِ جہان برگِ بے پیدا کرد غنچہ شد تنگ دل و مشت ز بے پیدا کرد
فامنش پانچمن جلوہ شمشادی یافت سر و شد بندہ ولیکن خطِ آزادی یافت
رفت دل از من و در زلفِ گر بگیر نماںد ایجنونِ مژدہ کہ دیوانہ بزنجیر نماںد
شب کہ در چشم خیالِ حسن آں گلپوش بود خونِ بلبل در رگ تارنگہ در جوش بود
شب کہ پنہاں در دلم یارے ازاں رخسار بود ہر رگم در سینہ شمعِ محفلِ اسرار بود

ایدل مگو کہ زلف کج و تابدار اوست دودے بلند ز آتش رنگ عذار دوست

مولوی محمد عابد خاں - مجروح

مولوی محمد عابد خاں مجروح اپنے زمانے کے فاجل اجل اور عالم اکمل گزرے ہیں۔ فارغ التحصیل ہو کر فطرت نے جوش موزونیت کو ابھارا تو شعر کہنے پر بھی مائل ہو گئے۔ چوں کہ تکمیل فن سخن کے لیے کس استاد کی ضرورت تھی اس لیے محمد عمر خاں وہابی کے شاگرد ہو گئے جو فاضل جلیل القدر اور بڑے ماہر فن تھے۔ وہ زمانہ شاہجہاں پور کا علم و فضل اور شعر و سخن میں آپ کی ذات پر فخر کر رہا تھا۔ خدا داد قابلیت اور فطری لیاقت نے حضرت مجروح کو بہت جلد اس قابل بنا دیا کہ ہم صدوں میں خوشگو سمجھے جانے لگے۔ علاوہ عالم اور شاعر ہونے کے آپ حاذق طبیب بھی تھے۔ مطب جاری تھا۔ آپ کا اور قد نحاں رئیس محلہ امین زئی کا زمانہ ایک تھا۔ روایت ہے کہ وزیر مالک نوب سعادت علی خاں کے علاج آشوب چشم کے لیے مولوی عابد خاں مجروح کو قد نحاں لکھنؤ لے گئے۔ مولوی صاحب نے سُرْمہ کا نسخہ تجویز کیا جو بقدر ضرورت بنتا تو وہ چار آنہ میں تیار ہو جاتا مگر خلاف اس کے چار پانچ سیر سُرْمہ تیار ہوا اور معترض کو مولوی صاحب نے یہ جواب دیا کہ اہل دول کو بجائے دوا کے دُعا سے بہت جلد فائدہ پہنچتا ہے چنانچہ بعد تیاری کے سُرْمہ مساکین اور ضرورت مندوں کو تقسیم کیا گیا کچھ سلائی بھر بچا تو اصل مریض کی آنکھوں میں لگا دیا گیا۔ خدا کی شان کہ اتنے ہی میں شفا ہو گئی اور مرض آشوب چشم جو کسی طبیب سے اچھا نہیں ہوا تھا۔ اچھا ہو گیا۔

سال رحلت نہیں معلوم ہوا مگر قیاس غالب یہ ہے کہ تیرہویں صدی کے نصف کے ادمر ادمر ہوا ہو گا صرف دو شعر دستیاب ہوئے جو درج ذیل ہیں۔

عمر نیست کہ در سلسلہ حسن مریدم در گردن من سیلی آں زلف دراز است
در خیال چشم وحشت بیشه اش جانداہ است تربت مجروح زیر گنبد آہو کنتد

منشی عیوض رائے مسرت

مسرت کے والد ماجد کا نام لاجپل تھا نسباً سکسینہ کا لیستھ اور علقہ مسجد گنج کے رہنے والے تھے۔ آپ بارہویں صدی ہجری کے وسط میں پیدا ہوئے شیخ احمد خاں عرف ملامتوں بشار کے شاگرد تھے اور انھیں سے عربی و فارسی کی تعلیم پائی تھی۔ نہایت ذہین اور طباع تھے۔ ابتدائے عمر سے ذہین دیکھ کر استاد نے خاص توجہ صرف کی اور فن شاعری کے نکات اس عمدگی سے سمجھائے کہ شعر کے معائب و محاسن پورے طور پر ذہن نشین ہو گئے۔ مسرت ایک بلند خیال شاعر تھے۔ میدان شاعری میں ان سے قبل کوئی اتنا نام ورنہ نہیں ہوا تھا۔ چند دیوان مرتب کیے۔ اساتذہ کے قصائد پر بے مثل شرحیں لکھیں۔ امرائے دہلی و لکھنؤ کی شان میں مدحیہ قصائد لکھے۔ سنائی کے قصیدہ کی شرح میں طبیعت کی جولانی کچھ اس طرح دکھائی کہ باکمال نقادان فن حیرت میں ڈوب گئے۔

در روش حسن و ناز ہست بسے خوشنما ، غمزہ بطرز ستم عشوہ برنگ جفا
مندرجہ بالا شعر کی شرح میں وہ ندرت و جدت کا اظہار کیا کہ اس کی مختلف اسلوب ترکیب سے مختلف معنی پیدا ہو گئے اور سو طرح سے اس کا دلائل سے ثبوت بھی دیا۔ مولانا غلام علی آزاد بگرامی حسان الہند مسرت کو ماہر فن تسلیم کرتے تھے۔ مسرت نے آزاد بگرامی کو ایک عریضہ نیا رندانہ ارسال کیا تھا جس میں مندرج ذیل رباعی بھی ان کی تعریف میں تحریر کی تھی۔

ائے ذات جُمع صفات معنی یعنی بصفات خویش ذات معنی
صورت نگرمت دفتر علم ہنوز کز خانہ رقم مزوی برات معنی
آزاد نے بھی جواب میں ایک قطعہ بھیجا اور مسرت کو سخن سنجی کی داد دی۔

قطعہ آزاد

کردار شاد بہ اسل سخن استاد سخن بادشاہ سخن است آنکہ دہر داد سخن
تو سخن سنجی وقت تو سخنور داند کیست سنجیدہ بمثل تو استاد سخن
مسرت نے ہندوستان میں تعلیم و تربیت پائی ایران کی صورت نہیں دیکھی نہ کسی اہل زبان ایرانی سے صحبت رہی مگر ان کے کلام پر اہل زبان ہونے کا دھوکا ہوتا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیے۔
ارپیر و جواں شور تمنائے تو بر مناست بر خیز کہ عالم بہ تما شائے تو بر مناست

من سوختم از سوز غم عشق تو اول از خانہ دل آتش سودائے تو برضاست
 یک نیزہ بلند از سر عشاق رود خوں ایں فتنہ کہ از قامت رعنائے تو برضاست
 تسبیح بکف دارم و زنار بگردن ایں سلسلہ از زلف چھپانے تو برضاست
 نالیدن دلہا عجبے نیست مسرت
 سوز عجبے از دل شیدائے تو برضاست

نواب جلال الدین مرزا مہدی علی خاں بہادر خلت نواب سعادت علی خاں مسرت کی قابلیت اور سخنوری کے مداح تھے بار بار انہوں نے فن شعریا حل مطالب اشعار کے متعلق مسرت سے دریافت کیا ہے۔ مرزا نصیر الدولہ بھی مسرت کے قدر داں تھے اور انہوں نے اپنے علاقہ پر ضلع دار مقرر کر دیا تھا۔ چند سال کے بعد یہ ملازمت ترک کر دی تھی۔ نہایت قابل اور صاحب کمال ہونے کے باوجود قسمت کے پیٹے تھے ایک امید کو ایک عرصہ میں تحریر کرتے ہیں جس میں اپنی بے روزگاری کا شکوہ کیا ہے۔

گردش دوراں ز مقصودم جدا افگندہ است دشگیرم شو کہ گرد و نم ز پیا افگندہ است
 از تومی باید کہ بازم جاد ہی بر جائے خویش از کجانا سازی بختم کجا افگندہ است

مشہور ہے کہ مسرت کی اٹھائیس تصانیف تھیں اور فارسی کے دیوان میں چالیس ہزار اشعار تھے۔ شرح قصائد سنائی شرح قصائد عرفی، شرح قرآن السورین، شرح دیوان ناصر علی سرہندی، شرح دیوان زلالی، شرح مثنوی عبد الجلیل بلگرامی، بہار دانش منظوم، آفتاب مسرت، دیوان مسرت، بلغ سلطان عطا شاہ منظوم جس میں سات سو اشعار تھے۔ اس کے علاوہ امراد شرف کی مدح میں جو قصائد اور رقعات لکھے ہیں وہ ان سے الگ ہیں۔ مسرت صرف ناظم ہی نہیں تھے وہ ایک بلند مرتبہ ناشر بھی تھے۔ ان کے ایک دوست غلام حسین نے ان کو چار عدد نیشکر بھیجے تھے آپ نے رسید شکر یہ لکھی ہے وہ لائق دید ہے۔

در شکر عنایت رباعی شیریں افزا کہ در خامہ تحریر و صفحہ نیشکر انگشت نما است۔ ایں رباعی

شکر ریزہ کہ شیرہ جانش پر داختہ اند ملاوت افزائے کام و دہن دُعاے ثنا است۔

اے نیشکر تو داد داد دلہا شیرینی کام و جاں از و شد پیدا

بالا نہ خود شکر ز شیرینی خویش با بچو نبات از نبات است نما

مولانا غلام انبیا، مسرت کے ایک دوست تھے انہوں نے تحقیقاً مسرت کو آم بھیجے ان کا شکر یہ اس طرح کرتے ہیں:

”مولانا غلام انبیا سلمہ اللہ تعالیٰ۔ انبیائے وسلہ کہ در برابرش نام شیریں نمی توای برد و ملاوت ہارا ترشی آمیزش باید شمر و ترشی ایام راز دل ربودہ و تلخ کامی زبانہ رافرا موسیٰ خاطر نمودہ۔ عرقش آب در شکر آب کہ آنجا کہ منم تراچہ مایہ و شیرہ اش با شیرہ نبات شکر رنجی خطاب کہ بالذت من تراچہ پایہ در وصف شیرینی اش لب بہ لب می بندد و جو صفت خموشی بر شکر گفتاری می خندد۔“

مرزا فاخر مکیں شاہ جہاں پور تشریف لائے مسرت بھی ملاقات کو گئے اور ان کے کمال علمی کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ ان کی شان میں قصیدہ لکھ کر بریلی بھیجا جب مرزا فاخر مکیں وہاں موجود تھے۔ مرزا نے اس قصیدہ کی تعریف کی اور جواب میں بلندی فکر اور رسائی طبع کا اعتراف کیا۔ مسرت کے قصیدے کے چند اشعار قارئین کی نذر ہیں۔

اے عزت کمال	کام تست	ذات سخن بنام تو فاخر ز نام تست
وقت مکان	خرد را مکیں توئی	بام بلند اوج طبیعت مقام تست
بیت تو کش سجد کند حرف چوں قسم		بیت الحرام علم ز بس احترام تست

مسرت مشکل اشعار و عبارت اور معامیں خاص دلچسپی رکھتے تھے اور ان کو حل کرنے میں مہارت حاصل تھی۔ آپ نے قدسی، ظہوری اور ناصر علی کے دقیق اشعار پر شرحیں تحریر کی ہیں۔ نواب غلام حسین حسین مسرت کے ماہر فن ہونے کا اقرار کرتے تھے مگر ان کا یہ خیال بھی تھا کہ مسرت کو اپنے کمال فن پر ناز بھی تھا۔

مسرت آخری عمر میں مالی پریشانیوں میں مبتلا تھے۔ اکثر روس کو عرضداشتیں بھیجیں مگر خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا تو مایوسی میں خود کو ملامت کرتے تھے۔

قدر ہنر نہ ماند مسرت دریں جہاں
بیزارم از ہنر چہ ہست آرزو کنم
آخری دور حیات میں مزاج میں چڑچڑاہٹ پیدا ہو گئی تھی اس کی وجہ معاشی بد حالی اور پیرانہ سالی تھی جب تک نواب عبداللہ خاں شاہ جہاں پور زندہ رہے کفالت کرتے رہے نواب صاحب کے بعد یہ ذریعہ کفالت و قدر دانی ختم۔ مسرت کا انتقال ۱۲۳۶ھ میں ہوا۔ ان کے شاگرد سرور نے تاریخ موزوں کی۔

کجا مسرت افصح سواد درد آمیز	بزار در صدی و شش و بال انگیز
بگذشت مسرت و غمش جاں گسل است	چوں اونہ دگر صاحب علم و عمل است
جستم چوسن وفات آواز ہاتف	گفتا کہ شد سخنوراں بے بدل است

ایک پُر لطف و دلچسپ حکایت منظوم بھی بطور تواضع قارئین پیش کی جاتی ہے۔
 شاہ پُرسید از حکیم ہوشمند۔ کز تو پُرسنم در جہاں آواز چند
 گفت شاہ ہا از ہمسہ آواز ہا چار آواز آمدہ از بس پسند
 قلقل بانگ صراحی چہ چرخ کباب چم بوس و کنار کشکش شلوار بند
 مسرت کے نام ورتلامذہ میوارام جوہر۔ بہجت بلگرامی۔ ہمت پرشاد سرور۔ خلیفہ سمیع اللہ مولوی
 فخر الدین احمد دہلوی۔ حکیم محمد شاہ عالم لکھنوی ہیں۔ مسرت کی نسل میں ان کے خاندان کے افراد
 موجود ہیں۔

ملا شیر علی عاجز

سرور نے اپنے تذکرہ میں ملا شیر علی کا کوئی پتہ تحریر نہیں کیا کہ کس خاندان کے تھے اور کس محلے
 میں رہتے تھے اور کس کے شاگرد تھے۔ کون کون ہم عصر تھا مگر ملا صاحب کی توصیف میں ایک رباعی
 سرور نے لکھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملا صاحب کی قابلیت کا ان کو دل سے اعتراف تھا۔

آن شیر علی کہ شیر میدان علوم پر نگیش زہر سخنور معلوم
 من در عجم کہ باچنین شیرے ہا چون گشت دریں جہاں بعاہزہ موسوم
 اس رباعی کے بعد لکھتے ہیں کثافت دقائوق عقلی و نقلی ملا شیر علی عاجز تخلص شیر میدان خوش کلا
 میست و در علم طبابت و در عربی و فارسی وقوف تامی“

تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ حضرت شاہ عبدالرزاق بالنسوی رحمۃ اللہ علیہ ملا صاحب کے
 جد امجد تھے اور والد بزرگوار کا اسم گرامی سید شاہ غلام علی تھا۔ ملا صاحب کے مورث تیرھویں صدی
 کے شروع یا بارہویں صدی کے آخر میں شاہ جہانپور وارد ہوئے تھے اور یہیں رہ کر فاندانی طریقہ قادریہ
 جاری کیا تھا شہر میں سیکڑوں مرید تھے اور سب لوگ بڑی قدر و عزت کرتے تھے۔ اپنے والد کے
 انتقال کے بعد سند سجادگی کو رونق بخشی اوصاف بالا پر نظر کر کے سمجھ لینا چاہئے کہ ملا صاحب صوفی
 عالم باعمل۔ جمع کمالات ہوں گے محزن علوم نقلی و عقلی۔ طیب حاذق۔ سخنور کامل تھے۔ ہمارے شہر
 کے حضرت سید فتح علی میاں صاحب قدس اللہ سرہ یادگار خاندان غوثیہ ملا صاحب کے ممتاز

اور معزز خلیفہ تھے۔ حضرت عاجز کی سکونت گاڑی پورہ میں تھی عیالدار تھے۔ اپنے بعد دو فرزند سید سیادت علی اور سید شجاعت علی چھوڑے۔ بزرگانِ طریقت میں اکثر حضرات موزوں طبع اور خوش فکر ہوتے رہے ہیں۔ مٹلا صاحب بھی عمدہ شاعر تھے۔ مذاق فارسی تھا افسوس آپ کا کلام نہیں ملا۔ ایک شعر دستیاب ہوا ہے اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

سینہ وا کردہ باغوش من زار بیا

ائے مسیحا پئے جاں بخشی بیمار بیا

رحلت کا سن قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۵۴ھ کے بعد راہی خلد بریں ہوئے۔ مزار سید اسحاق میاں نور اللہ مرقدہ کے مزار کے پاس ہے۔

نواب فیض اللہ خاں اُمید

نواب فیض اللہ خاں اُمید بانی شاہ جہاں پور۔ نواب بہادر خاں چغتائی نسل سے ہیں جیسا کہ ذیل کے نسب نامہ سے ظاہر ہے۔

نواب فیض اللہ خاں اُمید خلت نواب عبداللہ خاں المخاطب بہ نواب زین الدین خاں صولت جنگ المتوفی ۱۱۹۳ھ بن نواب زین الدین خاں عرف زین خاں (وفات ۱۲۲۴ھ) ابن نواب غیرت خاں المخاطب بہ دلاور خاں (وفات ۱۲۱۴ھ ذی الحجہ ۱۲۰۲ھ بمصر ساٹھ سال) ابن نواب بہادر خاں چغتائی۔ نواب فیض اللہ خاں کے والد ماجد آخری والی قشاہ جہاں پور تھے اور ان کی بیوی جانی بی بی کے بطن سے ۱۱۴۴ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ عہد محمد شاہی میں ۳ ہزار ذات و ۵ ہزار سوار کے منصب دار تھے اور خان بہادری کے خطاب سے سرفراز تھے۔ نواب صاحب ممدوح عالم و فاضل تھے شاعری کا شوق تھا۔ طبیعت بھی موزوں پائی تھی۔ آپ کا فارسی دیوان تھا۔ چند مثنویاں بھی لکھی تھیں۔ ایک رسالہ رسم خط میں بزبان فارسی لکھا تھا۔ اب آپ کی تصنیف سے کوئی تحریر دستیاب نہیں ہوئی۔ نہایت صاحبِ مروت۔ حلیم۔ شجاع۔ خلیق اور ذی حوصلہ امیر تھے۔ اہل کمال اور شعرا کی قدر افزائی فرماتے تھے۔ خود بھی شاعر تھے۔ فن شعر میں احمد خاں تشار اور مرزا منظر خاں جان جاناں سے مشورہ سخن فرماتے تھے گاہے گاہے اردو میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ فارسی کے دو شعر اور اردو کے تین شعر دستیاب ہوئے جو درج کیے جاتے ہیں۔

اشعار فارسی

صبا آورد بوئے گل مگر وقت بہار آمد
مراقاصد نوید آورد بنگر کاس نگار آمد
اے جانِ جاں صورت منظر معانی
ہر ذرہ نگاہے اے شمس مہربانی

اشعار اردو

کچھ تو کبھو جسم آنسو واں پر یار
لوٹتے ہیں زمیں پر بالک
تو دل کو چاہتا ہے کہ باتوں میں سیو دل
سودا نہ ہوگا زلف کی اپنی گرہ تو کھول
احوال فراق اے قلم لکھ
گر بیش نہ لکھ سکے تو کم لکھ
نواب فیض اللہ خاں کے دو بیٹے نواب مصطفیٰ خاں اور نواب مرتضیٰ خاں تھے۔ آپ کا ۱۵ شوال
۱۲۱۶ھ کو انتقال ہوا قطعہ تاریخ وفات نواب احمد خاں نے تحریر کیا تھا۔
چو او بود نواب عالی جناب
وے عالمے بود در علم دیں
شدہ زیں جہاں چونکہ او منتقل
بجنت بریں شد بہ یکدم مکین

پیرزادہ شمس الدین معروف بہ سعدی میاں سعد

آپ حضرت پیر دستگیر قطب ربانی غوث الصمدانی شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ
کی اولاد سے ہیں اور محلہ جھنڈا کلاں میں رہتے تھے علاوہ کمالات ظاہری کے آپ نسبت باطنی سے
بھی فیضیاب تھے اور طبیب حاذق بھی۔ آپ جب تک زندہ رہے طبابت کا سلسلہ جاری رکھا۔
مسیحا نفسی سے ہزاروں بیمار اچھے ہوئے۔ طالبوں کو باطنی و ظاہری دونوں فیض پہنچائے۔
شاہجہانپور کے خاص و عام آپ کی بڑی قدر منزلت کرتے تھے۔ شاعری میں بھی کمال تھا اس لئے
آپ کا کلام دور دور تک مشہور اور طرزِ حقانیت میں نرالا تھا۔ آپ کا اسم گرامی شمس الدین میاں
تھا مگر سعدی میاں کے عرف سے مشہور تھے اور اسی عرف کی وجہ سے آپ کا تخلص سعد تھا۔
روایت ہے کہ منظر کمالات حضرت میرزا جان جاناں منظر رحمت اللہ علیہ نواب فیض اللہ خاں
بہادر اُمید رئیس قلعہ شاہجہاں کے دولت خانہ میں مہمان ہوئے اتفاق سے پیرزادہ شمس الدین
بھی شاہجہانپور میں موجود تھے حضرت مرزا صاحب کی تشریف آوری کی خبر پا کر نواب صاحب کے

دولت کدہ پر پہنچے اور بڑی تمنا و عاجزی سے مرزا صاحب کو اپنے مکان لے آئے اور بڑی تعظیم و تکریم کی چونکہ دو شاعروں کا ملنا مذاق سخن کو بڑھانے والا تھا لہذا پیرزادہ صاحب کی فرمائش سے مرزا صاحب نے اپنی غزل پڑھی جو فی البدیہہ معلوم ہوتی ہے چونکہ مقطع میں سعدی میاں کی پیرزادگی کی طرف اشارہ ہے

رفت از میکدہ اما بعد عا میجو اہم کہ ازیں در زروم لغزش مستان مددے
 دیر شد کوچہ و بازار خموش افتاد است شور مجنوں مددے محشر طفلان مددے
 گفت منظر غزلے نذر جگر گوشہ تو غوث اعظم مددے قبلہ پا کاں مددے

سعدی میاں نے ۱۲۰۶ھ میں رحلت فرمائی۔ حکمت پناہ رفت۔ تاریخ ہوئی۔ آپ کے خاندان کے حضرات شاہجہاں پور میں موجود ہیں اور اب تک ان کا قدیمی و خاندانی وقار قائم ہے۔ یہ معلوم نہیں ہوا کہ آپ نے اپنا دیوان بھی مدون کیا تھا یا نہیں اور فن سخن میں کس سے مشورہ لیتے تھے۔ جس زمانے میں آپ کی رحلت ہوئی ہے ہم کو اس وقت کا کوئی استاد شاعر شاہجہاں پور میں ایسا نہیں ملتا جس سے سعدی میاں صاحب نے مشورہ سخن لیا ہو۔ بہر حال موزونے طبیعت جب ایک صفت خلقی و طبعی ہے تو ممکن ہے کہ آپ کی شاعری وہی ہو یا باہر کے کسی استاد لکھنوی یا دہلی سے استفادہ کیا ہو۔ چند اشعار ملے ہیں وہ ذیل میں لکھے جاتے ہیں۔

تا گزارے بر سر خاک مزارم کردہ از قدم داغ تمنا لالہ زارم کردہ
 علاج درد من کے از لب خندان او آید بزخم چوں نمکداں وہم کافور میگرد
 نہ رہے درد لم چوں غنچہ نے پیغام از جائے چہ امید شگفتن در بہاراں زیں چمن دارم
 عجب درد سہر بودایں زندگانی چو از سرگز شتم سبکسار گشتم
 بخواب عدم راحقے داشتم من بچشم کشودن گرفتار گشتم
 خوش فکر سے بھی تاریخ رحلت نکلتی ہے۔

لالہ موتی لال ساقی

حضرت ساقی محلہ تلیا گھورن کے ساکن اور شاہجہاں پور کے قدیمی باشندے تھے۔ آپ

نبا کا ساتھ تھے مگر یہ معلوم نہیں کہ کس سے اکتسابِ علم کیا تھا۔ خاندانی حالات بھی پردہ
خفا میں ہیں۔ تذکرہ سرور میں ان کے متعلق لکھا ہے کہ ”دریں صنعت پیری و کبر سن نشہ جوانی
اش، ہچناں باقیست در تہید سخن و تسوید عبارت و ترسیم علم سیاق و سباق ماہر کامل بود“ سرور
کے اعتبار عبارت سے استعدادِ علمی اچھی تھی۔ عمر اچھی پائی تھی۔ طبیعت رنگین تھی۔ ان کا کلام
بڑھاپے میں بھی جوانی کے جوش کو ظاہر کرتا ہے۔ بزبان فارسی شعر موزوں کرتے تھے۔ نمونہ کلام
ملاحظہ کیجئے۔

آن رنگ پان کہ برب جانان رسید ماند
دوستاں بہر شگون گبری کلاغ دیگر است
از برائے مستقیم ساقی ایام دیگر است
ز غنچہ تاکہ بہ گلزار رنگ و بودارد
کہ خدر جوہر پیشیں راکنوں در ہر سخن دارد

میخواستم رسد بکف پائے آں صنم
کے رقیب آگہ کند مار از تشریف صنم
ایں مئے و ساغر برائے دیہاں آوردہ اند
مکن اسیر نفس چند روز نہاے میاد
اثر کرد است شاید در دہن ہر خاطرش ساقی

نواب غلام حسین خاں حسین

نواب غلام حسین خاں حسین بانی شاہجہاں پور عمدۃ الملک نواب بہادر خاں چغتائی کی نسل سے
براہِ راست تعلق رکھتے تھے۔ شجرۂ نسب اس طرح ہے نواب غلام حسین خاں خلف نواب شیرداد خاں
ابن نواب بدرالدین خاں بن نواب شہاب الدین خاں خلف نواب عبدالعزیز خاں ابن نواب مختیار خاں
بن عمدۃ الملک نواب بہادر خاں چغتائی باقرزی داؤد ذمی بانی شہر شاہجہانپور۔ آپ کا سال ولادت
۱۲۰۶ء کے آس پاس ہو سکتا ہے کہا جاتا ہے کہ عوض رائے مسرت مشہور شاعر شاہجہانپور
کا ۱۳۳۶ء میں جب انتقال ہوا تو نواب غلام حسین خاں کی عمر ۲۹ سال کی تھی اس حساب سے
۱۲۰۶ء سن ولادت قرار پاتا ہے۔ نواب صاحب کے والد ماجد نواب شیرداد خاں اپنے زمانے
کے شجاع لوگوں میں تھے مشہور ہے کہ زور و طاقت میں ان کا ہمسر اس وقت دوسرا نہ تھا۔ قوی
ہیکل بھی تھے اور وجیہہ و خوبصورت بھی۔ نواب غلام حسین خاں کی جب ولادت ہوئی تو تخت
دہلی پر شاہ عالم کا چراغ سلطنت ٹٹمٹما رہا تھا اور ریاست رام پور میں نواب فیض اللہ خاں مسندین تھے

۱۲۰۸ء میں ان کی رحلت کے بعد احمد علی خاں وائی رام پور ہوئے۔ لکھنؤ میں وزیر الممالک نواب آصف الدولہ کا ڈنکا بج رہا تھا اور وہاں داد ہش اور اہل علم کی قدر دانی ہو رہی تھی رو، ملکہند اور دہلی کے رہنے والے لوگ لکھنؤ کی جانب رواں دواں تھے۔ قلعہ شاہجہانپور میں اگرچہ پھپھلی سی ثروت و امارت باقی نہیں رہی تھی مگر پھر بھی بہت کچھ تھی۔ معقول زمینداریاں تھیں ہر ایک بے فکری اور فارغ البالی سے بسر کرتا تھا۔ نواب غلام حسین خاں کے بزرگ بھی گھر کے دولت مند تھے۔ شہر کے عمائد اہل قلعہ کی تعظیم کرتے تھے۔ نواب صاحب نے طالب علمی کا زمانہ مکان ہی پر ختم کیا۔ فارسی کی استعداد فاضلانہ تھی۔ عربی میں اگرچہ علامہ نہیں تھے مگر ایسے بھی نہیں تھے کہ معمولی عربی دانوں کے سامنے عاجز ہوں۔ حافظہ اور ذہن بلا کا تھا اس پر قوت گویائی اور حاضر جوابی مشہور ہے کہ نواب صاحب کو جس قدر علمی لیاقت تھی اس سے کہیں زیادہ ان کی تقریر اور حاضر جوابی سے معلوم رہتی تھی یہاں تک کہ منطقی نکات اس خوبی و صفائی سے بتاتے اور سمجھاتے کہ بڑے بڑے عالم قائل ہو جاتے تھے۔ حافظ نثار احمد خاں عرف حافظ بدھن خاں نائب مرحوم جو نواب صاحب کے شاگرد تھے اپنی حیات میں فرماتے تھے کہ نواب صاحب کی لیاقت علمی معمولی سے بھی کم تھی مگر دوسری جانب یہ بھی فرماتے تھے کہ نواب صاحب نے ایک انشاء ہمشکل رسالہ پنجر قہ کے لکھی تھی بڑی نادر اور نہایت رنگین۔ نکات نثر سے مملو، صنائع و بدائع کا دفتر کچھ آسان کچھ دقت پسند۔ اس تالیف انشاء سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ نواب صاحب ضرور قابل اور طباع تھے۔ حضرت نائب مرحوم ایک روایت مزید بیان کرتے تھے جو غالباً انھوں نے نواب صاحب ہی سے سنی ہوگی وہ یہ کہ مسرت نے ایک مرتبہ نواب صاحب کے سامنے یہ شعر پڑھا۔

قلم چوں جلوہ آرائے رقم شد رقم بالید و ہمدوش قلم شد
نواب صاحب نے شعر میں ترمیم کی کہ بجائے بالید کے برجست ہونا چاہیے۔ چونکہ یہ تصرف رئیسانہ و امتیازانہ تھا مسرت کو بمقتضائے وقت سوائے تسلیم کر لینے اور داد تصرف دینے کے چارہ ہی کیا ہو سکتا تھا اس وقت تو اصلاح کی بہت تعریف کی مگر بعد کو اپنا شعر ترمیم نہیں کیا نواب صاحب کے شاگرد ہونے کا صحیح پتہ نہیں چلتا کہ کس کے شاگرد تھے۔ حضرت نائب اس کے بھی راوی تھے کہ نواب غلام حسین خاں حسین نواب فقیر محمد خاں گویا رئیس ملیح آباد کے شاگرد تھے اگرچہ یہ صحیح ہے کہ نواب صاحب اور نواب فقیر محمد خاں گویا ہیں رسم ملاقات دوستانہ بہت تھی اور نواب صاحب اکثر لکھنؤ یا ملیح آباد جاتے اور حضرت گویا سے ملتے اور ایک ایک

دو دو ماہ تک مقیم رہتے مگر اس کے باوجود گویا کی قابلیت شاعری اور نواب غلام حسین کی لیاقت سخنوری میں نمایاں فرق ہے۔ یقین نہیں ہوتا کہ نواب صاحب جو استعداد غزل گوئی میں گویا سے بہتر تھے گویا کے شاگرد ہوتے یہ ممکن ہے کہ گویا کے توسط سے شیخ ناسخ یا خواجہ وزیر کو اپنا کلام بغرض اصلاح بھیجا ہو یا خود پیش کیا ہو مگر یہ سلسلہ بھی دو چار سال ہی رہا ہوگا۔ کیا عجب کہ عوض رائے مسرت سے جو قلعہ کے حاضر باش تھے کلام فارسی میں نواب صاحب نے اصلاح لی ہو اس وقت سوائے مسرت کے شاہجہاں پور میں اس پایہ اور مرتبے کا کوئی اور فارسی گو شاعر موجود نہیں تھا بہر حال جو کچھ کہا گیا وہ قیاس اور قرینہ پر مبنی ہے۔ نواب صاحب کا امیر گھرانہ تھا۔ زمینداری بھی معقول تھی مگر نوابی کے خرچ آمدنی سے زائد تھے جائداد مکتفی نہ ہوئی۔ ایک حسین و جمیل بریلی کی رہنے والی طوائف منگو جان کی چاہت میں خوب جی کھول کر مال و زر نثار کیا یہاں تک کہ مقروض اور تنگ دست ہو گئے۔ اس محبت کے سلسلے میں نواب صاحب کی زندگی کا ایک حصہ بریلی میں گزرا۔ حافظ رحمت خاں شہید کے خاندان سے بوجہ رشتہ داری وہم قومی کے مساوات بھی تھی اس لیے نواب صاحب وہیں ٹھہرتے اور بہت عزت کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ لیے جلتے۔ نواب خان بہادر خاں جو رئیس خاندان حافظ الملک کے تھے وہ نواب صاحب کی مدارات میں کوئی بات اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ یہ آبائی اعزاز اور اعلیٰ خاندانی کا اثر تھا کہ نواب غلام حسین خاں نے خود داری کو ہاتھ سے نہیں کھویا۔ بیباک اور آزاد شاعر تھے۔ نواب صاحب نے اپنی زبان کو کسی کی مدح سے آلودہ نہیں کیا حالانکہ لکھنؤ میں غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر اور دیگر نامی و گرامی امیر و وزیر موجود تھے۔ نواب یوسف علی خاں والی رامپور جو شاعر تھے اور ناظم تخلص تھا نواب غلام حسین خاں کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے اور آمد و شد کا سلسلہ جاری تھا۔ مراسم دوستانہ کے سوا نواب صاحب نے ان کو بھی کبھی مدح نہیں بنایا۔ نواب صاحب کے اصراف زندگی امیرانہ تو تھے ہی ریاست آبائی کیوں کر کافی ہوتی آخر کار قرض کے بار میں دبی اور ہاتھ سے جاتی رہی۔ بتایا جاتا ہے کہ نواب صاحب رام پور نے غلام حسین خاں کا ماہانہ مقرر کر دیا تھا مگر یہ بات تحقیق سے پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔

نواب غلام حسین بریلی اور دہلی جاتے رہتے تھے۔ لکھنؤ جانے کے مواقع زیادہ ملتے تھے۔ مرنج بازی کا شوق تھا۔ فقیر محمد خاں گویا بھی ہم شوق تھے یہ وہ زمانہ تھا کہ نواب سعادت علی خاں وزیر الممالک کا دور ختم ہو چکا تھا اور غازی الدین حیدر تاجدار اودھ تھے۔ مشاعروں کی گرم بازاری تھی۔ میر۔ مصحفی۔ سودا۔ انشا وغیرہ مرچکے تھے نئے نئے شاعر شہرت کا جھنڈا گاڑ رہے تھے۔

حسام الملک نواب فقیر محمد خاں گویا سے مراسم دوستانہ تھے جب جاتے نواب غلام حسین خاں نواب گویا کے ساتھ شعر و سخن کے جلسوں میں شریک ہوتے۔ ملیح آباد میں بھی اکثر قیام کرتے تھے۔ وہ کیا زمانہ ہو گا کہ مشاعرے میں ایک طرف شیخ امام بخش ناسخ معہ اپنے نامور تلامذہ برق۔ بجر۔ رشک۔ خواجہ وزیر۔ سحر وغیرہ کے اور دوسری طرف خواجہ حیدر علی آتش معہ اپنے قابل شاگردوں زند۔ صبا۔ خلیل۔ فروغ وغیرہ کے بیٹھتے ہوں گے اور انھیں میں نواب غلام حسین خاں حسین گویا کے ہمراہ شریک صحبت ہو کر لطف اندوز ہوتے ہوں گے۔ اساتذہ لکھنؤ کی صحبت نے حسین صاحب کا شوق گویائی بڑھا دیا اور زبان دانی حاصل کر کے اچھے خاصے شاعر بن گئے۔ کلام میں فصاحت آگئی۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ نواب غلام حسین خاں حسین نے اپنے استاد کے نام کو پوشیدہ کیوں رکھا۔ جس طرح لکھنؤ والوں سے فن سیکھا تھا فراخ دلی سے استاد کا نام بھی ظاہر کیا ہوتا بہر حال نواب صاحب کو ناسخی سمجھ لینا چاہئے اور یہ بات لکھنؤ میں مشہور بھی ہوئی تھی کہ حسین ناسخ کے یا حضرت گویا کے ممتاز شاگرد تھے۔ یہ بات بھی مشہور ہے کہ فقیر محمد خاں گویا تعلق قلبی کی وجہ سے نواب صاحب کے ساتھ سلوک مافی بھی کرتے تھے یہ سلوک برادوانہ تھا نہ کہ امیرانہ۔ حضرت گویا کا انتقال نواب صاحب کی زندگی ہی میں ہوا تھا۔ ایک غزل کے مقطع میں اظہار غم کے بطور کہا تھا۔

زندہ درگور ہوا فرقت گویا میں حسین لکھنؤ کو وہ مگر شہر خموشاں سمجھا

نواب صاحب شعرائے لکھنؤ کے بڑے مداح تھے اور انھیں کی روش پر چلنا چاہتے تھے غزلوں میں وہی لکھنؤ کا رنگ ہے۔ اس کے ثبوت میں چند شعر دیکھیے۔

کیا ظریفانہ لکھا بجر نے مصرع یہ حسین کھل گیا قفل دہن یار کا جھوٹا ہو کر

یاد رکھنا کہ وہ ریختہ گوئی میں حسین ناروا ہے جو قدم بر قدم میر نہ ہو

کیا ہی سنجیدہ لکھا شعر یہ قاسم نے حسین دیکھ انصاف سے تو یک دل و یک ہو کر

آزمائے کو ہر اک کے کہ ہے کس زن کا کون قول لیتا ہے ترا تیر ترا زو ہو کر

اگرچہ نخل سخن کی بہت ہیں فرع حسین اصول میر ہی کافی غزل سرا کے لئے

بعد میر و مضعفی اس میں نہیں شک اے حسین ناسخ و آتش یہ دونوں لکھنؤ کی جان تھے

شاہجہاں پور میں جب ۱۸۵۶ء کا غدر برپا ہوا تو قلعہ کے بعض رئیس اہل فوج کی تحریک شرکت

سے باغی بن کر کھڑے ہو گئے۔ نواب غلام حسین خاں بھی شبہ بغاوت میں گرفتار ہوئے مگر

صفائی دے کر بری ہو گئے۔ بعد غدر جب کہ لکھنؤ کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا اور فقیر محمد خاں گویا

بھی رحلت فرما چکے تھے۔ نواب صاحب کی زیادہ آمدورفت رامپور کی طرف رہی۔ نواب غلام حسین کے کثیر تلامذہ تھے مگر ان میں زیادہ نام درمیر امداد علی شاد۔ حافظ نثار احمد خاں نائب۔ رؤف احمد شفا۔ سید محمد محسن عرشی۔ شیخ امید علی ساکن گاڑی پورہ اپنے وطن کے ہر وضع و شریف کو جوان سے ملتا تھا محبت و عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ہر ایک کے ساتھ ان کا برتاؤ یکساں تھا۔ اعلیٰ قدر و مراتب نواب غلام حسین کی خدمت بھی شیخ صاحب کو کرنا پڑتی تھی۔ یہ اخیر زمانہ تھا کہ ۱۲۸۱ھ میں نواب صاحب نے رحلت فرمائی۔ ان کے شاگرد حضرت نائب نے قطعہ تاریخ رحلت تحریر کیا۔

عیش و سرور سے مجھے نائب فراغ ہے
دل محو درد ہے تو بگر وقف داغ ہے
اندھیر ہے جہاں میں وفات حسین سے
ہاتھ پکارتا ہے۔ ہوا گل چراغ ہے
حسین ذی ہم رفت از جہاں وائے
کہ میدارد عدلیش مثل عنقا
چو از روئے بلد تار سخن جستیم
ندا آمد۔ در یغا وائے و پلدا

نواب صاحب اپنے خاندان میں عجیب و غریب انسان تھے۔ نہایت خوش تقریر معاملہ فہم بڑے سحر بیان و سلیم الطبع آپ کی اصابت رائے تمام شہر میں مشہور تھی۔ نواب صاحب کی وجاہت ظاہری بھی قابل دید تھی۔ بہت خوش رو۔ سرخ و سفید رنگ۔ کشیدہ قامت مگر جسامت متوسط تھی وہ بھی نہایت سڈول۔ گول چہرہ۔ فراخ سینہ۔ بڑی بڑی آنکھیں غرض یہ کہ خوبصورت شخص تھے۔ جب ملکہ و کٹوریہ نے ہندوستان کی حکومت کمپنی بہادر سے اپنے ہاتھ میں لی تو ہندوستان کے معزز خاندانوں کے ارکان پر عنایات شاہانہ مبذول کر کے ان کی عزت افزائی کی تو چند خلعت خیر خواہان سلطنت کے لیے شاہجہاں پور بھی آئے۔ ایک خلعت وائسرائے نے نواب غلام حسین خاں حسین کو بھی پہنایا۔ نواب صاحب کی قبر موضع مصری پور کے آبائی قبرستان میں ہے۔

نواب صاحب کے دو دیوان ایک اردو اور ایک کلام فارسی کا ان کی زندگی ہی میں مرتب ہو گئے تھے مگر ان کی نگہداشت نہیں ہوئی اور غدر کے بعد غائب ہو گئے۔

راقم الحروف نے انتہائی جانفشانی۔ جانکاہی اور تلاش بسیار کے بعد کچھ اردو فارسی کلام دستیاب کر لیا ہے جو بطور نمونہ پیش کیا جا رہا ہے۔ نواب صاحب کی طبیعت جدت آفریں و بلند پرواز واقع ہوئی تھی اسی سبب سے بیشتر اشعار میں ایجاد مضامین کی جھلک نظر آتی ہے۔ عاشقانہ رنگ سے علیحدہ کہیں کہیں فاضلانہ قابلیت سے بھی کام لیا ہے اور کہیں تہذیب و متانت کا خیال ذکر کے ایسے آگے بڑھ گئے ہیں کہ جان صاحب بھی پیچھے رہ گئے۔ نواب صاحب نے

اپنے کلام کے قدر دانوں کو ہر قسم کی لذت چکھانی ہے۔ اس لئے از ہر قسم اشعار پیش خدمت ہیں۔

نواب حسا کی فاضلانہ قادر الکلامی

کہ مہر مادری ہے استعارہ ام صبیاں کا
دل میں ہیں بیضہ فولاد کے جو ہر کردار
ہم سمجھتے ہی نہیں مجرور کو اور جاہ کو
واجب نہیں ہے عالم امکان کے بے خیر
امکاں میں اپنے روپ بدلنے لگا ہے عشق
یہ مقولہ ہے نیا کیف کو کم سمجھا میں
زباں کو حال نہیں اور دل کو قال نہیں
نصیب نوع بشر فصل اعتدال نہیں
گنگ گویا شنوا جزا ہم ہوتا ہے
منزل نفی نہ تھی مسلک اثبات نہ تھی
تشبیہ مجھ کو دیتے ہو جزا صم سے کیوں

سپید ایسا ہوا ہے خون سیک اس زمانہ میں
طائر روح کے اڑنے سے نہ ہوں گے منفک
دل سے بسم اللہ نکلتی ہے یہاں بے اختیار
ممکن کی آنکھ سے ہے یہاں سبر و جوب
آئینہ و جوب کا عکس آشنا ہے عشق
منطقی مظہر ناقص کو اتم سمجھا میں
عجب طرح کا تقابل ہے لفظ و معنی میں
زبان حال سے کہتی ہے جنس حیوانی
اثر بادہ گلرنگ عجب ہے کہ یہاں
کل مرا اور ہی صحرا میں گزر تھا کہ وہاں
کس نے کیا سوال کہ جس کا جواب دوں

قلم ہے کف میں یا ہے نیشتر لیلیٰ کی مرگاں کا
مقلد بخت برگشتہ ہے کس برگشتہ مرگاں کا
کہ سو آفت سے ہے محفوظ شیشہ طاق نیساں کا
سخن گو سے کہیں بڑھ چڑھ کے رہے سبخدان کا
گلاب بیٹھے الہی اب تو اس ظالم حدیٰ خوال کا
اگر جراح تو نے میرے دل کے زخم کو ٹانکا
کہ وقت واپس رہ جائے پردہ میرا میاں کا

سواد نامہ ہے یا خوں ہے مجنوں کی رگ جاں کا
مری جانب نہیں پھرتا ہے منہ اس کا کسی صورت
ہمارے دل سے کی قطع نظر اس نے بجم اللہ
میں اس کا معتقد ہوں شعر کا جو لطف اٹھاتا ہے
بڑھا جاتا ہے ناقہ قیس مسکین کتبلک دور سے
سمجھ لے توڑ ڈالوں گا ابھی میں رشتہ جاں کو
عبادت سے مجھے اتنی غرض ہے عہد پیری میں

حساب پاک بہم دل میں دوستانہ ہوا
جہاز عمر کا خشکی میں کیوں روانہ ہوا

لگائی مجھ پہ جو تلوار درد شانہ ہوا
طلسم گاہ نہیں ہے جو عالم دنیا

ہنسی خوشی سے جو قاصد ادھر روانہ ہوا
وفارے وعدہ کا اچھا انھیں بہانہ ہوا

رولایا مجھ کو بہت میری بدگمانی نے
لگا کے ہندی وہ کس درجہ باغ باغ ہو

خدا قایم رکھے پتھر بتوں کے آستانے کا
کہ عالم اس نے دیکھا ہے تری تیوری چڑھانے کا

ہمارا دردِ سر ہرگز نہیں صندل سے جانے کا
حسین بے گنہ کی آنکھ کب مقتل میں چھکے گی

غنچہ بے دامن رہا گل بے گریباں رہ گیا
رکھ کے انگشت تاسف زبردناں رہ گیا

حسبِ خواہش کس نے پایا ہے لباسِ عاریت
داورِ محشر بھی میرا ماجرا سُن کر حسین

جبکہ اپنی عمر کا لب سیریز پہیمانہ ہوا
کیا حسین متقی بھی مجھ پہ دیوانہ ہوا

تب میسر شربت دیدار جانا نہ ہوا
میری حالت سُن کے لوگوں سے وہ بولا ناز سے

آہ بے تاثیر کی صورت پلٹ آنا ہوا
مجھ کو رونا آ گیا جب اس کے گھر جانا ہوا

اس کے کوچے میں اگر اپنا کبھی جانا ہوا
دل جو ناخوش ہو تو دار العیش ہے بیت الحزن

ہاتھ اپنا ہے جگر اپنا گریباں اپنا

ناصری جیبِ دری سینہ زنی کرنے دے

برنگ ماہ تو ہر شب کہاں کہاں نہ رہا

فروغِ حسن سے خالی کوئی مکان نہ رہا

اب تو آباد ہوا گھر تیرا
غیر کا ہاتھ ہو اور سر تیرا

رات بولے وہ مرے گھر آ کر
تو ہی منصف ہو کہ ہنگامِ قسم

خود تو وہ سمجھے نہیں ہیں مجھ کو سمجھائیں گے کیا

حضرت واعظ عبث تشریف لاتے ہیں حسین

اپنا جو تھارِ فیق وہ بے گانہ ہو گیا

درپردہ دل کا یار سے یار انہ ہو گیا

در تک قضا بھی آ کے شب بھر پھر گئی اتنا مہیب اپنا سیہ خانہ ہو گیا

باغ تھا ساقی تھا مطرب تھا فضا تھی میں نہ تھا سائبان ابر تھا ٹھنڈی ہوا تھی میں نے دیکھا

جب کہا میں نے کہ کیوں جنجال میں ڈالا مجھے ہنس کے بولے زلف کا فرما جراتھی میں نہ تھا

مجھے نہ کاٹ سکی تیغ تیز اعدا کی میں اپنی خوں سے ملائم سے غرق آہن تھا

یاد آتا ہے خراب شب ہجران ہونا اشک پر شور سے آنکھوں کا نمکدان ہونا

مجھ کو کچھ مشورہ کرنا ہے اسے آج نہ چھیڑے جنوں عقل سے کل دست و گریباں ہونا

مغفرت کی کوئی صورت نظر آتی ہی نہیں ہاں مگر ایک بھروسہ ہے گنہ گاری کا

یہ لب سے نالے آئے مسلسل کشش جہت میں پڑی ہے پلچل وہ رات آنکھوں سے میں نے دیکھا نہیں کچھ فرق آئین ہدم نہ بیٹھو کوٹھے پہ چاندنی میں اتر کے گلیوں کی خاک چھانو سخن کی تحصیل ہو رہی ہے قلم شب و روزیاں جاری

نواب غلام حسین خاں حسین کا اصلی مذاق سخن فارسی گوئی تھا۔ نثر فارسی بھی عمدہ لکھتے تھے۔ نواب صاحب خوش مذاق شاعر تو ضرور تھے مگر بہت کم شعر کہتے تھے تاہم ان کی اس قدر غزلیں ضرور تھیں کہ دیوان مرتب ہو گیا۔ سنا ہے کہ نواب صاحب کی زندگی میں کوئی مسلمان ماسٹر جو خوشنویس بھی تھے مسودات صاف کرنے کو لے گئے اور وہ کل دیوان صاف کر گئے۔ نہ مسودات واپس دیئے نہ صاف شدہ غزلیں البتہ کلام اردو نواب احمد اللہ خاں عرف ہیکلے نواب کا جمع کیا ہوا موجود رہا اور حسن اتفاق سے نواب صاحب کا کلام فارسی کچھ ادھر ادھر شاگردوں کے پاس موجود تھا اس سے بھی ایک مجموعہ تیار ہو گیا۔ سنا ہے کہ فارسی کا کلام بشکل دیوان کسی طرح منشی رفعت رفعت مرحوم کے کتب خانہ

میں پہنچ گیا تھا فشی رفت علی اور ان کے فرزند منشی والا نشان کے بعد کم علم بلکہ بے علم اولاد نے دیوان خانہ جس میں کتب خانہ بھی تھا جب ضروریات کے لیے استعمال کیا تو کل کتابوں کو نکال کر بالا خانے کے سائبان میں ڈھیر کر دیا جو دھوپ بارش بوجھ اور گرد و غبار سے گل بڑ گئیں اور جو صاف ستھری نکلیں وہ ایک پاک تانی کے ہاتھ دو چار سو روپیہ میں فروخت کر دیں۔ وہ کتب خانہ جس میں تقریباً اسی فیصد قلمی نسخے تھے اور لاکھوں روپیہ کی مالیت کے ہوتے نا اہل و رنار کی ناقدری کا شکار ہو گیا۔ نواب صاحب کے صرف چند فارسی اشعار جس میں سے چند تالیف صلیح میں بھی درج ہیں یہاں ناظرین کے لیے پیش کرتے ہیں۔

غائب از چشم جہاں باشد جہان کے دوست
یا فتم از بے نشا بینہاں نشان کوئے دوست
فتاندم دست از دنیای و عقبی
طفیل ہمت مردانہ خویش
بگوش کبر من افسون فقر کار نکرد
وانجاک نشانید و خاکسار نکرد

نواب احمد علی خاں عرف ہیکلے نواب جن کا مقبرہ غلہ گوہر پورہ میں مشن اسکول کے مقابل بجانب مشرق موجود ہے صاحب جا نیداد تھے۔ چوراسی مواضعات زمینداری میں تھے جو رفتہ رفتہ قرض کی نذر ہو گئے پھر بھی جو کچھ چھوڑا بہت تھا۔ ان کی زوجہ منصب بیگم قابض متصرف تھیں اور اولاد تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد وارثان میں نزاع پیدا ہوا۔ نواب غلام حسین خاں بھی وارث تھے محمد عبدالرحیم نے اپنی وکالت صرف کی اٹھ سال کے بعد نواب صاحب کے حق میں فیصلہ ہوا مگر افسوس 'عید ہوئی'، ولے شام کو ڈگری کا حال معلوم ہوا تو نواب صاحب اس دنیا سے سدھار چکے تھے۔ نواب ظفر خاں پوتے موجود تھے وہ ڈگری شدہ حصہ ان کو ملا آبائی جائداد تو نواب صاحب خرچ کر چکے تھے لیکن شان نوابی مرتے دم تک نہ گئی چار کھار۔ دو خدمت گار دو باورچی تنگ دستی میں بھی خدمت پر مامور رہے۔ دسترخوان وسیع تھا۔ یہ جائداد جو بڑھ بگڑ کر ملی تھی نواب مظفر علی خاں نے صرف بیجا کے ہاتھوں پھونک دی۔ نواب سلام حسین خاں حسین سے متعلق چند روایات حافظ حکیم معشوق علی خاں جو ہر رئیس گاڑی پورہ نے تحریر ہی طور پر محفوظ کر لی تھیں ان میں سے چند یہاں پیش کی جاتی ہیں اگرچہ یہ روایات بہت شہرت حاصل کر چکی ہیں جن کے دہرانے کی چنداں ضرورت تو نہیں ہے مگر آنے والی نسلیں ممکن ہے بھلا دیں اس خیال کے ماتحت ضروری ہے کہ معرض تحریر میں لے آئی جائیں اور دستاویزی صورت اختیار کر لیں۔

ایک مرتبہ نواب صاحب لکھنؤ میں موجود تھے خواجہ آتش نے اپنا یہ شعر پڑھا

چال ہے مجھ نیم جاں کی مرغ بسمل کی طرح

ہر قدم پر ہے یقیں یاں رہ گیا واں رہ گیا

نواب صاحب نے سن کر فوراً یہ اعتراض کیا کہ مرغ بسمل کو بفتار سے کیا واسطہ۔ ہاں اس کے لیے تڑپ کی ضرورت ہے۔ کاش یہ شعر یوں ہوتا تو اچھا ہوتا۔

چال ہے مجھ نیم جاں کی مرغ بسمل کی تڑپ

ایک لفظ کے رد و بدل سے شعر میں جان آگئی اور مضمون بھی صحیح ہو گیا۔ اسی طرح حضرت ناسخ کا جب یہ شعر سنا۔

دے دو پیٹ تو اپنا ملل کا ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

نواب صاحب نے فرمایا دو پیٹ کو اگر تو لا جائے تو یقیناً چھٹانک آدھ پاؤ کا نکلے گا۔ کچھ تو وزن ضرور ہوگا جو ناتوانی کے خلاف ہے معشوق کی نزاکت کی طرح عاشق کی ناتوانی بھی ہونا چاہئے لہذا یہ شعر یوں ہو تو بہتر ہے۔

ڈال دے سایہ اپنے آنچل کا ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

کلیات آتش میں تو حسب روایت "مرغ بسمل کی تڑپ" موجود ہے مگر ناسخ کے دیوان میں ترمیم شدہ نہیں ہے۔ لکھنؤ میں یہ ناسخ کے شعر والی ترمیم نواب غلام حسین خاں حسین کے نام سے مشہور نہیں ہے وہاں کے لوگ اور طریقے سے بیان کرتے ہیں۔ نواب صاحب شیخ ناسخ کا نام بڑی عزت سے لیتے تھے۔ یہ واقعات صحت سے معرّ نظر آتے ہیں۔

نواب صاحب کی ظرافت طبعی کے چند لطیفے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں ناظرین

ذہانت کا اندازہ کر لیں۔ لطیفہ۔ نواب صاحب لکھنؤ میں منشی سید فضل رسول واسطی مرحوم تعلقدار

سندیلہ سے بھی کبھی کبھی ملنے جاتے تھے چونکہ منشی صاحب عمدہ شاعر بڑے مہمان نواز اور

ملنسار تھے اس لیے نواب صاحب کی بڑی مدارات کرتے تھے تپاک سے ملتے اور

قدرو عزت سے ٹھہراتے۔ شعر و سخن کے چرچے رہتے۔ ایک مرتبہ کوئی شخص میرا امام علی نامی

منشی صاحب کے ہمراہ تھے انھوں نے بوجہ ناواقفیت موقع پا کر نواب صاحب کا نام دریافت

کیا۔ چون کہ ظرافت کا موقع تھا نواب صاحب نے جواب دے دیا مجھے امام حسین کہتے ہیں

میر صاحب جو شیعہ تھے بہت حیرت ہوئی۔ چپ ہو رہے۔ نواب صاحب بولے

میر صاحب تعجب کیوں کرتے ہو تم امام علی ہو تو میں امام حسین ہوں۔ اب بھی ایک درجہ

میرا گھٹا ہوا ہے۔ منشی سید فضل رسول نے سنا تو ہنسنے اور نواب صاحب کی ظرافت آمیز ذہانت کی بڑی داد دی۔

کبھی لکھنؤ بھی عجب آزاد شہر تھا۔ ایک مرتبہ وہاں کے آزاد طبع اور ظریف لوگوں نے نواب صاحب کی ذہانت دیکھنے کے لیے کاغذ پر انگریز کا چہرہ اس کے آگے سوچ اس کے آگے (بان) ایک ہتھیار بنا کر پیش کیا اور نواب صاحب سے پوچھا کہ بتلائیے یہ کوئی نام ہے یا شعر ہے یا فقرہ۔ نواب صاحب نے اس کاغذ کو دیکھا ہنسنے اور سادگی سے بولے یہ تو صاحب مہربان ہے۔ واہ صاحب کسی نے اچھا روکش فقرہ ایجاد کیا ہے۔ گذشتہ زمانے میں مصری لوگ بھی یوں ہی لکھا کرتے تھے اور اس کا رواج چین میں بھی تھا۔ میں بھی لکھنا جانتا ہوں۔ میرا لکھا ہوا پڑھ دو تو میں جانوں کہ بڑے قابل ہو۔ چنانچہ نواب صاحب نے اسی کاغذ کے ذیل میں ایک حلقہ جس کا منہ کھلا ہوا تھا قلم سے بنایا اور اس کے آگے لفظ کمر اور کمر کے آگے خون کا لفظ لکھا اور اس کے آگے درخت کی شکل بنا کر اس پر درخت آگ تحریر کر دیا اور موجودین سے پوچھا کہ حضرات ذرا اس تحریر کو بھی دیکھئے اور فرمائیے کہ یہ کوئی شعر ہے یا فقرہ یا نام یا پہیلی۔ حاضرین کاغذ کو دیر تک دیکھتے رہے مگر کچھ نہ بتلا سکے حتیٰ کہ مکان کو لے گئے اور صبح کو کورے چلے آئے۔ نواب صاحب سے بولے کہ حضرت ہماری سمجھ تو بالکل قاصر ہے اب مہربانی فرما کر آپ ہی اس دقت کو رفع کریں۔ نواب صاحب ہنسنے اور بولے کہ بھائی یہ تو بڑا سہل فقرہ ہے۔ میلے ٹھیلے کو جاتے ہو اور نہیں سمجھتے ہو۔ کیا غازی میاں کی برسی کا میلہ کبھی چلتے نہیں دیکھا اگر دیکھا ہو تو یاد کر لو۔ جانے والے یہی تو سر راہ کہتے جاتے ہیں۔ بالامیاں دم مدار۔ مستقرین ہنسنے لگے اور نواب صاحب کی ذکاوت اور حاضر جوابی کی داد دینے لگے۔

نواب صاحب لکھنؤ میں تھے اور اس وقت قیام گاہ میں چند اہل سخن بھی بیٹھے تھے۔ نواب صاحب نے خدمت گار سے کہا کہ دیا جلا دور حاضرین سن کر معترض ہوئے کہ حضرت آپ شاعر ہو کہ چراغ کو دیا فرماتے ہیں۔ نواب صاحب بولے کہ صاحبو میں ایک قصبہ کا رہنے والا ہوں وہاں کی زبان وضع۔ قطع۔ محاورہ۔ روزمرہ کوئی مستند نہیں، شاعر ہوں تو کیا ہوا۔ قصباتی زبان کہیں جاسکتی ہے۔ ہاں آپ لوگوں سے زبان سیکھتا ہوں۔ آجائے گی تو ایک دن مستند ہو جاؤں گا۔ مگر یہ تو فرمائیے یہ جو بازار میں ایک چھوٹا سا بکس لکڑی کا بکتا ہے اور اس میں پتلی

پتلی سلائیاں جن میں مصالح جلنے کا لگا ہوتا ہے اس کو آپ لوگ کیا کہتے ہیں۔ حاضرین سوچ کر بولے اس کو دیا سلائی کہتے ہیں۔ نواب صاحب نے فرمایا یہ کہنا تو زبان کے خلاف ہے، چراغ سلائی، کہنا چاہئے کیوں کہ دیا سلائی ولایتی نام نہیں ہے آپ لوگوں ہی نے رکھا ہے۔ بجائے دیا سلائی کے کوئی اور نام ہو تو بتلائیے۔ حاضرین یہ جواب سن کر نواب صاحب کی خوش مذاقی اور متانت کے قائل ہو گئے۔

قاضی سید سرفراز علی سید

قاضی سید سرفراز علی کے دادا شیخ اللہ داد بعید اور ننگ زیب عالم گیر ترمذ سے وارد ہندوستان ہوئے اور شاہجہا پور میں سکونت اختیار کر لی۔ سید سرفراز علی کے والد کا نام سید امانت علی تھا اور محلہ قاضی خیل کے ساکن تھے۔ آپ ۱۲۲۷ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم شاہجہا پور میں پائی۔ آپ کے ماموں منشی نیاز علی صاحب بنگلہرامی نے جو مراد آباد سرکار کمپنی کی طرف سے ڈپٹی کلکٹر تھے آپ کو اعلیٰ تعلیم کے لیے دہلی بھیج دیا وہاں کتب درسیہ کی تعلیم حاصل کی۔ اس وقت استاد ذوق۔ مومن خاں مومن اور مرزا غالب زندہ تھے ان کی صحبت میں شعر و شاعری کا مذاق پیدا ہو گیا اور خود بھی شعر کہنے لگے، سید تخلص اختیار کیا۔ نہایت متشعر اور پابند ارکان دین تھے اپنی شاعری کو حمد و نعت تک محدود رکھا اردو فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ مناظرہ میں ماہر تھے عیسائی پادری عماد الدین کی تصنیف 'نیاز نامہ' کا جواب "ہدایت شامہ" لکھا تھا۔ شاہجہا پور کے قاضی شہر مقرر کیے گئے تھے ۱۸۵۷ء کے غدر کے زمانے میں رئیس بریلی نواب خان بہادر خاں نے سرفراز علی کو اپنی طرف سے شاہجہا پور کا منصف مقرر کر دیا بعد غدر آپ کو اس کی سزا دی گئی اور انڈمان بھیج دیئے گئے۔ انڈمان میں کرنل بروس حاکم اعلیٰ تھا سرفراز علی نے اس کی خواہش پر اس کو فارسی کی تعلیم دی اور اپنا گرویدہ کر لیا۔ انڈمان کے قیدیوں نے کم شرح اجرت کے خلاف بلوہ کیا اور کرنل بروس کا بنگلہ گھیر کر حملہ کی کوشش کی اتفاق سے سید صاحب اس وقت بروس کے بنگلے پر موجود تھے بلوائیوں کو سمجھا بچھا کر قابو میں کر لیا اور کرنل بروس کو بچا لیا۔ اس صلہ میں کرنل بروس نے سفارش کر کے رہا کرادیا اور

یہ وطن واپس آگئے۔ یہاں آکر درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ ۱۸۷۵ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول میں عربی کی تعلیم کے لیے درجہ کھولا گیا تو یہ مدرس دوئم مقرر کئے گئے۔ قاضی سرفراز علی کو حضور سرور کائنات کے واہانہ عشق تھا۔ عشق محمدی میں سرشار رہتے تھے میلاد شریف ذوق و شوق سے پڑھتے تھے اور بے خود ہو جاتے تھے۔ ایک بار میلاد خوانی کے دوران کچھ اس طرح کیفیت طاری ہوئی کہ فالج کا اثر ہو گیا۔ چند روز کے بعد ۱۲ جمادی الثانی ۱۲۹۳ھ کو چھیا سٹھ سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا اور محلہ چکنی کے قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے۔ جب شاہجہانپور سے سزا بھگتنے کے لئے انڈمان جا رہے تھے ایک مناجات لکھی تھی۔ اس مناجات کے دو اشعار درج ذیل ہیں۔

مارا زور مراں دل و جانم فدائے تو اے مصطفیٰ تو شاہ من و من گدائے تو
سید کہ شد اسیر بلا در ہوائے تو ناز و براں اسیری کہ باشد برائے تو

اشعار غزل

شبیبہ یار سے فرقت میں ہمکنار رہا خزاں میں مجھ کو سدا موسم بہار رہا
شب فراق کو کاٹا خیال ابرو میں سدا یہ دیوکیہ زیر ذوالفقار رہا
شعر جب منہ سے بوجہ رخ جاناں نکلا طبق نور لئے خلد سے رضواں نکلا
سنگ اس راہ کے گویا ہونے مردے کیسے توجہ اس قدموزوں سے خراں نکلا
چل دیئے حضرت عیسیٰ فلک چارم پر جب نہ بیمار ترالاتق درماں نکلا

شیخ احمد خاں اظہر

آپ عثمان خاں صاحب کے خاندان سے تھے اور محلہ ترین میں رہتے تھے۔ فارسی میں استعداد عالمانہ تھی۔ حالات سے پتہ چلتا ہے کہ تیرہویں صدی ہجری میں آپ بقید حیات تھے۔ زیادہ حالات زندگی معلوم نہ ہو سکے۔ زبان فارسی میں آپ کا کچھ کلام دستیاب ہوا ہے جس کو مولف تاریخ صبیح نے نقل کر کے پیش کر دیا اور وہی کلام یہاں درج کیا جاتا ہے۔

اے ناظم دیوان سخن از تور زبانہا تو خط بود از نام تو ہر نامہ جانہا
ہر جا کہ بود شعلہ سوزی یقینیت جوں اخلگر پڑ مردہ بخاک اندگمانہا

دروادی شقیم سرا سیمہ و حیراں
افتاد چو نقش قدم رہ روایم
خضر رہ مانیست بحر انگ روانہا
عنا شدہ در منزل من سنگ نشا ہنا
بازار بخرد کہ درو حسن خریدار
نگرفت متاع ز غم سود و زیانہا

اظہر یہ تنایت ز سر نکتہ اول

چوں گنگ کہ از خواب زند طرح بیانہا

تاریخ مطیع کے حوالے سے مولف تاریخ صبیح نے تحریر فرمایا کہ اظہر نے ایک رقعہ شیخ کریم بخش
حاکم کیٹہر کو لکھا تھا۔

مل جائے بیکساں و ماوائے سلیم کریم

کریم بخش ترا بخشش و کرم باید
ہزار مرتبہ جاہ و جلال ایزد بخش
کہ اسم پاک تو مبنی پہ بخشش و کرم است
ترا دہد کہ نوی ذی سخاوی ہم است
خادم علی خاں نے چند اشعار لکھ کر حضرت اظہر کو بھیجے تھے۔ اس کے شکر یہ میں خط لکھا ہے اس
میں ایک رباعی بھی موزوں کر کے بھیجی تھی۔

محفوظ بحفظ جاودانی باوا
محفوظ بخط کامرانی بادا

ما غمزہ را چو شاد کردی مسخن
عالم عالم بشادمانی بادا

قدرت اللہ خاں صاحب عرف قدن خاں رئیس قدن خیل کو آپ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

اے قدرت خداست نمایاں بنام تو
الف و عطا و کام روایت کام تو

اپنے بھائی مولوی نظام الدین احمد کی بیماری کا سن کر خط میں دعائیہ رباعی لکھی ہے۔

حق شانی حقیقی بخش ترا شفائے
سازد بہ ہر مرضہا از فضل خود دوائے

احوال خود چہ گویم از دست برد غمہا
بر چشم ابر آسا بگذشت ماجرائے

غشی انت رام خاموش

غشی انت رام خاموش نسا کا بیٹھ تھے مگر ان کے والد اور استاد کا نام معلوم نہ ہوسکا۔ یہ
محلہ مسجد گنج کے ساکن تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ گنگرام ایک صاحب کمال صوفی اور درویش کی

صحبت کے اثر سے صوفی ہو گئے تھے اور تاعلم درویشی میں بسر کی اور محبت الہی میں غرق رہے۔
بیجانای ایک خوب و طوائف میں دلچسپی تھی اور اس حد تک گرویدہ ہوئے کہ دیوانگی تک جا پہنچے۔
روحانی قوت کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ محبوبہ پر گزرتی ہو وہ بیان کر دیتے۔ قانع اور متوکل تھے۔ ان کی
محبوبہ کا انتقال ہو گیا تو ایک نہایت معرکہ کا شعر کہا۔

ہوش من از سر بکار عشق بیچارفتہ است ہوش ازیں ویرانہ ممور بیچارفتہ است
ذیل میں مزید کلام درج کیا جاتا ہے۔

پرکار صفت در انتقال خویشم سرگشتہ تراز پئے وصال خویشم
آئینہ حیرت خیال خویشم خاموش ز حسن ذوالجلال خویشم

ز خاموشی بہ تنگ آمد دلم ہے نالہ فریادے ز سوز حسن خاکستر شدم ائے گریہ امدادے

مست چشم پر خمار یک پر بزدے شدم پائے بند صد جنوں از سرو آزادے شدم
نالہ را بر سر بام تور سیدن ندھم رشک را لذت راہ تو جشیدن ندھم
شکر اللہ کہ سوئے خامہ ممور و وصال دیگر اس عاشق بیچارہ گزر پیدا کرد

ان کے بارے میں یہ بھی پتہ نہ چل سکا کہ اس جہان فانی کو کب خیر باد کہا۔

لالہ بساون لال۔ مخطوظ

لالہ بساون لال تربیت یافتہ مسرت کے تھے اور حضرت سرور کے چچا زاد بھائی تھے۔
خدا نے آپ کو ذہن رسا اور خیال فلک پیماعطا کیا تھا۔ اپنی طباعی اور متانت کے بدولت فن
شعر میں ممتاز سمجھے جلتے تھے۔ آپ کا مکان محلہ مسجد گنج میں تھا اور ذی علم و ہوشیار منشی تھے۔
افسوس کہ عمر نے وفا نہیں کی عین جوانی میں قصا کر گئے۔ دوستوں کو اس جو انمردی کا بڑا غم ہوا کاش
زندہ رہ کر غریبی کو پہنچتے تو مسرت کے قائم مقام ہوتے۔ استاد کے تخلص کی معنوی رعایت
سے شاگرد کا تخلص مخطوظ مقرر ہوا مگر جب بساون لال کو سزاوار نہ ہوا تو مسرت نے تخلص مذکور

اپنے فرزند ارجمند لکھی نرائن کو دیدیا۔ غالباً مولوی صلیح الدین میاں نے لکھی نرائن ہی کو عادن لال (بسان لال) عرفیت دے کر تخلص بھی دیدیا اگرچہ یہ دونوں شاعر الگ الگ ہیں مگر تخلص ایک ہی ہے۔ بسا و ن لال محظوظ مسرت کے چچا زاد بھائی اور لکھی نرائن محظوظ فرزند تھے۔ خود مسرت نے لالہ بسا و ن لال کی جواں مرگی پر رباعی لکھی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ بسا و ن لال محظوظ اور لکھی نرائن دو علیحدہ شاعر ہوتے ہیں۔

رباعی

موزوں طبع یک برادر م محظوظ کہ از دولت علم خاطرش بس محظوظ
در عین جوانی کہ ز عالم بگذشت فریاد و فغاں زیں فلک نامحوظ
لالہ بسا و ن لال کا ایک شعر دستیاب ہوا ہے جو تحریر کیا جاتا ہے۔
اے چہ کر دیم کہ دامن بکشیدی ازما آرمیدی بہ بر غیر در میدی ازما

لکھی نرائن محظوظ

شاعر بے مثل عبوس رائے مسرت کے فرزند تھے اور ان کی آغوش میں تربیت پائی اور اپنے والد ہی سے آستاب علم کیا اپنے والد کی جیات ہی میں شہرت یافتہ ہو چکے تھے۔ مگر تقدیر بھی والد کی سی پائی تھی۔ سرکاری ملازمت پر تقرر ہو گیا اپنی شوریدہ سری سے ترک کر دی۔ سب سے بڑا المیہ یہ ہوا کہ مسرت کا علمی ذخیرہ دیوانگی کے ہاتھوں تباہ کر دیا عمر طویل پائی تھی مگر اسی حالت میں قضا آئی۔ چند اشعار بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں جو بزبان فارسی ہیں۔

چشمش قتل عاشقاں باشد تنہا کیطرت یکسو نگہ خنجر بکف قرگاں صفت آرا کیطرت
بہر دل بیچارہ ام دارد نزع در میاں ہنودی خالش یکطرف زلف جلیپا یکطرف
آن کلعدار سر و قد چوں شد بہ گلشن جلوہ گر گل شد پشیاں یکطرف سر و قد آرا کیطرت

محظوظ از زلف و رخ آن دلربا در حیرتم
شب جلوہ دارد یکطرف در جلوہ بیضا کیطرت
ز جوش آمد ہولی شد ہفت آسماں رنگیں زیں رنگیں زمان رنگیں مکین رنگیں مکان رنگیں

مصور گر کشد نقشے دروئے حیرت انگیزی
من بدل دلام خیالی کلفدار خویش را
مردم سوز غم عشقت زلفت از سینه ام
ہر کہ بجام دل کنند بادہ دکشائے او
جہاد صورت او صورت تصویرنی گردد
در بغل دارم بزنگ بو بہار خویش را
کردہ ام از دل غم دل شمع مزار خویش را
بر سر سنگ می زند جام جہاں نمائے او

منشی نندکنوار۔ نیاز

لالہ نندکنوار۔ نیاز شاہجہانپور کے ذی وقعت اور خوش وقار کالیستھوں میں تھے۔ علاوہ خاندانی شرافت و عزت کے آپ خود بھی وجاہت ظاہری میں حزب المثل اور مشہور تھے۔ صورت کی طرح سیرت بھی قابل تعریف تھی یہ تو ظاہر ہے کہ فارسی اچھی جانتے ہوں گے۔ آپ کو شاعری کا بھی شوق تھا۔ کس کے شاگرد تھے یہ نہیں معلوم مگر لالہ نندکنوار سرور کے زمانے میں موجود تھے۔ کیا عجب ہے کہ انھیں کے تربیت یافتہ ہوں چند شعر بطور نمونہ تحریر کر دیئے ہیں۔

کہانی گلبدن یارب دریں گلشن گزر دارد
خون شد برنگ غنچہ بلب گفتگو مرا
چوں چاک شانہ زخم دلم بہ نمی شود
در انتظار جلوہ موج خرام تو
کہ شبم از وداع رنگ گلہا چشم تر دارد
وصف دہان تنگ تو شد آرزو مرا
از تار زلف کیست امی در فومرا
دریا ہزار چشم بود از جباب ہا

مولوی قطب الدین طالب

راقم الحروف کو فخر شاہجہانپور حضرت طالب کے حالات زندگی ایک قلمی مخطوطہ میں دستیاب ہوئے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

مولوی محمد قطب الدین خاں صاحب مرحوم و مغفور خلف محمد وزیر خاں صاحب ولد محمد امیر خاں صاحب ابن مناں خاں صاحب پسر محمد خاں صاحب بن شاہ بیگ خاں صاحب

خلعت اللہ بخش خاں صاحب ہمند۔ اللہ بخش خاں صاحب زمانہ آبادی شاہجہاںپور میں جو ۱۰۵۶ھ میں آباد ہو رہا تھا ولایت کابل سے شاہجہاںپور آکر آباد ہوئے تھے۔ وہ اور ان کے بیٹے شاہ بیگ خاں اور ان کے پوتے محمد خاں فنون سپاہ گری میں کامل تھے۔ محمد خاں صاحب کے فرزند مناں خاں صاحب ذی علم و قابل اشخاص میں شمار کئے جاتے تھے۔ مناں خاں کے بیٹے امیر خاں تھے علوم عربی و فارسی کے ماہر تھے ان کے صاحبزادے وزیر خاں عالم متبحر اور علوم متنوعہ کے ماہر خط نسخ، نستعلیق میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے چنانچہ خط نسخ میں ایک دلائل الخیرات شریف ان کے قلم کی لکھی ہوئی جس کا ترجمہ بھی بزبان فارسی خود ہی کیا تھا اور اسے دلائل الخیرات شریف کے بین السطور میں تحریر کیا تھا۔ اس سے ان کی خوشنویسی کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔ دلائل الخیرات شریف کے اختتام پر تاریخ اختتام تحریر یازدہم محرم الحرام ۱۲۳۵ھ مرقوم ہے اور خاتمہ پر محمد وزیر خاں صاحب نے اپنے قلم سے اس کا تحریر کرنا لکھا ہے۔ محمد قطب الدین خاں صاحب نے ان فنون کو اپنے والد سے سیکھا تھا۔ مولوی محمد قطب الدین خاں صاحب ۱۲۰۸ھ مطابق ۱۷۹۳ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم عربی اپنے والد صاحب سے اور انتہائی تعلیم مولوی محمد بہا الدین صاحب قبل مرحوم جو محلہ جھنڈا کلاں ملاخیل کے رہنے والے اور حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ دہلوی کے شاگرد رشید تھے سے حاصل کی اور فارسی کی قابلیت مولوی محمد کاظم خاں صاحب ہمند جو مولوی قطب الدین خاں صاحب کے ہم محلہ تھے اور زبان فارسی کی تحقیق نکات و دقائق میں مرد کامل تھے اور فارسی کو ترکیبِ نحو کا لباس خاص مولوی محمد کاظم خاں صاحب مرحوم نے پہنایا اور اس علم کو مثل دریا کے بہا یا ان کے فیضانِ تعلیم سے صد ہا اشخاص زبان فارسی کی نحو کے عالم ہو گئے۔ ان سے اچھا جاننے والا ان کے زمانے میں کوئی کم نکلتا اس واسطے مولوی محمد قطب الدین خاں صاحب کی عربی و فارسی کی استعداد عالمانہ تھی۔ عالم باعمل تھے زہد و تقویٰ اور پرہیزگاری کے جادہ سے کبھی قدم باہر نہیں رکھا۔ فن سپہ گری سے خوب واقف تھے۔ ورزش جو آغاز شباب سے شروع کی تھی تا دم مرگ ورزش معتدل ترک نہیں ہوئی۔ تمام جسم ان کا پہلو انا نہ، راست قامت پورا قد دو گز سے زائد مگر نہایت سڈول تھا۔ نہایت منکسر المزاج اور حلیم کم سخن کبھی باواز بلند بات کرتے ہوئے نہیں سنا۔ علاوہ علوم فارسی و عربی و نجوم و رمل کے سنسکرت اور بھاشا کے ماہر تھے۔ ملک محمد جاسی کی 'پدماوت' جو تصوف میں زبان بھاشا میں ہے اور زبان بھاشا بھی سخت بھاشا، اس کو اکثر اہل مذاق کو پڑھاتے تھے اور اس کے مطالب صوفیہ کے طریقے پر سمجھاتے تھے۔

جس سے اہل مزق تصوف وجد کے عالم میں آجاتے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ تصوف فقر کے مقامات بھی طے کئے ہوئے ہیں مگر اظہار اس کا کبھی کسی پر نہیں ہونے دیا معاشرت اپنی خاص اہل دنیا کی مانند رکھی۔ پختگی وضع یہ تھی کہ پنجشنبہ کو ہمیشہ خط بنوایا۔ ابتدائے عمر میں کچھ مدت ملازمت کا مشغلہ رہا۔ غدر کے بعد سے خانہ نشیں ہو گئے۔ اکثر شرفا شہرا اپنے لڑکوں کو مولوی صاحب کی خدمت میں سپرد کرتے تھے۔ مکان پر ان کو تعلیم دیتے تھے۔ محلہ میں منشی محمد علی صاحب ایک بڑے قابل آدمی رہتے تھے ان سے کمال یارانہ تھا ان کے ایک صاحبزادے تھے شیخ اکبر علی منشی محمد علی صاحب کا جب انتقال ہو گیا تو منشی اکبر علی صاحب بہت کم سن تھے۔ وضع داری مقتضی اس کی ہوئی کہ منشی اکبر علی کی تعلیم و تربیت اپنے ذمہ لے لی اور اولاد سے زائد ان سے محبت کی مولوی صاحب مرحوم کی تعلیم سے وہ ایک نہایت قابل اور اس زمانے کے لوگوں میں مرد کامل تھے۔ ملازمت سرکار انگریزی اختیار کی اپنی قابلیت کے اعتبار سے ترقیاں پاتے پاتے اس زمانے میں ملازمت کا معراج کمال ہندوستانوں کے واسطے عہدہ تحصیلداری تھا چنانچہ مراد آباد کے تحصیلدار ہو گئے۔ زمانہ تحصیلداری میں یکایک خبر ان کے انتقال کی آئی جس کا صدمہ مولوی صاحب کو کسی طرح حقیقی اولاد سے کم نہیں ہوا۔ منشی اکبر علی صاحب کی موت کی نسبت متفقہ روایت یہ مشہور ہوئی کہ انھوں نے خودکشی کی اس پر مولوی صاحب کو اور بھی صدمہ تھا کہ خودکشی گناہ کبیرہ ہے۔ جب کبھی منشی اکبر علی صاحب کا ذکر آتا تو فوراً خاموش ہو جاتے اور کچھ دیر کے بعد ایک آہ سرد بھر کر فرماتے، اکبر علی اللہ تمھاری مغفرت کرے اگر تم نے خودکشی کی ہے تو تم باری تعالیٰ کے سخت گنہگار ہو۔ اب اس سے زیادہ کیا پاس وضع ہوگا کہ منشی اکبر علی صاحب کی دنیاوی اصلاح و تربیت مثل حقیقی بزرگوں کے کی اور مرنے پر عقبی بخیر ہونے کی دعا کی۔ منشی اکبر علی صاحب کے دار بڑے خوشخط تھے۔ صد ہا کتابیں اپنے ہاتھ سے لکھیں چنانچہ جو نسخے منشی اکبر علی کے والد کے لکھے ہوئے منشی اکبر علی کے پاس تھے ان میں سے اکثر کتابیں اکبر علی نے مولوی صاحب کو دی تھیں ان پر مولوی صاحب نے لکھا کہ اکبر علی بمن لطف نمود، اکبر علی بمن عنایت نمودند، اس سے مولوی صاحب کی تہذیب و متانت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مولوی صاحب خود بھی بڑے کاتب تھے اور شبانہ روز کا یہی مشغلہ تھا خوشخط تو نہ تھے مگر ما بقرا خط کتابی نہایت پاکیزہ تھا۔ صد ہا کتابیں مولوی صاحب نے بھی لکھ ڈالیں۔ کتاب کے جلد نہایت عمدہ باندھتے تھے چنانچہ اپنی تمام کتابوں کی جلد اپنے ہاتھ سے باندھا کرتے تھے۔

شطرنج میں کمال حاصل تھا۔ بہت کم ایسے شاطر ہوں گے۔ مولوی صاحب نے ایک مختصر رسالہ بھی اس فن میں لکھا تھا جس میں بساط شطرنج کا نقشہ اور اس فن کے رموز و دقائق زبان فارسی میں لکھے تھے علم نباتات بہت اچھا جانتے تھے۔

مولوی قطب الدین خاں صاحب کا ۱۶ شعبان ۱۲۰۵ھ روز یکشنبہ بوقت عشا انتقال ہوا۔ آپ کے دو صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تھیں۔ بڑے صاحبزادے عین عالم شباب قبل از غدر انتقال کر گئے۔ آپ کے چھوٹے صاحبزادے عنایت اللہ خاں صاحب مولوی صاحب کی وفات کے تھوڑے ہی مدت بعد جوانی میں رحلت فرما گئے۔ مولوی صاحب کی اکثر تصنیفات صنائع ہو گئیں صرف ترجمہ ہدایت الماعی، تصنیف شیخ حسین کشمیری جس میں شریعت کے موافق طریقت کے تمام مدارج اور مراتب درج ہیں اور یہ کتب فارسی زبان میں ہے ۱۲۸۶ھ میں حاجی حسن علی صاحب نے مولوی نظام الدین صاحب عرف ملا نظام صاحب مرحوم کو جو مشاہیر علمائے شاہجہانپور سے تھے واسطے ترجمے کے دی تھی۔ ملا صاحب نے بوجہ علالت خود مولوی قطب الدین خاں صاحب کو دے کر فرمائش ترجمہ کی فرمائی چنانچہ مولوی صاحب ممدوح نے کمال خوبی سے اور نہایت سلیس اردو میں اس کا ترجمہ فرمایا ہے جو ۱۲۹۰ھ میں مطبع صدیقی بریلی میں طبع ہو کر شائع ہوئی۔ ایک لغات القرآن مولوی صاحب کی تصنیف سے ہے جس میں جو لفظ قرآن کے ڈھونڈھو با محاورہ معنی اس کے ملیں گے مگر یہ لغات طبع نہ ہو سکی۔ کلام اردو فارسی کے مسودات برباد ہو گئے۔ اگر کل کلام موجود ہوتا تو ذخیرہ معقول ہوتا مولوی صاحب کی خدمت میں جب ان کا کوئی شاگرد غزل لے کر اصلاح کے واسطے حاضر ہوتا تو ہر اصلاح کے وجوہ اور جس لفظ کو نکالتے اس کے وجوہ اور جو لفظ شامل کرتے اس کے وجوہ بہت وضاحت سے بیان فرماتے۔ اپنے کلام میں پرانے محاورات کو جو ان کے معاصر اکثر استعمال کرتے تھے آپ ان کو ترک کر دیتے تھے۔ فن شاعری کے نکات بڑی خوبی سے بیان فرماتے تھے زبان بھاشا میں بھی نظم فرماتے تھے مگر افسوس کہ اس میں سے کچھ بھی موجود نہیں ہے۔ یہاں ان کا کچھ کلام ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔

مولوی قطب الدین خاں صاحب شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں تھے اپنی ذاتی لیاقت سے اس فن میں کمال حاصل کیا تھا۔

غزل

گرم کر دیتا ہے دل کو بے سُرخ جانانہ باغ ہے ہمارے واسطے گویا کہ آتش خانہ باغ
تیر جاتے ہی ہوا کچھ اور ہی آنکھوں کل رنگ باغ ویرانہ نظر آتا ہے اور ویرانہ باغ

سیر گلشن کی نہ خواہش ہے نہ سبزہ کی ہوس
سنبل و گل، زنگوں بادام و سیب اس میں ہیں جمع
سیر گلشن کی نہ دو تکلیف ہم کو دوستو
آہ کیا دن تھے جو یہ ساتوں میسر تھے ہمیں
اپنے سینے میں بنا رکھا ہے ہم نے خانہ باغ
لکھدیا میں نے رُخِ دبر کو بے باکانہ باغ
ہم سے میخواروں کو ہے صحن درمیانہ باغ
سیخ و شاہد، مطرب سے ساقی و میخانہ باغ
جب سے دیکھی ہے تمھارے رونے رنگیں کی بہار
بے حقیقت جانتا ہے طالب دیوانہ باغ

غزل

بے وفائی کے فن میں جو ہیں طاق
تم سا کوئی نظر نہیں آیا
فصلِ گل کی کسے خوشی، اپنا
کیا ہی ہم ہو گئے ہیں زار و نجیف
حضرت دل اسی کے، میں مشتاق
دلربائی میں شہرہ آفاق
زندگی کا حساب ہے بے باق
کیسے ہم تندرست تھے اور چاق

جس کے طالب ہو پاس ہے طالب
کس لئے ڈھونڈتے ہو تم آفاق

ریختی

بھاتا ہی نہیں ہم کو یہ گھر بار نگوڑا
اتا ہمیں ویرانے کی کچھ سیر کرالا
واری، ترے واری تو اسے دیکھ تو آکر
معلوم یہ ہوتا ہے کہ عاشق ہے کسی کا
جس کے لئے جاتی ہے میری جان پاری
جانا تھا جسے ہم نے وفادار وہ نکلا
جب سے کہ پڑھا عشق کا طومار نگوڑا
بن یار کے دوزخ ہے یہ گلزار نگوڑا
مدت سے تڑپتا ہے یہ بیمار نگوڑا
کس درد سے پڑھتا ہے یہ اشعار نگوڑا
خواب ہی میں دکھا جائے وہ دیدار نگوڑا
بے رحم، ستم گار، دلازار نگوڑا

طالب کو بوا تم نے جو چھیڑا ہے بہت سا
مر جائے نہ دہلیز سے سر مار نگوڑا

منشی شیخ رفعت علی - رفعت

منشی شیخ رفعت علی رفعت خلف منشی امیر علی بن شیخ اجیالے ابن شیخ عبداللہ کے مورثوں کا آبائی وطن ضلع ہردوئی موضع راجھاتھا۔ منشی شیخ عبداللہ راجھا سے ترک سکونت کر کے شاہجہانپور آئے اور محلہ گاڑی پورہ میں قیام کیا۔ معلمی کا پیشہ اختیار کیا اور امر او شرفا شہر کے بچوں کو تعلیم دینے میں عمر بسر کر دی۔ تقدیر اچھی تھی شیخ عبداللہ کے پوتے شیخ امیر علی معلمی سے ترقی کرتے ہوئے تحصیلداری کے اعلیٰ عہدے تک پہنچے تھے کہ غدر کا ہنگامہ قیامت خیز اٹھا۔ انگریزوں کی وفاداری کے انعام میں بڑی بڑی جاگیریں ملیں اور تحصیلدار سے ڈپٹی کلکٹر پسیلی بھیت ہو گئے۔ منشی رفعت علی کی ولادت پسیلی بھیت میں ہوئی تعلیم کا زمانہ شروع ہوا تو اولاً آپ نے اپنے والد سے کتب درسیہ فارسی پڑھیں بعدہ کوئی بزرگ ایرانی نژاد اتفاق سے کسی مقدمہ میں ماخوذ ہو کر آگئے اور بعد رہائی شیخ امیر علی کی خواہش پر منشی رفعت علی کو فارسی پڑھانے لگے۔ اس صورت میں کہا جاسکتا ہے کہ رفعت علی نے فارسی کی تکمیل مرزا غالب کی طرح خاص ایرانی کی شاگردی سے کی جس کی زبان مادری فارسی تھی علم عربی کی تکمیل تو نہیں ہو سکی مگر ابتدائی درسی کتابیں پڑھی تھیں اور معمولاً صرف و نحو وغیرہ سے واقف تھے۔ منشی رفعت علی کی طبیعت بڑی ذہین اور مضمون آفرین تھی۔ مکتب سے علیحدہ ہوئے تو شعر کہنے لگے۔ اس مشغلہ کے سامنے ان کو کوئی کام اچھا معلوم ہی نہیں ہوتا تھا تمام عمر غربت سے یہی کیا اور اسی میں مر گئے۔ آغاز ہی سے ایسا شعر کہا کہ صاحب علم سامعین کو سن کر حیرت ہوتی تھی جب مشق سخن بڑھی تو فرید العصر ہوئے اور نزدیک و دور مشہور ہو کر داد سخن پانے لگے۔ شاہجہانپور میں تو کوئی اس زمانے میں فارسی گو استاد موجود نہیں تھا۔ نواب غلام حسین خاں خلد آشتیاں ہو چکے تھے۔ منشی رفعت علی کا قیام شاہجہانپور میں تھا جب کبھی پسیلی بھیت کو جاتے تو قاضی ممتاز حسین ممتاز سے مل کر لطف صحبت اٹھاتے تھے قاضی صاحب اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ شیخ امیر علی کا ذاتی اعزاز قائم تھا ان کی خیر خواہی دیکھنے والے انگریزی حکام موجود تھے اس لئے منشی رفعت علی کی ملازمت حاصل کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی سب سے پہلے ضلع بریلی میں سب انسپکٹر پولیس۔ پھر ہوشنگ آباد میں ڈپٹی کلرک آف دی کورٹ۔ شاہجہانپور میں ضلع جوہانپور میں سررشتہ دار کلکٹری اور تحصیلدار ضلع گورکھپور میں تحصیلدار اور کچھ دن ڈپٹی کلکٹر رہے مگر یہ سب ملازمتیں چند روزہ تھیں کسی عہدہ

پر دو تین برس بھی رہنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ باپ کے اعزاز سے عزت یافتہ تھے جہاں گئے تقرر ہو گیا۔ منشی رفعت علی اپنے باپ کے زمانہ دولتمندی میں پیدا ہوئے۔ جب منشی امیر علی کا ۱۸۷۳ء میں انتقال ہوا تو آبائی زمینداری و املاک و مکانات کا حصہ پایا۔ رفعت علی امارت اور دولت کا لطف اٹھانے لگے۔ امیرانہ ٹھاٹھ سے رہتے اور مشغلہ سخن گوئی سے جی بہلاتے تھے۔ طبیعت میں ہر قسم کا شوق تھا اچھا کھاتے اور اچھا پہنتے تھے۔ جہاں نوازی اور احباب پرستی طبیعت ثانیہ تھی جو مرتے دم تک ساتھ رہی۔ کلام فارسی پڑھنے کے لئے ایرانی لہجہ کی ضرورت ہوئی تو آپ نے وہی لہجہ گلے میں پیدا کیا۔ مشاعرہ میں جب کوئی غزل لہجہ ایرانی میں پڑھتے تھے تو سامعین کو بہت اچھا معلوم ہوتا تھا۔ شوق ملازمت سے دستکش ہو کر جب شیخ صاحب وطن میں عزت گزریں ہوئے تو عیش پسند طبیعت سے بیکار نہ رہا گیا۔ ہر قسم کے عیش و راحت کے سامان جمع کر لئے۔

وطن میں رہ کر دستگی کے لئے میونسپلٹی شاہجہانپور کے ممبر اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے سکریٹری بھی ہو گئے۔ آنریری مجسٹریٹ بھی تھے اور ہر کام کو شیخ صاحب نے خوبی اور نیکنامی سے انجام دیا۔ چند سال کے بعد جی بھر گیا اور ان ذمہ داریوں سے دستکش ہو گئے مگر شاعری تادم مرگ نہیں چھوٹی۔ زمانے کی ضرورتوں کا لحاظ کر کے انگریزی پڑھنے کا شوق پیدا ہوا چنانچہ محنت سے پڑھ لی اور ذہانت سے اتنی قابلیت پیدا کر لی کہ بلا تکلف پڑھ لکھ اور روانی سے بول لیتے تھے۔ منشی جی نہایت خلیق اور فراخ دست اور خوش بیان تھے ان کی صحبت نشست ایسی دلچسپ تھی کہ جو شخص اس میں شریک ہوتا خوش ہو جاتا تھا یہاں تک کہ بیٹھنے والے کا وہاں سے اٹھ کر جانے کو جی نہیں چاہتا یہی خواہش رہتی کہ بیٹھے رہو اور باتیں سُننے جاؤ۔

شعر و سخن کے جلسوں میں شریک ہو کر اور حسب موقع نظمیں پڑھ کر شیخ صاحب نے اچھی داد سخن پائی ہم عصر اساتذہ فارسی گو قریب قریب سمجھی آپ کو جانتے اور قدر کرتے تھے منشی خواجہ غلام غوث خاں بیخبر آپ کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ خواجہ عزیز الدین عزیز لکنوی۔ نواب عبدالعزیز خاں عزیز بریلوی۔ منشی فضل رب عرشی حیدرآبادی۔ حافظ خان محمد خان شہیر بھوپالی مولوی فیض الحسن لاہوری۔ مولوی عبدالغفار خاں نساخ بنگالی۔ آغا سفیر ایرانی۔ مولوی محمد شبلی نعمانی ان سب کے دلوں میں آپ کی شاعری کی قدر و منزلت تھی اور فاضلانہ وقار تھا۔ ۱۸۷۵ء سے ۱۸۸۰ء تک یا کچھ بعد تک شاہجہانپور میں مولوی محمد طاہر عرف موتی میاں کے مکان پر مشاعرے ہوتے رہے ہیں۔ شہر کے تمام شعراء شریک ہوتے اور کبھی کبھی باہر سے بھی آجاتے تھے موتی میاں

کو منشی رفعت علی سے خصوصیت تھی اسی لئے فارسی کی طرح دے کر وہ منشی صاحب کو بھی شریک کرتے تھے۔ خواجہ عزیز الدین۔ نواب عبدالعزیز خاں۔ قاضی ممتاز حسین بھی خصوصی طور پر بلوائے جاتے تھے غرض یہ کہ مشاعرہ دھوم دھام سے ہو جاتا تھا ان جلسوں میں شیخ صاحب نے اردو میں بھی اپنا کلام سنایا ہے۔ منشی صاحب اپنے مکان پر بھی صحبت مشاعرہ کرتے تھے بارہا ایسا ہوا کہ شعر امر نامی میں سے جب کوئی پہنچا اس کو انھوں نے بمنت روک لیا اور بریلی پہلی بھیت لکھنؤ وغیرہ کو تار دے دیئے شاعر آگئے اور لطف سخن دے کر رخصت ہو گئے۔ ہمانوں کو بڑی کشادہ ملی اور محبت سے کھانا کھلاتے تھے ہر قسم کے اچار مڑتے حلوائے۔ چٹنیاں وغیرہ موجود رہتے تھے اور معزز ہمانوں کے روبرو تکلف سے رکھے جاتے تھے۔

شیخ صاحب کو پرانی قلمی کتابوں اور نادر تصانیف کے جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔ اس شوق میں انھوں نے بڑا سرمایہ صرف کیا اور جس قیمت اور جس کوشش سے کتاب ملی حاصل کی۔ آپ کا کتب خانہ قابل دید تھا ایسی ایسی نظر فریب خوش خط اور نایاب کتابیں تھیں کہ شاہی کتب خانوں کے سوا اور جگہ نظر نہیں آسکتی تھیں۔ افسوس صد افسوس کہ یہ نادر و نایاب ذخیرہ کتب و رشاد کی جہالت اور بے علمی کا شکار ہو کر بالکل تباہ و برباد ہو گیا۔ منشی صاحب مرض استسقا میں مبتلا ہو کر چند روز میں انتقال فرما گئے۔ رحلت ۱۹ جولائی ۱۹۰۷ء مطابق ماہ ربیع الاول ۱۳۱۸ھ کو ہوئی وہ دیوان خانہ جو ہمانوں سے بھرا رہتا تھا ان کے مرتے ہی ویران ہو گیا۔

رہنے والے گئے جو سوے عدم

خاک اڑنے لگی مکانوں میں

آپ کی قبر شاہ محمد اسحاق میاں صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے جوار میں جانب مشرق متصل مزار بابا گو جرحمۃ اللہ علیہ ہے۔

نمونہ کلام فارسی منشی رفعت علی رفعت

چشم برداز سینہ دل نالہ کنال را این باز بر آواز زندہ ہید نہاں را

عجز از من جو از تو گرفتند و سرشتند تا خلق نمودند زہیں را و زماں را

رفعت زد کم تاب توں بردنگا ہش این دزد تہی کرد ازیں جنس دکان را

گہ زدل گہ از جگر بر زندنا سورما سکہ مہر آسا بہر کشور زندنا سورما
از خیال روئے آن حور است دل باغ ارم غوطہ ہادر چشمہ کوثر زندنا سورما
حضرت رفعت مرحوم کو اگرچہ اردو سے کچھ طبعی شوق نہیں تھا اور نہ انہوں نے ادھر کچھ توجہ فرمائی مگر
مولوی محمد طاہر عرف موتی میاں ساکن محلہ خیائیل کے مکان پر جب مشاعرہ ہوتا تھا تو ارباب
محبت کے اصرار پر اردو میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ اردو کلام منشی صاحب کی فارسی گوئی کے
مقابلے کا ہرگز نہیں ہے مگر نیافت طبع کے لئے کلام اردو بھی درج کیا جاتا ہے۔

ہ آیا فرق جب تیغ کستم کی آبداری میں تو پھر ائے آہ کیا خوبی ہے تیری شعلہ باری میں
خیال کا گل شہزنگ جاناں سے نہیں باقی سر موزق سر میں اور سپیرے کی پیٹاری میں

دیکھ سکتے نہیں عدے جگہ انگاروں کے منہ پھر رہتے ہیں اتنے لئے سو فاروں کے
حدم لب مسی۔ سرمہ ہے منظور نظر بخت دینداروں کے اچھے ہیں سیہ کاروں کے
رحم لے نالہ شب ہجر میں کر انجسہم پر سونے والے ہیں یہ افلاک کے گہواروں کے

دیکھا جب اس گل کو داغ دل پہ سُرخ آگئی اشرفی قسمت سے پائی دولت دیدار میں
قم باذنی حق میں مردوں کے بے ٹھوکر آپ کی جو ہر گفتار پیدا ہو گئے رفتار میں
رفعت صاحب کو اقسام سخن پر عبور تھا۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ہر صنف سخن پر
طبع آزمائی کی ہے بخیاں طوالت نمونے تحریر نہیں کئے جا رہے ورنہ ناظرین فیصلہ کرتے کہ وہ
کس مرتبہ کے فن کار تھے۔ نثر نویسی میں بھی منشی صاحب کا بلند مرتبہ تھا ۱۸۹۵ء میں جب کہ
شاہجہانپور میں ایجوکیشنل کانفرنس علیگڑھ کا سالانہ جلسہ ہوا تھا ایک خط بزبان فارسی حضرت
رفعت مرحوم نے سر سید احمد خاں بہادر مغفور کو بطریق دعوت نامہ جلسہ مذکور لکھ کر بھیجا تھا۔ یہ
نامہ ۱۸۹۵ء کا لکھا ہوا اور مرقع عالم پریس ہردوئی کا چھپا ہوا تھا۔ مولانا محمد شبلی نعمانی کو
شیخ رفعت علی سے ارتباط قلبی تھا اور چون کہ مولانا کی چند تصانیف منظوم بزبان فارسی اس وقت
شائع ہو چکی تھیں اور قبولیت عام کی سند پا چکی تھیں اس لئے حضرت رفعت کو خط نویسی میں
جس کی پیشی ایک بڑے قابل اور کامل الفہم شخص کے سامنے ہونے والی تھی اپنی پوری قابلیت
بالمقابلہ صرف کر دینا پڑی چنانچہ طرز تحریر اور وضع عبارت سے وہ خط بلاغت کا گنجینہ تھا۔ منشی صاحب

کوثر نویسی پر بھی پورا عبور حاصل تھا۔ ایک مجموعہ نثر کا منقوطہ۔ غیر منقوطہ۔ بلا آئین کش الفاظ عربیہ عاری۔ مسجع۔ مقفی۔ مرصع انھوں نے چھوڑا تھا جس کا اب کہیں نشان نہیں ملتا۔

منشی صاحب نے ابتدا میں اپنا کلام اپنے والد منشی امیر علی کو دکھلایا بعدہ قاضی ممتاز حسین ممتاز سے مشورہ سخن کیا جب مشق سخن میں اضافہ ہوا اور خود اعتمادی پیدا ہو گئی تو خود اساتذہ میں شامل ہو گئے۔ طباع و ذہین تھے۔ اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ نظیری و انوری، صائب و علی و غنی وغیرہ کے ہم سخن ہوں۔ یہ ضرور کہنا پڑے گا کہ وہ فخر شاہ بہمانپور تھے کلام ان کا با معنی اور گراں وزن ہوتا تھا جب ایرانی لہجہ سے پڑھتے تھے تو سامعین کو مزہ حاصل ہو جاتا تھا۔ پڑگو بھی بہت تھے قلم اٹھاتے تھے تو دو منزلہ سے چہار منزلہ تک لکھ جاتے تھے۔ مشکل مشکل زمینیں ان کی روانی فکر کے سامنے پانی تھیں۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

منشی سوہن لال حقیر

آپ کے والد ماجد لالہ ہزاری لال ایک صوفی پیش بزرگ تھے۔ اس خاندان میں اور بھی درویش ہوئے ہیں۔ ایک عالی خاندان کا یہ تھے اور محلہ مظفر گنج کے باشندہ تھے۔ منشی سوہن لال حقیر فارسی کے عالم تھے عربی کی تعلیم مولوی محی الدین خاں سے حاصل کی تھی۔ قرآن کریم مع ترجمہ پڑھا تھا اور روزانہ اس کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں تھے موزون نئی طبع اور مشق سے اچھے شاعروں میں شمار تھا۔ کچھری کلکری شاہ بہمانپور میں محافظ دفتر تھے۔ پنشن کے بعد تقریباً بیس سال زندہ رہے۔ حقیر کے جوان فرزند راجہ بہادر ایم۔ اے منصف کے فوت ہو جانے سے نملگین رہتے تھے اپنے بیٹے کا مرثیہ بھی لکھا تھا اور آخر ستمبر ۱۹۱۶ء میں انتقال ہوا۔ آپ کے پوتے بابو بر جناح مختار عدالت و آنریری میجسٹریٹ مشہور مختاروں میں تھے اور اپنے پیشے میں بہت کامیاب تھے۔ مولف تاریخ مطبع نے حقیر کو اردو شاعری میں حافظ بدھن خاں تائب کا شاگرد ہونا لکھا ہے۔

نمونہ کلام فارسی

مرگ روز عید و وصل است اے حقیر کو ز قید آزاد سازد بالیقین

آنانکہ خود نماز ادا رو بر کنند
از آب چشم مردک آسا وضو کنند
شب شد سحر حقیر چو در انتظار یار
چوں صبح شد ز باد صبا گفتگو کنند
اردو کا صرف ایک شعر دستیاب ہو سکا جو مولف تاریخ صبیح نے نقل کیا جس کو یہاں درج کرتا ہوں۔
میں اپنے جرم کے صدقہ اُمید بر آئی
طلب کیا مجھے سرکار نے سزا کے لئے

قاری شیخ بہادر علی قاری

آپ کے والد ماجد کا نام شیخ فقیر محمد محلہ محمد ذئی کے ساکن اور فن قرأت میں کامل تھے۔ آپ نے چند رسالے فن قرأت عربی میں لکھے تھے۔ اوائل عمری سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ ابتداء میں حافظ نثار احمد عرف حافظ بدھن خاں تائب اور جناب محمد علی میاں خیال سے مشورہ سخن کیا بعدہ سیدنا من علی جلال لکھنوی کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہو گئے۔ انتقال کو لگ بھگ سو سال ہو گئے ۱۳۰۳ھ میں رحلت فرمائی وفات سے کچھ قبل احباب نے کہا قاری صاحب اب تو مضمون شاعری کی طرف خیال نہ ہو گا آپ نے آنکھیں کھول دیں اور آبدیدہ ہو کر فرمایا۔

جب تک ہے نسیم دم قاری چمن آرا
گلزار سخن صرف خزاں ہو نہیں سکتا
نمونہ کلام

بہر غم عبور از کشتی دل می کند اینجا
لب ساحل دم شمشیر قاتل میکند اینجا
ز دریا سے کرم لب شمنہ وصلت کند دوری
گجا خمیازہ حسرت چو ساعل می کند اینجا
بیا قاری اگر درس از کتاب مشق میخوانی
تلاوت از سر پیارہ دل می کند اینجا

یار رادر بغل خویش کشیدم ہمہ شب
اونما گشت شب قدر کہ عیدم ہمہ شب
در نظر جادر بہتاب شب دیجور است
روئے آن غیرت خور کشیدندیدم ہمہ شب

گر مسلمان باس کفر چو شد عار نیست
تاریج ملائک رشہ ز نار نیست

معنی ہستی یہ لفظ نیستی دشوار نیست
الحذر از دام گیسوئے سیاہش الحذر
لنترانی گفتی و یوسف شدی در مصر حسن
در خط تقدیر عاشق حرف وصل یار نیست
درد بان اثر دہا و فتن کسے راکار نیست
باز میگونی مرا پیغمبری در کار نیست

کلام اردو حضرت قاری

جب سے وہ شوخ گیا چھوڑ کے تنہا ہم کو
یوں تخم رہے ہیں لخت جگر آکے آنکھ میں
گھر خوش آتا ہے نہ گلزار نہ صحرا ہم کو
ستار با ہو جیسے مسافر بعید کا

مطلع مری غزل کا رخ یار بن گیا
نقطہ نہیں تھا کوئی عدم کے حروف میں
چوٹی کا شعر کترہ طرار بن گیا
حیرت ہے کس طرح دہن یار بن گیا

سحر کا منہ نہ دکھایا تمام عمر مجھے
بُرا ہو ظلمت شام شب جدائی کا

جب سے اس کی شوخ چشتی کی تماشائی ہوئی
خانہ دل کو ہمارے پھونک دے گی ایک دن
گردکش تقدیر بھی پھرتی ہے چکرانی ہوئی
اے نگاہ شوق تیری آگ بھڑکاتی ہوئی

مژدہ اے رند خرابات کہ دخت رز پر
سُننتے ہیں حضرت داعظ کی طبیعت آئی

ٹھنڈی سانسیں جو بھریں در پہ تو فرمانے لگے
بند کمرے کو کروسرد ہوا آتی ہے

زیر تربت بھی جوش و حشت ہے
ایک دہی مرے کفن میں نہیں

ان باتوں میں چپل جا رہے گی تلوار کسی دن
ابرو سے رقیبوں کو اشارہ نہیں اچھا

اب کوئی دیکھے بگڑنا اس ستم ایجاد کا
قبر تھا آنا زباں پر شکوہ بیداد کا

حضرت قاری کے شاگردوں میں حافظ فضل احمد فضل۔ سید کمال احمد کمال۔ محمد خیرات نبی اوسج
 فرزند علی شاہ ارجمند۔ سید تصدق حسین تصدق۔ اصغر علی شاہ خیر۔ بنس گوپال دیوانہ۔ شیخ
 عنایت احمد عنایت عبدالحق بیدار۔ سید امیر احمد صوفی۔ فیض الدین مشتاق اور مظہر الحق مظہر
 غلت قاری صاحب وغیرہ تھے۔

منشی سید آل نبی فگار

سید آل نبی فگار کے اجداد بلگرام کے تھے۔ ان کے والد سید نیاز علی کچھری کلکٹری
 میں محافظ دفتر تھے اور ان کی شادی قاضی امانت علی کی بہن سے ہو گئی تھی منشی آل نبی فگار کی
 شادی بھی شاہجہانپور میں ہو جانے سے منشی نیاز علی نے شاہجہانپور میں سکونت اختیار کر لی
 اور محلہ قاضی خیل میں آباد ہو گئے۔ منشی نیاز علی کے دو فرزند سید واجد علی اور سید آل نبی
 تھے۔ ان دونوں بیٹوں کو منشی نیاز علی نے غالب کا شاگرد کر دیا تھا۔ سید واجد علی تحصیلدار
 ہو گئے تھے مگر تپدق کے موذی مرض کا شکار ہو کر دہلی میں قضا کر گئے۔ منشی نیاز علی ترقی کر کے
 ڈپٹی کلکٹر ہو گئے زمانہ غدر میں مراد آباد میں تھے مشہور ہے کہ اپنے مردانے مکان میں نماز
 پڑھ کر سلام پھیرا تو لوگوں نے مطلع کیا کہ آج اس قدر انگریز قتل کئے گئے آپ نے الحمد للہ
 فرمایا جاسوسوں نے یہ خبر انگریزوں کو پہنچادی جس پر بغاوت کا الزام عائد کر کے پھانسی
 دیدی گئی اور کل جائیداد بحق سرکار ضبط کر لی۔ منشی نیاز علی صاحب پاکیزہ خصلت انسان تھے۔
 منشی آل نبی اس کے بعد ریاست گوالیار چلے گئے اور ملازمت کر لی۔ غدر فرو ہونے کے
 بعد گورنمنٹ کے ملازم ہو گئے سب انسپکٹر پولیس رہے پھر سرشتہ دار محکمہ بندوبست
 اور اس کے بعد سرشتہ دار پولیٹیکل ایجنٹ چھاؤنی نیا گاؤں ہو گئے۔ ریاست کدورہ میں
 بھی سرکاری انتظام پر کچھ مدت کام کیا ملازمت سے سبکدوش ہو کر شاہجہانپور واپس آئے
 اور اپنے مکانات کو قبضہ گیروں سے خرید کر از سر نو تعمیر کیا کچھ ایام شاہجہانپور رہ کر ریاست
 حیدرآباد چلے گئے جہاں تعلقدار درجہ دوم پر مقرر ہو گیا۔ دس سال کے بعد ۱۳۱۱ھ میں حیدرآباد
 ہی میں آپ کا انتقال ہو گیا اور قبرستان ترب بازار میں سپرد خاک کئے گئے آپ لا ولد

فوت ہوئے تھے۔ لوگوں نے سارا مال و متاع سمیٹ لیا اسی افراتفری میں سارے کاغذات بھی تلف ہو گئے۔ آپ کے بھانجے قاضی سید محمد حسن ماموں کی موت کی خبر سن کر حیدرآباد گئے مگر سامان پہلے ہی لٹ چکا تھا۔ سید آل نبی فگار نہایت بااخلاق، خوشخو، آسودہ دل اور کم سخن انسان تھے۔ پتنگ بازی اور بٹیر بازی کا شوق تھا۔ لباس رنگین پہنتے تھے۔ شعر و شاعری کے دلدادہ تھے۔ نظم و نثر میں غالب کارنگ جھلکتا تھا۔

نمونہ کلام

گر ایک شب بھی وصل کی لذت نہاے دل
ہم اپنا حال آپ ہی کہہ کر سنا نہیں گے
ضبط فغاں فراق میں ممکن نہیں فگار

پھر کس امید پر کوئی تم سے لگائے دل
خامہ کا منہ نہیں جو کہے ماجرا سے دل
جس کو خدا خراب کرے وہ لگائے دل

متفرق اشعار

مسکرا کر جسے دیکھا سے تسخیر کیا
آنا کیوں مہر میں کفناں سے نکل کر یوسف
فکر عقبی ہے نہ کچھ خواہش دنیا دل میں

پتلیاں سحر کی رکھتی ہیں تمھاری آنکھیں
جذبہ شوق زلیخا جو نہ کامل ہوتا
ہے فقط یار کے ملنے کی تمنا دل میں

شیخ کریم بخش فرقت

شیخ کریم بخش فرقت خلیفہ شیخ خدا بخش محلہ بی بی زئی چوراہا کے ساکن تھے۔ کتبدری فارسی پڑھے ہوئے تھے۔ شعر گوئی کا شوق تھا صاحب تلامذہ تھے اور خود حافظ نثار احمد خاں تائب سے مشورہ سخن لیا تھا۔ چوڑی سازی اور معلیٰ کا کام کرتے تھے۔ کلام بقدر دودیاں تھا مگر چوری ہو گیا۔ ۳۰ ستمبر ۱۸۹۶ء مطابق ۲۱ ربیع الآخر ۱۳۱۴ھ کو راہی ملک بقا ہوئے۔

نمونہ کلام

شوخی نے کرشمہ نے شرارت نے جیانے
پھرتی تھی تری راہ طلب میں نگہ شوق
اے بخت رسا کو چہ محبوب میں لے چل

مارا مجھے ظالم تری ہر طرز ادا نے
بتلایا پتہ شوخی نقش کف پلنے
یوں خاک بیابانوں کی کب تک کوئی چھانے

دیکھی نہ راستی کبھی ترچھی نگاہ میں
وہ پیار کی نظر جو ملی تھی رقیب سے
وہ بانگین کی نوک ہے اس کجکلاہ میں
اب تک کھٹک رہی ہے ہماری نگاہ میں

دل میں محبوب ہیں اقرار خطا کرتے ہیں
کیا تم ہے کہ گنہگار ٹھہرتے ہیں ہمیں
آج پھر مجھ سے وہ پیمان وفا کرتے ہیں
تیر جب ان کی نگاہوں کے خطا کرتے ہیں
ڈریہ ہے مانگ نہ لوں ان کو خدا سے میں کہیں
اس لیے قطع مرے دست دعا کرتے ہیں

تمہیں نے کیا مرے گھر میں کبھی گزر نہ کیا
ہمارے دل کی تمنائیں مٹ بھی جائیں گی
خیال نے بھی تو بھولے سے سُخ ادھر نہ کیا
حجاب دور شب وصل بھی اگر نہ کیا

عشق بتاں کا دل کو جو کچھ حوصلہ ہوا
مانگی پناہ اہل فلک نے شب فراق
پہلے جگر نشاۓ تیر قضا ہوا
نالہ مرا جو عرش بریں تک رسا ہوا
فرقت مشاعرہ میں ملی آبروئے داد
اپنا کلام بھی گہر بے بہا ہوا

شیخ ستار بخش راقم

ستار بخش راقم کے مورث شیخ بدھو اور شیخ مناں حقیقی بھائی تھے اور آبادی شاہجہانپور کے بعد قنوج سے آکر شاہجہانپور کے محلہ خواجہ فیروز میں بس گئے تھے۔ کاغذ بنانے کا کاروبار کرتے تھے۔ حضرت راقم کے والد ماجد کا نام شیخ پیر بخش تھا آپ معلم تھے اور طبیعت موزوں پائی تھی شعر کہتے تھے۔ مولوی محمد کاظم خاں مرحوم کے شاگردوں میں داخل ہو گئے۔ استاد کی رہبری سے اچھا نام پایا۔ ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں کانپور میں اپنے فرزند کے گھر ماہِ رجب میں وفات پائی۔ خواجہ فیروز میں ان کے گھرانے کے افراد آج بھی موجود ہیں۔

نمونہ کلام۔

پایانہ زمانے میں کسی حورِ لقمانے
 بیتاب ہے بے چین، وہ گل یہ ہے بیکل
 گلشن میں کسی گل سے اگر عشق نہیں ہے
 خواہاں نہ ہو اصل کام میں شرم سے ہرگز
 کعبے میں شیخ اور کدیس میں برہمن
 عشق کرنے مجھ کو وہ کا ہیدہ کر دیا
 سینے میں درد لب پہ فغاں دل ہے بیقرار
 راقم بتوں کے عشق میں کھوئیں گے جانِ دل
 بخشا ہے وہ لے یار تجھے حسن خدا نے
 اتنا تو اثر آج دکھایا ہے دعا نے
 بے فائدہ کیوں خاک اڑائی ہے ہوا نے
 محروم ہی رکھا مجھے خود میری حیال نے
 اتر بتوں کے عشق میں دونوں کھال ہے
 ہر بال فرطِ ضعف سے تن پر وبال ہے
 اب تو فراقِ یار میں جینا محال ہے
 کر دینگے سب نثار جو کچھ پاس مال ہے

حکیم حافظ محمد معشوق علی خاں - جوہر

حکیم محمد معشوق علی خاں جوہر شاہجہاں پور کے شریف اور نامور خاندان کی نسل سے
 چمکنی پٹھان تھے۔ چمکنی گاڑی پورہ آپ ہی کے قبیلے سے مشہور اور نام زد ہے۔ والد ماجد
 کا نام محمد اصغر علی خاں تھا جو عہدہ نظارت کے ناظر جی بھی مشہور تھے جوہر صاحب
 کی ابتدائی تعلیم اچھے قاعدے اور سلیقے سے ہوئی تھی۔ پیلی بھیت میں حافظ شوکت علی
 پسر منشی امیر علی کی صحبت شاہجہانپور میں شوکت علی کے بھائی منشی رفعت علی رفعت خاں
 منشی امیر علی کی ہم نشینی اور بذلہ سخی اشرف حسین خاں کی زیر نگرانی اور تربیت یہ چن
 سلسلے ایسے تھے کہ جن سے جوہر صاحب کو فائدے پہنچے چنانچہ استعداد علی کے علاو
 معشوق علی خاں تہذیب و آداب نشست و برخاست و طریقہ گفتگو سے بخوبی
 واقف تھے جس مجلس میں بیٹھتے اپنی خوش بیانی سے اہل محفل کو اپنا گرویدہ بنا لیتے
 طبیب بھی تھے اور مطب جاری تھا مگر اس کو ذریعہ معاش کبھی نہیں بنایا۔ حضرت جوہر

کو ابتدا ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ حکیم کلن خاں وکیل کے مکان میں پریس لگا کر اخبار بھی جاری کیا مگر کامیابی نہیں ہوئی اور وطن سے نکل کر ملازمت کا سلسلہ شروع کیا۔ بہت زمانے تک وطن سے باہر رہے خوب کمایا اور خوب خرچ کیا۔ اولاً سررشتہ تعلیم میں ملازمت کی۔ پھر اودھ میں کسی ریاست میں ملازم ہوئے اور تھوڑے دنوں بعد ہی سبکدوش ہو کر ریاست بھوپال چلے گئے اور وکالت کرنے لگے۔ وہاں سے بیزار ہو کر ریاست حیدرآباد کو چلے گئے۔ اور وکالت کرتے رہے۔ اپنے وطن بھی آتے جاتے رہے۔ اردو کا شعر اچھا کہتے تھے۔ طبیعت رسا اور متین پائی تھی۔ غزل پڑھنے کا طریقہ بھی بہت اچھا تھا۔ قیام بھوپال کے زمانے میں اچھی ناموری حاصل کی وہاں ملک کے بعض مشاہیر علماء و فنکار شعراء موجود تھے ان سے ملنا جلنا مشاعروں میں شریک ہونا۔ علی جلسوں اور مذاکروں میں گفتگو کرنا۔ مباحث و تحقیق میں حصہ لینا امر کی صحبت میں بیٹھنا یہ سب کام ایسے تھے کہ جو شہرت کا باعث ہوئے۔ حضرت جوہر کو مرزا غالب دہلوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ تلامذہ غالب از مالک رام میں آپ کا ذکر موجود ہے۔ حضرت جوہر نہایت پُرگو اور زود گو تھے۔ راقم الحروف نے ان کا مجموعہ قصائد بچشم خود دیکھا ہے۔ تقریباً ہر قصیدے کے فائے پر تخریر ہے کہ قصیدہ کہنے میں کس قدر وقت صرف ہوا۔ عام طور پر نصف گھنٹہ سے ایک گھنٹہ کی مدت میں زیادہ تر قصائد موزوں کیے گئے۔ غزل کہنے کا عجیب انداز تھا۔ مشاعرے میں تشریف فرما ہیں طرحی مشاعرہ ہے شعرا کی غزلیں سن رہے ہیں داد دے رہے ہیں۔ مصرعہ اٹھا رہے ہیں اور ساتھ ہی اپنی غزل بھی موزوں کر رہے ہیں۔ قادر الکلام شاعر تھے۔ تلامذہ کی کثیر تعداد تھی۔ بھوپال یا حیدرآباد سے جب وطن تشریف لائے تو موتی میاں مرحوم کے مکان پر مشاعرے ضرور منعقد ہوتے اور حضرت جوہر حلقہ تلامذہ میں شریک مشاعرہ ہوتے تھے۔ جوہر صاحب کے صاحبزادے حامد علی خاں حامد شاہجہاں پوری اورنگ آباد میں بفضلہ حیات ہیں وہ بھی اپنے زمانے کے مشہور شاعر ہوئے ہیں۔ راقم نے جوہر صاحب کا شاگرد غالب ہونے کے بارے میں تصدیق کر لی ہے اور خود حضرت حامد نے کتابوں کے حوالے دیئے ہیں جن میں جوہر صاحب کو غالب دہلوی کا شاگرد ہونا تحریر ہے۔

نمونہ کلام -

قیامت سے کیا پھر سامنا کیا
 کریں عیسیٰ بھی اب فکر دوا کیا
 خفا کیوں ہو گئے ہیں بے سبب آپ
 ادا نے دے دیا ہے قتل کا حکم
 یہ چشم سر مگیں اٹھتی نہیں کیوں
 خدائی ہو گئی عاشق بتوں کی
 صدائے جنبش عرش آرہی ہے
 نہیں آتا جواب نام لے کر
 نہیں آتا ہے وہ بت خواب میں بھی
 کھلی وہ زلف کا فرما جسرا کیا
 مریض دردِ فرقت میں رہا کیا
 سنا کیا آپ نے میں نے کہا کیا
 کہے، دیکھیں نگاہِ فتنہ زرا کیا
 بھری ہے کوٹ کر اس میں جیا کیا
 خدا جانے کہ دیکھا ان میں کیا کیا
 فلک سے آگے نالہ بڑھ گیا کیا
 کہیں رکتے ہیں قاصد مر گیا کیا
 خدایا بخت جو ہر سو گیا کیا

سید امداد علی میاں عرف ملاح شاد

ملاح شاد کے اجداد کا اصلی وطن ماورائے ہند تھا اور خواجہ باقی باللہ کے سلسلہ رنسل تھے
 ملاح شاد کے والد ماجد سید وارث علی بریلی کے ساکن تھے بسلسلہ ملازمت شاہجہانپور آئے
 اور چوکی پولیس سرائے کا عیال پر عرصہ دراز تک جمہدار رہے۔ نوابان قلعہ سے پر خلوص
 تعلقات پیدا ہو گئے اور یہیں مستقلاً سکونت اختیار کر لی۔ ملاح شاد اسی شہر میں تولد ہوئے
 اور شاہجہانپور کے اساتذہ وقت سے اکتساب علم کیا۔ قلعہ میں تیس زادوں کے اتالیق
 مقرر ہو گئے۔ نواب غلام حسین حسین کا طوطی بول رہا تھا ان کے قرب نے شعر و شاعری کی طرف
 مائل کر دیا۔ نواب صاحب کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہو گئے۔ علاوہ شعر و سخن آپ درویشی
 کے رموز سے بھی واقف تھے۔ شاہ نصیر الدین عرف سعدی میاں بلگرامی کے مرید و خلیفہ
 تھے۔ آپ کے شاگردوں اور مریدین کی کثیر تعداد تھی شاعری میں آپ کے بعض شاگرد
 نام ور ہوئے ہیں۔ مشہور شاعر عاقل کانپوری آپ ہی کے شاگرد تھے آپ کا بیشتر
 کلام ضائع ہو گیا تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی تھی۔ ملفوظ سعدیہ ۱۲۵۵ھ میں

اپنے مرشد کے حالات میں لکھا تھا۔ آپ کو دو چیزیں بہت مرغوب تھیں پان اور آم۔ لانا چوڑا بٹوا ساتھ رکھتے تھے جس میں پان اور اس کے مصالحہ کے علاوہ فصل میں آم بھی رکھتے تھے۔ ایک مثنوی بھی آم کی تعریف میں تصنیف کی تھی۔ نواب غلام حسین کے انتقال کے بعد شاعری ترک کر دی تھی۔ ملا شاد نہایت پر مذاق نیک مزاج اور صاف باطن بزرگ تھے۔ فن تاریخ گوئی میں مہارت حاصل تھی۔ بتاریخ ۲۵ ذی الحجہ ۱۳۹۷ھ کو عالم جادوانی کے سفر پیر روانہ ہو گئے غلہ سنڑی میں سید بھیک صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے قرب میں مدفون ہوئے۔ سید احمد علی میاں اور سید محمود علی میاں آپ کے دو بیٹے تھے اخبار 'المیزان' جاری کیا تھا۔ ملا صاحب کا قطعہ تاریخ وفات منشی کریم الدین بریلوی نے لکھا تھا۔

قطعہ

میر احمد علی شاد از جہاں
بہر تاریخ وصال او کریم
آپ کا ایک مطلع بہت شہرت یافتہ ہے منشی منیر کو خاص طور پر پسند آیا تھا۔
قسمت زلف میں ہے بوس و کنار عارض
آہ کیا مہمت میں لٹتی ہے بہار عارض

نمونہ کلام

شاد کو دفن کر چلے جانا
یہ مجھ میں تجھ میں فرق ہے قاتل کہ آب تیغ
غم دوں میں تری بلا بیٹھے
میرے گلے گلے ہے تو نسیری مگر کمر

مثنوی

اللہ کی حمد لغت احمد
دہلی کے محاورہ کہاں ہیں
مقبول حسن جوان خوش رو
اک آفت جاں پہ مبتلا تھا
اس شوخ کا ہے وہ قد و قامت
وصف کمرو دہن لکھوں کیا
چھوڑ اس کو گیا کسی کے ہمراہ
کیا کوئی لکھے کہ ہے یہ بے حد
کہنے کو برائے نام یاں ہیں
خوش طینت و خوش بیاں خوشخو
جینے سے بھی تنگ آ گیا تھا
قدموں پہ گرے ہے آقیامت
میں راہ عدم کو طے کروں کیا
لب پر رہے اس کے نالہ و آہ

چاہا کہ پھر آئے پر نہ آیا
 فرہاد نے سر پہ تیشہ مارا
 اللہ یہ مجاز کی حقیقت
 ہندی کے جگر میں خوں بھرا ہے
 اس غم کی کیا کہانی
 اس بت نے بتایا اس کو بتا
 اور ماتھے پہ اس نے یاں تہنجہ
 سہنی پڑی ہائے کیا مصیبت
 سرسنگ پہ مارے تو بجا ہے
 پتہ پتہ ہے زعفرانی

یونس خاں یونس

یونس خاں یونس ممول اور زمیندار خاندان کے تھے مگر زمینداری تعیش میں گنوا دی تنگدستی اور افلاس میں عمر کا آخری زمانہ گزرا۔ محلہ تارین بہادر گنج کے ساکن تھے۔ طبیعت باغ و بہار تھی اور مزاج میں انکسار تھا۔ شعر و شاعری سے شغف تھا۔ نواب سلام حسین حسینی کے شاگرد تھے تمسخر پسند بھی تھے۔ کسی شاعر سے ناراض ہو گئے مشاعرہ میں غزل کا مقطع حریف پر چوٹ کرتے ہوئے پڑھا جو سامنے موجود تھا۔

جو حاسد آج کچھ بولا تو یونس اس سے پوچھوں گا
 کہ مشفق آپ کیا طرز سخن بنیگن سمجھتے ہیں

نمونہ کلام۔

قیدی ہوا یہ دل مرا اس زلف کی لٹکا
 ابر ہی رہا میں اور اس پہ بلا تہر و غضب
 - شانہ کا جھٹکا۔ بس مر ہی گیا
 نہ رسم کفر کی سمجھے نہ راہ دیں کے ہوئے
 اسیر سلسلہ زلف عنبریں کے ہوئے
 نہیں نہیں نہیں اس نے جو ہنستے ہنستے کہا
 یہ لطف تھا کہ دلا ہم اسی نہیں کے ہوئے
 انتقال ۱۸۵۶ء کے پڑ آشوب زمانے کے کچھ مدت بعد ہوا۔ آپ کے مزید ذاتی اور خاندانی
 حالات کا پتہ نہیں چلتا۔ نواب مستدناں نے تذکرۃ الاجناب میں اس سے زیادہ حال نہیں دیا۔

لالہ لکھپتے رائے عاقل

آپ قوم کے کالیستھ اور رنگ محلہ کے رہنے والے تھے۔ علم فارسی بہت اچھا تھا۔ اکثر منہتی طلباء سبق لینے کو آیا کرتے تھے۔ چنانچہ شیخ امیر علی مرحوم ساکن محلہ گاڑی پورہ نے جو پہلی بھیت میں تحصیلدار و ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر فائز ہوئے لالہ لکھپتے رائے عاقل سے چند کتب فارسی کی پڑھی تھیں۔ عاقل کا اور رائے کشن سہلے فرحت کا زمانہ ایک تھا۔ فن شعر میں نواب غلام حسین خان حسین کے شاگرد تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور کچھ نثری تصانیف بھی تھیں مگر اب کسی تخلیق کا پتہ نہیں چلتا۔ رائے کشن فرحت نے آئین انگریزی کتاب منظوم لکھی تھی اس میں عاقل نے تاریخ لکھی تھی وہ بطور نمونہ کلام درج کی جاتی ہے۔ ان کا انتقال ۱۸۵۶ء سے کچھ قبل یا کچھ بعد ہوا۔ مشہور ہے کہ تاریخ گوئی میں ملکہ حاصل تھا۔

جب ہوا ختم نسخہ دیکشن
فکر تاریخ کی گئی فی الحال
نسخہ بے نظیر سے چالیس
دور کر کے کہو کہ ہے یہ سال

خان زادہ ملک مینڈو خاں خاں

خان زادہ ملک مینڈو خاں خان نجیب الطرفین خاندان سے تھے۔ نواب بہادر خاں بانی شاہجہانپور کے چچا نیک نام خاں کے پوتے اور خان زادہ سیف اللہ خاں صاحب ساکن محلہ بجلی پورہ کے خلیفہ الصدق تھے۔ فاضل اجل مولانا عبدالجبار خاں صاحب سے اکتساب علم کیا تھا استعداد علمی فاضلانہ تھی۔ اوائل عمری سے شعر و سخن سے دلچسپی تھی۔ اردو و فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے مگر مشورہ سخن کس سے کرتے تھے یہ پتہ نہیں لگتا۔ "سید محمد علی میاں خیال شاہجہانپوری نے اپنی حیات میں یکبار یہ ذکر کیا کہ ملک مینڈو خاں ایک روز میرے والد سے ملاقات کو تشریف لائے میں مولوی جھینگا خاں سے دیوان غنی کا سبق لے رہا تھا مجھ سے بیکار کر کہا کہ صاحبزادہ کتاب لے کر آؤ۔ جب میں کتاب لے کر

ان کے پاس گیا تو کہا کہ اس میں سے کوئی غزل پڑھو، میں نے ایک غزل کے دو تین شعر پڑھے، کہا کہ ترجمہ کرو۔ جب ترجمہ سن چکے، کہا اب کتاب ہم کو دو اور جو کچھ ہم بیان کریں اس کو غور سے سنو۔ اس کے بعد ایک شعر پڑھ کر پہلے لغوی معنی پھر ترکیب نحوی پھر اصطلاحات و محاورات و کنایات و استعارات بیان کر کے اس کے مطالب و نکات بیان کرنا شروع کیے ان کی تقریر میری فہم سے بہت بلند ہو گئی میرے والد اور بھائی ولی میاں و ابو میاں سب ان کی تقریر سن کر متحیر تھے بار بار داد و تحقیر دے رہے تھے چند شعر اس طرح بیان کر چکے تو مجھ سے کہا بیٹا جاؤ اب ہمارا دماغ ہلنے لگا آگے طاقت نہیں تقریر ختم ہونے پر میرے والد نے کہا خان زادہ صاحب آپ نے اس دیوان کا بہت غور سے مطالعہ کیا ہے تو قسم کھا کر کہا کہ جس دن پڑھنا ختم ہوا کبھی کھول کر نہیں دیکھا یہ اس علامہ کا فیض ہے جو مولوی شریف صاحب کے مکتب کے گوشہ میں میٹھی نیند سو رہا ہے یہ سب اس کی تقریر تھی جو میں نے نقل کر دی اس کے بعد رو کر اور ننگین آواز سے کہا کہ میاں صاحب آسمان سینکڑوں برس چکر لگائے گا تب بھی شاہجہانپور کو ایسا علامہ نصیب نہ ہوگا“ (تاریخ مطبع)

ملک مینڈ و خاں خاں نے اپنی حیات میں بہت کہا مگر سب برباد ہو گیا۔ خان کے نوجوان بیٹے کا انتقال ہو جانے کے سبب خان کا دماغی توازن قدرے بگڑ گیا تھا۔ آپ کے چند شعر جو تاریخ صبیح میں درج ہیں نقل کر رہا ہوں۔ اس کے علاوہ کلام دستیاب نہیں ہوتا۔

فصل گل ہیں وہی فریاد وہی نالہ ہے	کچھ نہ مرہم سے ہوا زخم جگر آلا ہے
اے پرئی چشم سیاہ و رُخ تاباں ہے دلیل	دھوپ وہ پڑتی ہے جس سے کہ بدن کالا ہے
ہاتھ آہستہ سے سینے پہ مرنے رکھیو جاں	دل نہیں پہلو میں اک پھوٹا ہوا اچھالا ہے

جلوہ حسن پرپی ناز پہ آمادہ تھا نقش آہنگ معانی ورق سادہ تھا
خان شاعری میں کس کے شاگرد تھے یہ نہیں معلوم ہو سکا نہ یہ پتہ چلتا تھا ان کے شاگرد کون تھے۔
اپنے آبائی قبرستان میں مدفون ہیں۔

حافظ سید حبیب الحق - حبیب

ڈاکٹر قمر رئیس اور مولف کتاب ہذا کے حقیقی نانا مولوی حافظ سید حبیب الحق - حبیب ابن مولوی حافظ سید زین الحق ابن مولوی سید فیض الحق محلہ سدھی خیل عرف محلہ بارہ دری میں رہتے تھے۔ مولانا عبدالعلیم عرف بابا صاحب جن کا مزار محلہ بازید خیل میں بجانب جنوب مسجد جامع ٹیڑھے نیم کے نیچے واقع ہے آپ کے مورث تھے اور وہی بعہد اورنگ زیب عالمگیر شاہجہانپور میں بذریعہ خطابت و امامت عید گاہ آئے تھے عید گاہ کی خطبہ خوانی آپ کے خاندان میں بطور وراثت چلی آئی تھی جو مولوی حافظ سید حبیب الحق تک رہی۔ عالمگیر اور محمد شاہ شاہان ہندوستان کا عطیہ وجہ معاش بھی حاصل تھا موضع 'پراچھرسہ' اور عقب عید گاہ اور دیگر مواضع میں چک اور بازیافت نیز معافیات موجود تھیں جس کی آمدنی سے عید گاہ کا خطیب اپنے اوقات گزاری کرتا تھا مگر جملہ املاک رفتہ رفتہ تلف ہو گئیں باقی ماندہ کو مولوی حبیب الحق نے فروخت کر دیا اور خود اپنی سسرال واقع محلہ مہمند جلال نگر میں اٹھ آئے مولانا زین الحق معلم تھے اس لئے حضرت مولوی حافظ حبیب الحق نے اولاً اپنے والد ہی سے تعلیم حاصل کی۔ جب ہوشیار ہوئے تو مختلف علوم کے اکتساب کے لئے دوسرے معلموں کے پاس گئے۔ بعد کچھ مدت مدرسہ دو میں جو سرکاری تھا پڑھتے رہے اس زمانہ میں مدارس میں کوئی درجہ مڈل کا نہیں تھا گو تعلیم اعلیٰ درجہ کی دی جاتی تھی۔ طلباء صرف نارمل اسکول کی سند حاصل کرنے کو چلے جاتے تھے۔ چنانچہ حضرت حبیب نے بھی نارمل اسکول میں تعلیم پا کر سند پانے میں کامیابی حاصل کر لی اور سررشتہ تعلیم میں ایک مدرسے کے مدرس ہو گئے۔ مولوی زین الحق کو اپنی شرافت نسبی پر بڑا ناز تھا۔ بعد ملازمت کے مولوی حبیب الحق کی شادی ملک علی بہادر خان روہیلہ پٹھان ساکن تارین جلال نگر کی دختر سے ہو گئی ۱۸۸۳ء میں مولوی صاحب موصوف گورکھپور چلے گئے اور محلہ بندوبست میں ملازمت کر لی۔ پیمائش۔ ریاضی اور علم مساحت میں ماہر تھے۔ باوجود ناواقفیت کار بندوبست کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ حبیب صاحب کو شاعری کا شوق پہلے ہی سے تھا مگر گورکھپور پہنچ کر اپنے صیغہ کے ملازم احباب جوہر طبیعت اور پُر مذاق و قابلیت کے لوگ مجتمع تھے شعر گوئی کا مذاق از سر نو پیدا ہوا اور گلستانہ پیام یاز لکھنؤ میں غزلیں بھیجیے لگے۔ جنوری ۱۸۸۶ء کے پیام یار میں ان کی غزل

حضرت امیر مینائی کی شاگردی میں چھپی ہے گویا ان کو حضرت امیر مینائی سے شرف تلمذ حاصل تھا اور بہت کچھ استفادہ کر چکے تھے مگر ۱۸۸۷ء میں ابوالاعجاز منشی احسان علی خاں۔ احسان شاہ بہا پوری بھی گورکھپور بسلسلہ ملازمت پہنچ گئے۔ حضرت احسان کا شمار اساتذہ وقت میں ہوتا تھا۔ مولوی حافظ حبیب الحق اور حضرت احسان میں روز بروز تعلقات بڑھتے گئے اور دونوں ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ حضرت احسان نے حضرت حبیب کی موت کے بعد جو شعر کہا ہے، اس سے دونوں کے درمیان خلوص و محبت کا بھرپور اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

جب سے حبیب چھٹ گئے لطف وطن گیا
میں شکل غم مرقع عالم میں بن گیا

آخر کار اس محبت و تعلق سے مغلوب ہو کر حضرت حبیب نے باجائزت حضرت امیر مینائی حضرت احسان سے مشورہ سُنن لینا شروع کر دیا۔ ۱۸۸۹ء میں سید حبیب الحق صاحب گورکھپور کی ملازمت ترک کر کے راجہ صاحب جو پور کی سرکار میں ملازم ہو گئے۔ راجہ صاحب کے ہمراہ سفر پنجاب کا کیا اور پرستش گاہ ہنودو کانگرہ و جوالا مکھی نیز بہت سے دیگر مقامات کی سیر کی اور عجیب و غریب مقامات دیکھے مگر چند سال بعد اسی ملازمت سے بھی مستعفی ہو گئے اور وطن واپس آ گئے۔ مولوی زین الحق بقید حیات تھے۔ انھوں نے اپنے بیٹے مولوی حبیب الحق کا دوسرا نکاح ملک عظمت اللہ خاں مہمند ساکن محلہ مہمند جلال نگر کی دختر سے کر دیا کیوں کہ مزاجی نا اتفاقی کے بنیاد پر زوجہ اول سے علیحدگی ہو چکی تھی مولوی صاحب بعد نکاح گوشت نشین ہو گئے اور وطن ہی میں معاشی مسائل بھی مہیا ہو گئے۔ ۲۸ دسمبر ۱۸۹۱ء کو مولوی زین الحق نے رحلت فرمائی۔

مولوی زین الحق صاحب مرحوم نہایت منکسر خلیق علم دوست اور نیک دل بزرگ تھے ہنر کے وضع و شریف مرحوم کا انتہائی احترام و پاس و لحاظ کرتے تھے۔ حضرت مولانا زین الحق کے سید حبیب الحق کے علاوہ تین فرزند اور بھی تھے سب سے بڑے حمید الحق ان کے بعد سید محمود الحق اور سب سے چھوٹے سید عتیق الحق تھے۔ سید حمید الحق بعد شادی عین عالم جوانی میں رحلت فرما گئے۔ سید محمود الحق قصبہ ردولی ضلع بارہ بنکی میں ایک مدرس کے مدرس اول تھے بعدہ رنگون چلے گئے جہاں ایک تدریسی ادارہ غالباً آج بھی ان کے نام سے جاری ہے سید محمود الحق کے صرف ایک فرزند سید تلمیذ الحق تھے جو رنگون کے ایک کالج میں لکچرر تھے۔ سید محمود الحق ریاضی، حساب اور سیاحت میں کمال رکھتے تھے۔ سید عتیق الحق نے سرکار ریاست بلرام پور میں ملازمت کر لی تھی اور شادی کر کے توطن اختیار کر لیا۔ راقم الحروف

نے اپنے نانا سید حبیب الحق کے ان سب سے چھوٹے بھائی کو قصداً بلرام پور جا کر دیکھا اور ملاقات کی۔ ان کے صاحبزادے سید شفیق الحق بلرام پور میں چند سال قبل تک بقید حیات تھے۔ جولائی ۱۸۴۲ء میں راہی ملک عدم ہوئے۔ اولاد موجود ہے۔

سید حبیب الحق کے والد رحلت فرما چکے تھے، والدہ زندہ تھیں۔ شغل شاعری بہت ذوق و شوق سے جاری تھا شہر میں جہاں مشاعرہ ہوتا حضرت حبیب ضرور شریک ہوتے۔ اپنے مکان پر بھی مشاعرہ کراتے تھے۔ آپ کا کلام بہت صاف اور دلچسپ ہوتا تھا۔ عمدہ صحبت اور خدادانی کا اثر تھا کہ حضرت حافظ احمد حسین خاں قدس اللہ سرہ العزیز کے دست حق پرست پر خاندان ہشتیہ پر بیعت کی اس وقت صوفیانہ جوش نے منقبت ائمہ و مدحت بزرگان سلسلہ کی طرف متوجہ کیا۔ چنانچہ اجاب کی فرمائشوں اور طبعی ذوق نے قوالی کی دھن کی غزلیں تیار کر آئیں ان کو خوشگلو قوالوں نے جلسہ سماع میں گا کر سامعین کو بہت مخطوظ کیا اور کیفیت قلبی ایسی بڑھائی کہ اکثر کو وجد آ گیا۔ اسی شوق میں اجیر شریف کی حاضری اور خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کی آستانبوسی کا ارادہ کیا۔ اس کے لئے مجموعہ غزلیات کا تیار کیا اور 'معین القلوب' نام رکھا۔ پوربی زبان جو ایک موثر اور پیاری زبان بھاکا کی یادگار ہے حبیب الحق صاحب کی زبان پر تھی اس میں بھی خامہ فرسائی کی۔ الغرض ردیف وار غزلیں اور ٹھہریاں خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کی منقبت میں لکھیں۔

بسبب تعلقات اور گورکھپور کے قدیم اجاب کی خواہش پر ۱۳ دسمبر ۱۹۰۱ء حضرت احسان شاہ بہمنپوری کے ساتھ گورکھپور گئے اور کئی سال کے پچھڑے ہوئے اجاب سے ملنے کچھ روزہ کر گورکھپور سے اعظم گڑھ اور قصبہ محمد آباد تشریف لے گئے جہاں ڈاکٹر عبدالغفور مطیر کے ہمان ہوئے۔ ۶ جنوری ۱۹۰۲ء کو بعافیت تمام وطن واپس تشریف لائے۔ آپ کو ریاست گوالیار کا محرم دیکھنے کا بہت شوق تھا وہاں کے اجاب خصوصاً قاضی عزیز الدین رخششاں شریف زادہ قصبہ جیور ضلع بلند شہر کے تقاضے اور بلاوے پر، ۴ اپریل ۱۹۰۲ء مطابق ۸ محرم ۱۳۲۱ھ حضرت احسان کے ہمراہ بقصد گوالیار روانہ ہوئے اور گوالیار میں پہنچ کر نیا بازار میں حضرت احسان کے ہمان ہوئے محرم کا سامان اور انتظام دیکھا۔ مجلسوں میں شرکت کی۔ گوالیار میں محرم بڑے حسن عقیدت سے منایا جاتا تھا۔ ریاست لاکھوں روپیہ اس پر صرف کرتی تھی۔ محتاجوں کو پلاؤ۔ بریانی روزمرہ عشرہ تک کھلایا جاتا اور خیرات ہوتی تھی۔ مرہٹے روساتک اس موقع پر فراخ دلی سے خرچ کرتے

تھے۔ احباب گوالیار نے ان ہر دو حضرات کے اعزاز میں ایک شاندار مشاعرہ منعقد کیا جو حکیم اصغر علی فرخ آبادی کے مکان پر ہوا جس میں ان شاہجہاں پوری شعرا کے قدیمی دوست قاضی مقصود حسین حیرت شاہجہاں پوری بھی موجود تھے۔ مشاعرہ کی طرح یہ تھی دحرم دیکھنے کے واسطے احسان آئے ہیں، سید حبیب الحق صاحب نے اپنی غزل پڑھی اور خوب خوب داد پائی۔ گوالیار سے ۱۲ اپریل ۱۹۰۳ء کو شاہجہاں پور واپس پہنچ گئے۔ سید حبیب الحق کو سیاحی کا اس قدر شوق پیدا ہو گیا تھا کہ ان کے لیے گھر بیٹھنا مشکل ہو گیا اور وہ پورنیہ۔ مونگیر اور چھپرا صوبہ بہار کی سیاحت کے لئے چلے گئے اور اس سفر سے واپس آگئے۔ دوسری بار پھر گئے مگر اس بار ادھر کی مرطوب آب و ہوا نے عناصر طبعی میں اختلاف ڈال دیا۔ سخت بیمار ہو کر شاہجہاں پور واپس آئے مگر بڑی تکلیف و دقت سے وطن تک پہنچے۔ ڈاکٹری اور یونانی علاج کیا گیا بہت دوڑ دھوپ ہوئی لیکن مرض تشخیص میں نہ آیا اور نہ کوئی دوا کارگر ہوئی۔ پانچ چھ روز شدید تکلیف و کرب میں مبتلا رہے بالآخر ۱۹ اکتوبر ۱۹۰۳ء مطابق ۹ شعبان ۱۳۲۲ھ کو اللہ اللہ کرتے جنت نصیب ہوئے۔ مرحوم نے ایک فرزند جس کا تاریخی نام اختصاص الحق تھا اور چار لڑکیاں یادگار چھوڑیں مگر خدا کو نسل ذکر قائم رکھنا منظور نہیں تھا اس لئے چند ماہ کے بعد لڑکے کا انتقال ہو گیا اور نابالغ لڑکیاں جب جوان ہوئیں تو ان میں سے پہلی لڑکی امینہ بیگم کی شادی بابو تاج محل حسین خاں ساکن جلال نگر سے اور دوسری لڑکی مختار بیگم کی شادی مولوی عبدالعلی مختار خاں ساکن احمد پور نیاز پور سے ہو گئی۔ تیسری لڑکی طاعون کی نذر ہو گئی چوتھی لڑکی صفری بیگم کی شادی حکمت اللہ خاں ساکن تلہر سے ہوئی۔ سید حبیب الحق مرحوم کو زندگی میں اس بات کی بڑی تمنا تھی کہ بعد مرنے کے مرزا حاجی قلندر صاحب علیہ رحمۃ کے پاس دفن ہوں جس کا احاطہ عید گاہ سے ملا ہوا اتر کو سیڑھیوں کے پاس ہے۔ الغرض کچھ اس آرزو کا خیال کر کے کچھ خطابت عید گاہ کا تعلق سمجھ کر حاضرین تعزیت کی یہی رائے قرار پائی کہ اسی جگہ کے قریب انتظام دفن کا کیا جائے۔ چنانچہ احاطہ مذکور کی دیوار شمالی کے پینچے باہر کو پختہ قبر سے پچھم کو ملی ہوئی مولوی حافظ سید حبیب الحق حبیب خطیب عید گاہ و امام جامع مسجد کی قبر ہے۔ مرحوم کو ریاضی و ہندسہ و مساحت میں بہت مہارت تھی فارسی میں بھی قابلیت اچھی تھی فن شعر میں بھی بہت کچھ معلومات تھیں دیوان اردو مکمل ہو گیا تھا مگر بعد وفات کے پتہ نہیں چلا کہ کیا ہوا۔ معلوم ہوا کہ آخری سفر صوبہ بہار میں ہمراہ تھا دیگر سامان کے ساتھ پورنیہ یا مونگیر میں کسی جگہ کسی کے پاس رہ گیا۔ سید

حبیب الحق مرحوم نہایت متواضع و مہمان نواز دا حباب پرست انسان تھے اپنے ملنے والوں کا مثل عزیزوں کے خیال رہتا تھا اسی وجہ سے مرحوم نے باوجود یہ کہ بہت کمایا مگر کچھ نہیں رکھا سب خرچ کر دیا۔ مرحوم کی طبیعت بہت رواں تھی اور فن شعر کے مناسب۔ کلام صاف اور عاشقانہ ہوتا تھا۔ مضامین اچھوتے ہوتے تھے جدت بھی تھی اور آدھی۔ دیوان غائب ہے ورنہ انتخاب کلام پیش کیا جاتا تا گلدستوں میں جہاں تک راقم الحروف کو نانا مرحوم کا کلام مل سکا انتخاب کر کے ضیافت طبع ناظرین کے لئے لکھ دیا۔

صبر میرا کبھی تسکین کا پہلو نہ ہوا	درد میں دل کو دبا لینے کا قابو نہ ہوا
جام توبہ کی طرح ٹوٹ گئے محفل میں	ہاتھ ساقی کا مرے واسطے چلنے ہوا
روتے روتے یونہی کجنت نکلتا اک روز	میرا ارمان مری آنکھ کا آنسو نہ ہوا
جام پر جام پیئے ہم نے مئے الفت کے	ایک جرء بھی کبھی حلق میں اچھو نہ ہوا
وصل کی شب میں بھی درپردہ رہا عیش وصال	آنکھ کے سامنے آئینہ زانو نہ ہوا
زسنی داور محشر نے ستم کی فریاد	حشر کے روز بھی جھگڑا مرا یکسو نہ ہوا

تو بھی نہ سامنے گئی کیوں اے نگاہ یاس	سو بار وہ رقیب سے آنکھیں ملا چکے
جو بن کو دیکھتے ہیں وہ سینہ ابھار کر	کہتے ہیں ہم بھی اپنی جوانی پر آچکے
اب آؤ دل میں درد محبت نہیں رہا	اٹھتا تھا جو کبھی ہم اُسے بھی دبا چکے
بے پردگی سکھائے گی آمد شباب کی	حرم میں تم نمود جوانی چھپا چکے

محفل میں ان کی، صبر و خرد ہیں کہاں حبیب

تم جس کو ساتھ لائے تھے پہلے وہ جا چکے

وہ شب وعدہ جو آئے تو یہ بولے ہنس کر

آج کیا ہے کہ شب بھر ترے گھر میں نہیں

بہارِ عشق دکھلا دی ترے خنجر نے اے قاتل	بدن پر زخم تر چھے پڑ گئے رہیں بدھیاں ہو کر
میں صدقے اس رعایت کے سمجھ کر عاشق کیسو	بلائیں پاؤں پڑنے آئیں بھی تو بیڑیاں ہو کر
ستانا سیکھتے ہو تم تو یہ ترکیب اچھی ہے	کہ آبیٹھو ہمارے سینے میں درد نہاں ہو کر
نہ کام آئیں فسوں گفتاریاں وقت سخن اس سے	حبیب ایسی تھیں چپ لگ گئی جادو بیاں ہو کر

کیا ہوا ضعف سے گرتے ہیں جو چلنے والے
 ڈھنگ درپردہ ستانے کا نکالا کیا کیا
 نشہ مئے میں مجھے دست سبوں نے تھاما
 غم گیا دل سے تو ہر درد نے راحت پائی
 روک رکھا ہے غلش کے لئے ان کو شب بھر
 راستہ بند کیا کثرتِ غم نے ایسا
 ٹھوکریں کھا کے سنبھلتے ہیں سنبھلنے والے
 دل میں بیٹھے ہیں کلیجہ مرا ملنے والے
 یوں سنبھل جاتے ہیں گرنے سے سنبھلنے والے
 اب تو بے خون ٹہلتے ہیں ٹہلنے والے
 تیرے پریکان نہیں دل سے نکلنے والے
 رک رہے دل کے سب ارمان نکلنے والے

چل دے ہم طرفِ ملکِ عدم آج حبیب

رہ گئے دیکھ کے منہ ساٹھ میں چلنے والے

دیکھو بے قدر سمجھ کر نہ انھیں پھینکو تم
 مرگ گلچیں کی گلستاں میں خوشی ہے شاید
 میری حسرت بھی بے کہلائے ہوئے ہاڑوں میں
 بلبلیں پھول لئے پھرتی ہیں منقاروں میں

مٹ گیا کوچہ سفاک ہیں ارماں کس کا
 ناوک جو رکوکس کے نہ جگہ دی ہم نے
 دل مضطر ہی نہ پہلو میں نہ سینے میں جگر
 قتل سے میرے مکرنا ہے تو کیوں اے قاتل
 خاک پر لوٹ رہا ہے تن بیجاں کس کا
 خون میں ڈوب کے نکلا نہیں پریکاں کس کا
 اے غم یار بناؤں تجھے کہاں کس کا
 تھا ابھی خون میں تر خنجر براں کس کا

چرخ پر دیکھ کے ہمتا کو کہتا ہوں حبیب

داغِ دل آج ہوا ہے یہ نمایاں کس کا

برا ہو عشق کا اچھا بنا دیا مجذوب
 مجھے نہ منع کر آنے سے بزم میں ساقی
 شہید مجھ سا نہیں دوسرا زمانے میں
 بگر بگر کے رگڑ تیغ نازا اے قاتل
 تمام عمر نہ سمجھے وہ گفتگو میری
 کہ راہ دیکھتے ہیں ساغر سبو میری
 ہوئی ہے خون تمنا سے شست شو میری
 لہو نہ دے گی کہاں تک رگ گلو میری

بلائیں لیتا ہے رہ رہ کے نقشِ پاکس کی
 خط اس کو دے کے جو قاسد نے کچھ کہا تو کہا
 ادا نہیں کرتی ہے رفتارِ رفتہ زاکس کی
 سنا رہا ہے تو یہ مجھ کو التجا کس کی
 قضا سے کرتی تھی شورہ ابھی ادا کس کی
 یہ مانا ذکر نہ تھا میرے قتل کرنے کا

بیان زلف پر یرو سنا کے اے ناصح
مگر بھی دل بھی ہے تیرنگاہ کا طالب
لگتے جاتا ہے تو میرے سر بلا کس کی
یہ دیکھنا ہے کہ مقبول ہو دُعا کس کی

وعدہ ہی سن کے بے خودی شوق بڑھ گئی
عاشق کی چھیڑ کا ہے گلہ کیا ملال کیا
ہوگا شب وصال میں اس دل کا حال کیا
ایسی تو روز ہوتی ہے اس کا خیال کیا

ناوک ناز دلربا کیوں ہو
جس سے مطلب غرض نہیں کوئی
مجھ پہ یہ جو بے خطا کیوں ہو
لطف اس پر ہو یا جفا، کیوں ہو
میری تقدیر نارسا کیوں ہو
آہ و فریاد نارسا ہی سہی
جس کو وہ کوستے رہیں دن رات

دست بستہ حبیب آیا ہے

بے سبب اس سے تم خفا کیوں ہو

بتو اب تو آنے دو اپنی محفل میں ہم کو
کسی سے کہیں گے نہ اپنی طلب ہم
اگر تم نہ بولو گے دیکھا کریں گے
ہمتیں سے تمھاری تمنا کریں گے

کہتے ہیں وہ آسماں سے ہم نے
خلوت میں اڑاؤ جام پر جام
سیکھا ہے چلن ستمگری کا
ڈر اس میں حبیب کیا کسی کا

ہمارے دل کو یا ہے تو پاس ہی رکھئے
وہ مجھ کو دیکھ کے دیوانہ کوستے ہیں تبھی
وہ کام کیجئے آئندہ اعتبار ہے
خدا کرے ترے سر پر جنوں سوار ہے

آتا جاتا ہے اسی راہ سے دل میں غم یار
تیری آنکھوں میں نہ کھٹکونگا وہ لاغر ہوں میں
بے خودی دیدہ عاشق کو کھلا رہنے دے
اے صنم اپنی نگاہوں میں پڑا رہنے دے

وعدہ وصل تو وفا نہ ہوا
اور کہتے ہو ہم سے کیا نہ ہوا

اس کو کہتے ہیں بیکسی فسراق
 وہ نہ ہم کو ملے نہ ہم ان کو
 نارسائی سی نارسائی ہے
 ایک بوسے کی کیا لڑائی تھی
 ایسے دل کو سلام ہے میرا
 جب مزد ہوگا حشر میں او بت
 درد بھی میرا آشنا نہ ہوا
 حشر کے دن بھی فیصلانہ ہوا
 آہ کیا بخت بھی رسا نہ ہوا
 آج تک جس کا فیصلانہ ہوا
 جو میرا ہو کے بھی میرا نہ ہوا
 تیری جانب اگر خُدا نہ ہوا
 حال تم نے حبیب کا بھی سنا
 سوئے ملکِ عدم روانہ ہوا

پیا مبر کی زباں بن کے ساتھ میں بھی چلا
 کہاں تک اس سے بیاں شرح آرزو ہوتی

کبھی نہ ایک جگہ مثل دود آہ رہے
 پہلا ہے آج ہی اظہار درد کا موقع
 تلاش یار میں کیا کیا نہ ہم تباہ رہے
 خموش کس لئے محشر میں داد خواہ رہے

میرا حال کہنا جو اے نامہ بر تو
 شب انتظار اپنا شغل اور کیا ہو
 ذرا پہلے ان کی نظر دیکھ لینا
 ادھر دیکھ لینا ادھر دیکھ لینا

کہنے لگے وہ سن کے مری داستانِ غم
 تیرے معاملے سے ہمیں واسطہ نہیں

دیکھو نظر اٹھا کے تم اک بار اور بھی
 میدانِ حشر میں نہ کسی سے ہوں شرمسار
 ناز و ادا کا دیکھ لیں ہم پیار اور بھی
 اتنا کرم ہوا سے مرے ستار اور بھی
 ساقی سبھی نکال کے خم سے نہ صرف کر
 نیت لگاے بیٹھے ہیں میخوار اور بھی

خُلد کی پروا نہ شوقِ جور تھا
 اب تو آنکھوں سے لہو بہنے لگا
 میری نظروں کو وہی منظور تھا
 پہلے اس سے دل ہی میں ناسور تھا
 چٹکیاں لیں ہوں گی یاد غیر نے
 چھیڑتا میں یہ مرا مقدور تھا

ہے بڑی عمر آپ کی خود آگے ^{۱۱} آپ ہی کا اس گھڑی مذکور تھا

دفا سے یار سے طرز جفا نکلتی ہے یہی ادا ہے تو پھر کیا ادا نکلتی ہے

اب تو فوراً ضعف سے دیکھو یہ حال ہے درد جگر کو بیٹھ کے اٹھنا محال ہے

فیض ساقی سے جو ہیں شغل مئے وحدت میں
عشق میں گزری ہے جو مجھ پر اب ان کا ذکر کیا
مدعی کو سامنے بھٹلا کے دیکھا آئینہ
تم سے دنیا ہے تو دنیا میں تمہیں زندہ ہو

ہوش آتا ہی نہیں کچھ ایسی کیفیت میں
آپ اتنا بیخ کیوں کرتے ہیں میں راحت میں
آپ کی اس سادگی سے میں بڑی حیرت میں
مجھ کو مرنے دو اگر مرنے کی حسرت میں ہوں

میکشوں کو جو ذرا پی کے ندامت آئی
عمر بھر ہم کو اسی بات کا افسوس رہا

اینڈنی جھومتی اللہ کی رحمت آئی
تیرے آنے کی طرح دل میں نہ حسرت آئی

دیکھا وہ نور ہم نے تری جلوہ گاہ میں
جو آسماں کو بھی نہ ملا مہر و ماہ میں

جی پہلنے کے یہی شغل رہا کرتے ہیں
ایک دن وہ تھا کہ جینے کی تمتائیں تھیں

تیری تصویر سے سنس بول لیا کرتے ہیں
اب وہی ہم ہیں کہ مرنے کی دعا کرتے ہیں

رائے کرشن سہاے فرحت

رائے کرشن سہاے فرحت کے حالات مولف تاریخ صبیح نے بہت تفصیل سے تحریر کیے

ہیں جو دلچسپ بھی ہیں اور لائق توجہ بھی۔ فرحت صاحب کے بزرگ بدایوں کے ساکن تھے اور عہد مغلیہ میں سرکاری عہدوں پر فائز تھے۔ شہنشاہ ہندوستان جہاں گیر کے عہد میں فرحت کے جد امجد رائے تیج پال قانون گو تھے۔ کسی سبب سے شاہی عتاب میں آگئے بتقاضائے غیرت اور تحفظ ننگ ناموس کی خاطر گھر کے سبھی افراد کو قتل کر بنگال کی طرف فرار ہو گئے۔ اتفاق سے قتل عام رائے جے رام داس بچ گئے تھے جن سے تیج پال کی نسل چل نکلی۔ رائے جے رام داس کے فرزند نواب زین الدین خاں رئیس شاہ بہمانپور کی سرکاری دیوان مقرر ہو گئے۔ رائے گنیش رائے دیوان ہو کر بیہیں کے ہو رہے اور شاہ بہمانپور میں توطن اختیار کر لیا۔ رائے گنیش رائے کے پوتے رائے بختاور سنگھ حافظ الملک حافظ رحمت خاں کی سرکاری ملازم تھے اور مرہٹوں کی جنگ میں یہ بھی حافظ الملک کے ساتھ تھے۔ بعد جنگ یہ جلال آباد کے چکھ دار مقرر ہوئے اور اسی عہدہ پر حافظ الملک کی زندگی تک برقرار رہے۔ جب روہیلکھنڈ نواب شجاع الدولہ والی اودھ کے مالک ڈوسہ میں شامل کر لیا گیا تو نواب اودھ کی طرف سے بھی رائے بختاور سنگھ اپنے عہدہ پر اسی طرح برقرار رہے۔ نواب سعادت علی خاں کے عہد میں جب شاہ جہان پور سرکار کمپنی نے اپنے قبضے میں لے لیا تو رائے بختاور سنگھ سبکدوش ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔ ان کے فرزند رائے سنگھ ندھان علاقہ ٹھاکر دوارائے کمپنی کی طرف سے عہدہ وہ یک تحصیلداری پر سرفراز ہوئے۔ رائے سنگھ ندھان بدتر، بیاقت اور شجاعت میں مثل اپنے بزرگوں کے تھے۔ امیر خاں ایک رئیس نے جب ان کے تحصیل کے مکان پر حملہ کر کے خزانہ وغیرہ لوٹنا چاہا تو رائے سنگھ ندھان نے بے جگری سے مقابلہ کیا اور بڑی تدبیر سے خزانے کو لٹنے سے بچا لیا اس خدمت اور وفاداری کے صلہ میں کمپنی سرکار نے ۳ جون ۱۸۳۳ء خلعت و خطاب سے نوازا اور تاجیات اصلاخ مراد آباد، بریلی اور شاہ بہمانپور کے تحصیلدار رہے۔ دوران ملازمت ۱۸۳۲ء جلال آباد میں انتقال ہوا۔ ضلع کلکٹر نے حسن خدمات اور وفاداری کے انعام کے طور پر رائے بختاور سنگھ کے بیٹے رائے کرشن سہائے فرحت کو تحصیلدار کے عہدے پر تقرر کر دیا۔ رائے کرشن سہائے فرحت زندگی بھر شاہ بہمانپور کی تحصیلداری پر قائم رہے۔ مولوی صبیح الدین میاں نے تاریخ مطیع کے حوالے سے لکھا ہے کہ مسٹر بلر، کلکٹر شاہ بہمانپور نے کسی سنگین قصور پر فرحت کو برخاست کر دیا تھا مگر جب ان کی معصومیت اور بے قصوری کا یقین ہو گیا تو ریڈنٹ لکھنؤ اور نواب

مہدی علی خاں وزیر سے سفارش کر کے اودھ میں چکلہ داری پر تقرر کر دیا تھا ایک مدت تک محمدی و بہرائچ کے چکلہ دار رہے اور جب اودھ کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا تو یہ بھی علیحدہ ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔ فرحت کو شعر و سخن سے دلچسپی تھی نواب غلام حسین خاں حسین کے حلقہ تلامذہ میں تھے۔ نثر نگاری کا شوق بھی تھا۔ قصہ لیلاوتی بزبان فارسی نظم کیا ایک لغت 'تالیف فرحتی' نامی تیار کی تھی اس میں لغات عجیب و غریب داخل کئے۔ محاورات میں ایک کتاب 'بدیع الانشا' ترتیب دی تھی۔ قصہ 'گل بکاولی'، مثنوی میر حسن کی بحر میں نظم کر کے 'سوز عشق' نام رکھا تھا۔ مولوی صلیح الدین میاں بجوالہ تالیخ مطیع راوی ہیں کہ سوز عشق کو بغرض اصلاح نواب غلام حسین حسین کی خدمت میں پیش کیا۔ نواب صاحب نے بعد اصلاح ایک قصیدہ تصنیف کر کے اس پر لگا دیا جس کا ہر شعر مثنوی کے داستان کا عنوان بن گیا۔ فرحت نے اپنا دیوان بھی ترتیب دیا تھا جس میں اردو فارسی کا کلام تھا جس کا نام دیوان رعنا رکھا تھا۔ فرحت خود لکھتے ہیں کہ مجھ کو بچپن سے شعر و شاعری کا شوق تھا چنانچہ آغاز شعور سے ۱۲۶۴ھ تک کہ عمر کا چالیسواں سال تھا تصنیف و تالیف کا اتفاق ہوا اور یہ ارادہ کیا کہ شاعری ترک کر کے اب دل و دماغ کو آرام اور خیالات و افکار سے نجات دینا چاہئے مگر مثنوی سوز عشق طبع ہو کر مشہور ہو چکی تھی حتیٰ کہ بلر صاحب کلکٹر ضلع اور 'مختارن ہل صاحب' جنٹ میجسٹریٹ کہ علم و ہنر کے قدردان اور جوہر قابلیت کے فرد تھے مثنوی مذکور کی اشاعت سے واقف ہوئے ان دونوں صاحبوں نے ایک دن کمال لطف و مہربانی فرمایا اگر کوئی کتاب شعر تواریخ شاہان ہند مافیہ و متضمن حالات آئین و دستور و خراج ہند و کیفیت پیداوار آراضی و ضوابط نظم و نسق ملک و انتظام عدالت وغیرہ تیار ہو جائے تو یقیناً ملک کو بہت مفید ہو چنانچہ اس تحریک سے حکم المامور ایک کتاب جس میں قواعد مالی و ملکی سرکار انگریزی کے (شروع کی اور عہد سلطنت خاقان اکبر اعظم سے مختصر حالات سلاطین مغلیہ کے شروع کر کے شب و روز کی محنت و سرگرمی سے تالیف کی اور اس کا نام 'آئین انگریزی' رکھا، فرحت کو ۱۸۵۶ء کے پُر آشوب دور کے خاتمے پر خیر خواہی اور وفاداری کے صلہ میں ضلع بہرائچ میں جائیداد عطا ہوئی تھی۔ تمام زندگی عیش و آرام میں بسر کی قدر کے دس بارہ سال بعد وفات پائی مان کے بھائی منشی ہر سہائے کلکٹری شاہجہاںپور میں سرشتہ دار تھے۔ فرحت کا کل کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ اب ناپید ہے۔ صرف وہ اشعار جو آئین انگریزی میں حمد کے طور پر مثنوی میں موجود تھے لکھے جاتے ہیں۔ واقعی یہ امر کس قدر

افسوس ناک ہے کہ اولاد کے ہوتے ہوئے سارا سرمایہ ادب جسے فرحت نے ساری عمر میں اکٹھا کیا تھا ناقدری کی نذر ہو گیا اور تلف ہونے سے کوئی نہ بچا سکا۔ اولاد نے ان کی جائیداد سے فائدہ اٹھایا عیش و آرام پایا لیکن وہ بیش بہا اور انمول ادبی خزانہ جسے فرحت صاحب چھوڑ کر گئے اس کی حفاظت نہ کر سکی۔

فرحت کی مثل اور بھی شاعر گزرے جن کا ادبی سرمایہ تباہ و برباد ہو گیا۔ نمونہ کلام ملاحظہ

ہو۔

حمد

ہر ایک ذرہ اس سے ہوا تابدار	اسی سے یہ دریا ہوا آبدار
شفق کا بنا کر کے رنگ عجیب	کیا دامن آسماں کے نصیب
ہر اک شاخ گل اس گلستاں کی	ہوئی ذکر خوان اس کے احسان کی
ولیکن بشر کی یہ طاقت کہاں	کہ کھوے وہ اس کی ثنا میں زباں
اسی رہ میں پائے خرد لنگ ہے	سخن کا یہاں قافیہ تنگ ہے
ملک ذکر میں اس کے خاموش ہیں	فلک بھی تو از حد فراموش ہیں

یہ منزل تو فرحت سمجھ کر کے دور

درازی کو کوتاہ کرا ب ضرور

حضرت رائے کرشن سہاسی فرحت شاہ بھہا پوری کے خاندان میں اب کوئی ایسا فرد نہیں ہے جو فرحت کے کلام کی نشان دہی کرتا جس سے مزید تلاش و جستجو میں مدد ملتی۔ یہ چند اشعار بھی منشی احسان علی ناں احسان کے طفیل دستیاب ہو گئے جنکو آئین انگریزی کا ایک قلمی نسخہ مل گیا تھا وہ بھی اب غائب ہو گیا۔

سید محمد محسن میاں عرشی

آپ کے والد ماجد کا نام خلیفہ سید احمد صاحب تھا محلہ لکرا خورد کے باشندہ تھے۔ ۱۷۰۰
جمادی الاول ۱۲۳۶ھ کو پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی۔ آپ کے والد اور دادا خلیفہ جی

فارسی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ عرشی کی استعداد علمی معقول تھی۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے طبیعت رسا پائی تھی۔ نواب غلام حسین خاں حسین کے تلامذہ میں تھے۔ عین عالم جوانی بمر ۳۰ سال مجنون ہو گئے جنونی حالت پندرہ سال قائم رہی اور اسی عالم میں دنیا کو خیر باد کہا۔ دیوانگی کی وجہ سے کلام برباد ہو گیا۔ ایک بار نواب غلام قادر خاں نے قلعہ میں مشاعرہ کرایا باہر کے شعراء بھی بلائے گئے تھے۔ طرح نہایت مشکل تھی۔ مشاعرہ میں عرشی نے اپنی باری پر غزل پڑھی جب یہ شعر پڑھا تو حاضرین مشاعرہ پر کیفیت طاری ہو گئی۔ نواب غلام قادر خاں نے بڑھ کر عرشی کے ہاتھوں کو فرط جذبات سے مغلوب ہو کر بوسہ دیا۔

ایڑیاں بسمل نے رگڑیں تو یہ بولا بدگمان
پاؤں بھی کاٹو کہ ہے اس کی رگ جاں پاؤں میں
اسی غزل کا ایک اور شعر ہے

جذب شوق دشت سے یوں پھاندتے ہیں ہم اسیر
چھو نہیں سکتی کبھی دیوار زنداں پاؤں میں
نہ مرا غم میں ماہرو یوں کے
سکھیا آسماں نے کھا دیکھی
مزے تو بوسہ رخسار دلربا کے لئے
رولا کے خواہ لئے ہم نے یا ہنسا کے لئے
چلی تھی سوئے فلک پر شہاب ثاقب نے
قدم لپک کے مری آہ نارسا کے لئے
ایڑیاں قیس نے رگڑیں تو بنا جادہ دشت
تھک گئے پاؤں تو اس کو یہ چلن یاد آیا
خم کے خم آج سا قیا ڈھل کا
کس کو معلوم حال ہے کل کا
ہلال عید کہا میں نے ایک دن جو اسے
تیرے رقتار تیز کے آگے
تیرے فیروں کو اس نے جو پلٹ کر دیکھا
ناز سے کھائی اٹھکھیلی سے ٹھوکر حشر پر حرف آگیا
مرا کمال مجھے باعث زوال ہوا
وہ سہی قد اپنی رعنائی سے رسوا ہو گیا
بڑھا تو بدر بنا گھٹ کے پھر ہلال ہوا

سید محمد محسن میاں عرشی لگ بھگ ۱۲۸۱ھ میں فوت ہوئے۔ عرشی کی نسل میں لوگ اسی محلے میں آباد ہیں۔ والد اور دادا کا پیشہ معلی تھا۔ نہایت نیک اور بابرکت بزرگ تھے مشہور ہے کہ ان کا کوئی شاگرد بدنصیب نہیں ہوا۔

حافظ نثار احمد خاں عرف حافظ بدھن خاں تائب

۱۲۵۳ء میں پیدا ہوئے شیرخوار ہی تھے کہ چچک کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے اور بصارت جاتی رہی مگر علم و فضل میں یکتائے زمانہ ہوئے دیگر بچوں کی مانند آپ بھی مدرسہ جایا کرتے تھے اور وہاں جو کچھ پڑھایا جاتا صرف سن کر ذہن نشین کر لیا کرتے تھے اپنے مضبوط حافظے کی بدولت قرآن کریم مولوی قاری محسن میاں سے حفظ کیا اور عربی فارسی کی تحصیل مولوی سید محمد حسین سے کی تھی نیز فقہ کی کتب درسیہ مولوی عبدالرحمن خاں سے پڑھی تھیں۔ شاعری میں نواب غلام حسین خاں حسین کے شاگرد تھے۔ آپ کی تصنیف میں تین مولود شریف منظوم۔ ایک نثر فارسی موسوم بہ 'شہد عشرت' چند رسالے اردو میں۔ ایک فارسی میں اور ایک عربی میں صرف و نحو میں اور شرح میزان منطق عربی میں اور ایک نام تمام کتاب مرقعہ حجت ایتقان فلسفہ و حکمت میں لکھی تھی۔ صرف و نحو میں حافظ بدھن کی معلومات وسیع تھیں مگر افسوس کہ ساری تصنیفات بلا طبع کے رہیں۔ آپ ایک کہنہ مشوق بلند خیال شاعر تھے۔ انتہائی زود گو بھی تھے۔ اپنی بلند خیالی اور دقت معنی میں غالب ثانی تھے۔ آپ کے دو دیوانے اردو اور ایک فارسی کا تھا مگر یہ سب بھی ریور طباعت سے محروم رہا۔

حضرت جلال لکھنوی ایک بار شاہجہاں پور تشریف لائے تھے ایک نشست میں جلال صاحب نے اپنی غزل پڑھی حافظ بدھن خاں تائب اس نشست میں خود بھی موجود تھے جلال صاحب کے ایک شعر پر برسر عام ترکیب نحوی کا اعتراض جرط دیا۔ پڑھے لکھے لوگ حافظ تائب سے گھبراتے تھے کہ کہیں کوئی نکتہ نہ دریافت کر لیں بصارت نہ ہونے سے مطالعہ سے محروم تھے ورنہ ان کا ثانی ملنا مشکل تھا۔ آپ نے اپنی ولادت کا قطعہ موزوں کیا تھا جس کی ندرت لائق دید ہے۔

قطعہ

میں جو پیدا ہوا خدا کی شان	نام پایا نثار احمد خاں
تین لفظیں ہیں پہلے بے بے پا	ثانی بے سر ہے تیسری بیجان

نمونہ کلام اردو

معدلات میں ہے فقر سہسات میں ملک	طلاقت اثر شہ پسند سے فریاد
ربانی قید سے تائب پس فنا بھی نہیں	رسن بے تار کفن پائے بند سے فریاد

انگلی دہان زخم میں دیتا ہے بڑھ کے تیر
تائب سخن سے دل کا علاقہ نہ جائے گا

غزل تائب

خلق کو تپٹ کرے ظلم اس ستم ایجاد کا
ساکنان کوئے جانان کیا کریں لے کر بہشت
بھول کر بھی آ نہیں سکتی کبھی یاد خدا
کھٹتے ہیں کچے ڈورے سے یہ اپنی بڑیاں
اشک کی موجیں فلک پر ہیں بجائے کہکشاں
اسیران بلا مجبور یا مختار بیٹھے ہیں
بے دشمن برائے عاشقان زار بیٹھے ہیں
کوئی کہہ دے خبر جا کر یہ اس رشک میجا سے
کسی کو نے میں دوزخ کے کوئی طفل برہمن ہے
چلے کوئی۔ کوئی چکر لگائے ہم کو کیا ہم تو
قیامت ہے نہیں اٹھتے وہ خواب استراحت سے
جو ہوتا ہے وہی کہتے ہیں۔ ہم کچھ بھی نہیں کہتے

تائب تباریخ ۳ نومبر ۱۹۲۴ء کو ہیضہ میں مبتلا ہو کر فوت ہوئے اور تارین رنگین چوپال
کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔

مولوی سخاوت حسین سخا تلہری

اصل نام مولوی عبدالرحیم عرف مولوی سخاوت حسین صدیقی تلہری تھا والد ماجد کا نام مولوی
شیخ مظفر حسین صدیقی تلہری تھا مولوی شیخ سخاوت حسین سخا کے دادا قدوة العلماء زبداً لفضلاً
حضرت مولانا نذیر الدین احمد صدیقی مرحوم کی شخصیت بھی بڑی قابل قدر اور لائق احترام رہی ہے
وہ اپنے عہد کے ایک بہتر عالم دین اور ایک صاحب نسبت بزرگ ہوئے ہیں جنہوں نے دہلی

جا کر رئیس المفسرین خاتم المحدثین حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز قدس سرہ العزیز سے علوم دینی میں باقاعدہ استفادہ کیا تھا اور حضرت محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا مولوی سخاوت حسین سخا تلہر میں پیدا ہوئے اور تلہر ہی میں نشوونما پائی۔ تاریخ ولادت و سن کا صحیح علم نہیں ہے تخمیناً ساٹھ سال کی عمر میں ۱۹۲۸ء میں انتقال فرمایا۔ غالباً ۱۸۶۸ء میں ولادت ہوئی ہوگی۔ صفر سنی میں والد محترم کا انتقال ہو گیا تھا اس لیے اپنے بڑے بھائی مولوی عبدالعزیز صدیقی اور اپنے حقیقی ماموں مولوی صلاح الدین کے عمل عاطفت میں پرورش ہوئی اس دور میں عام طور پر عربی و فارسی کی تعلیم کا چرچا تھا تمام مدارس و مکاتب اسی تعلیم کی آواز سے گونج رہے تھے۔ مولوی شیخ مظفر حسین صاحب نے اولاد ذکور میں دو لڑکے اور اناث میں ایک لڑکی چھوڑی۔ مولوی سخاوت حسین سخا نے درجہ مڈل تک ابتدائی تعلیم تلہر میں حاصل کی۔ جب مولانا کے شباب کا دور شروع ہوا تو ان کو علم دین حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے تلہر کا قیام ترک کر کے صنلع مراد آباد کا رخ کیا تحصیل حسن پور میں اس وقت ایک عربی اسلامی ادارہ 'مدرسہ عربیہ قادریہ' کے نام سے مشہور تھا۔ وہاں اپنا داخلہ کرایا۔ درسگاہ کے مدرسین میں مولوی احمد الدین صاحب صرف و نحو کی تعلیم کے لیے بڑے قابل اور اپنے فن میں ماہر تسلیم کیے جاتے تھے۔ مولوی صاحب نے باقاعدہ مولوی احمد الدین سے صرف و نحو کی تعلیم حاصل کی اور اس علم میں مہارت حاصل کر لی۔ مولوی سخاوت حسین کو نحو میں کافیہ ابن حاجب ازبیر یاد تھا اور صرف میں 'فصول اکبری' وغیرہ کتابیں بھی زبانی یاد تھیں صرف و نحو و معانی و بیان کی کتابوں سے فراغت حاصل کر کے انھوں نے عربی ادبیات کی تعلیم ماہر فن اساتذہ سے حاصل کی۔ بعدہ معقولات کی تمام درسی کتابوں کو جو درس نظامی میں داخل نصاب تھیں معقولات (فلسفہ و منطق) کے اساتذہ سے بڑی محنت کے ساتھ پڑھا۔ محمد بشیر میاں خلیفہ حضرت محمد شیرجی میاں پبلی بھیتی مدرسہ قادریہ حسن پور میں مولوی سخا صاحب کے ہم درس و ہم سبق تھے۔ معقولات کی تعلیم سے فراغت پا کر انھوں نے اپنی تمام تر توجہ منقولات یعنی حدیث، تفسیر، فقہ، فرائض وغیرہ کی تعلیم پر مبذول کر دی تھی دوران تعلیم میں قال اللہ قال الرسول کے سوا ان کا دوسرا مشغلہ نہ تھا۔ اس عہد میں حدیث کی تعلیم کے لیے شیخ الحدیث حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری کی ملک میں بڑی شہرت تھی اور حضرت شیخ الحدیث مدرسہ اسلامیہ عربیہ میرٹھ اندر کوٹ میں تعلیم دیا کرتے تھے چنانچہ مولوی سخاوت حسین بھی دورہ حدیث

کے لئے وہاں گئے اور جمادی الاولیٰ ۱۳۲۱ھ میں اسلامیہ میرٹھ انڈر کوٹ سے حدیث میں سند فراغت حاصل کی۔

تلہر میں خانوادہ صدیقی کا ذریعہ معاش وہ املاک و جاگیریں تھیں جو خاندان کے ذی علم افراد کو سلاطین مغلیہ جہانگیر سے لے کر سلطان محی الدین اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے اپنے عہد میں عطا فرمائی تھیں اس کے علاوہ خاندان کا مخصوص پیشہ معلمی تھا اس دور میں معلمی کے پیشہ کو بڑی عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں قصبہ تلہر میں ایک درسگاہ گلشن فیض قائم کی گئی تھی اس درسگاہ میں بلا امتیاز مذہب و ملت بچے تعلیم حاصل کیا کرتے تھے عام طور پر فارسی عربی اور اردو کا رواج تھا اسی گلشن فیض سے بعد فراغت تعلیم مولوی سخاوت حسین سنی متعلق ہو گئے اور ان کا تقرر مدرس دوم کی حیثیت سے ہوا۔ صدر مدرس مولوی مقصود علی صاحب کے انتقال کے بعد وہ صدر مدرس ہو گئے جو عرصہ دراز تک نہایت مستعدی و جانفشانی سے تعلیم خدمات انجام دیتے رہے۔ مولانا سخاوت حسین سنی کے دم سے تلہر میں لوگوں کو بڑا فیض پہنچا۔ ان کی ذات ستودہ صفات مرجع امام رہی ان کی تمام زندگی درس و تدریس میں گزری۔ اپنی وفات سے چند سال قبل بسلسلہ ملازمت وہ تلہر سے باہر بھی رہے۔ ان کا قیام اتالیقی کی حیثیت سے شیروانی خاندان کے ایک رئیس جناب حاجی یوسف علی خاں صاحب شیروانی کے یہاں بھی رہا وہ ان کے بچوں کو دینی تعلیم دیا کرتے تھے۔ زندگی کے آخری دور یعنی ۱۹۲۱ء میں قاضی نصیر الدین حیدر رئیس اعظم قاضی ٹولہ بدیمی کی دعوت اور ان کے شدید اصرار پر وہ بریلی تشریف لے گئے۔ قاضی صاحب نے مولانا صاحب کو اپنی عالی شان کوٹھی کا ایک کمرہ قیام کے لیے دے دیا تھا اور اپنے صاحبزادگان فصیح الدین، صبیح الدین و انیس الدین کی تعلیم پر مامور فرما دیا تھا جہاں ایک سال رہنے کے بعد وہ تلہر واپس آ گئے۔ حضرت مولانا کا حلقہ درس کافی وسیع تھا جس میں بلا امتیاز مذہب و ملت سنی شیعہ وغیرہ سب ہی شامل و داخل تھے۔ حلقہ تلامذہ میں وہ اپنے حسن اخلاق اور عدم تشدد کی بنا پر بہت مقبول تھے۔

زمانہ طالب علمی میں حضرت سخا کو شاعری کا شوق بھی پیدا ہو گیا تھا اس عہد میں شعر و شاعری کا ہر جگہ عام طور پر چرچا رہا کرتا تھا۔ حضرت سخا جس خاندان میں پیدا ہوئے وہ اہل علم و فضل کا گہوارہ تھا اور جس گھر میں انھوں نے آنکھ کھولی وہاں مذاکرات علمیہ کا شب و روز دور دورہ رہتا تھا سب سے زیادہ قریب ان کے حقیقی ماموں مولوی خلیل الدین صاحب راضی تھے جو فن شاعری

میں استادانہ حیثیت رکھتے تھے اور خاندان صدیقی کے ذی علم فرد خیال کیے جاتے تھے یہ حضرت امیر بینائی سے شرف تلمذ رکھتے تھے۔ راضی صاحب کی تحریک پر حضرت سخا نے شعر کہنا شروع کر دیا اس وقت حضرت احسان شاہ بھمانپوری کی ادارت میں ایک رسالہ 'پیام یار' نکلا کرتا تھا جس میں طرحی غزلیں شائع ہوا کرتی تھیں اس میں حضرت راضی اور حضرت سخا کی غزلیں بھی شائع ہوتی تھیں۔ مولانا کی شعرو شاعری کا سلسلہ زیادہ عرصہ تک نہیں قائم رہ سکا۔ کیوں کہ ان کے استاد محترم حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری نے اپنے شاگرد رشید حضرت سخا تلہری کو شاعری کرنے سے منع فرما دیا تھا۔ لائق شاگرد نے استاد محترم کی نصیحت پر پورے طور پر عمل کیا اور شاعری بالکل ترک کر دی۔ حضرت شیخ الحدیث کی ممانعت شعر گوئی سے پہلے حضرت سخا نے جو کچھ فرمایا وہ بھی زیادہ نہیں ہے۔ اس کا نمونہ تبرگہ درج کیا جاتا ہے تاکہ قارئین یہ قیاس کر سکیں کہ اگر وہ مشق سخن جاری رکھتے تو کس مرتبہ کے شاعر ہوتے۔

نمونہ کلام حضرت مولانا سخاوت حسین سخا تلہری۔

مصیبت شمع پر جو کچھ گزرتی ہے سحر تک ہے
یہ دل ہی ہے کہ جو بجھتا نہیں دن رات جلتا ہے
کیوں لطف نہ آئے وہاں گلشن سے زیادہ
محبوب کے کوچے کی ہوا اور ہی کچھ ہے
ٹکرانے کے سر سے نہیں ہوتا کوئی زاہد
سچ پوچھیے تو یاد خدا اور ہی کچھ ہے
ہم جان گئے منہ سے کہو یا نہ کہو کچھ
اب رنگ طبیعت کا سخا اور ہی کچھ ہے
متفرق شعر

کہتی ہوئی گئی ہے مرے دل سے آرزو

اللہ پھر کبھی نہ دکھائے یہ گھر مجھے

ایک تاریخی قصید جو قیصر ہند جارج پنجم کے ورود ہند ۱۹۱۱ء کے موقع پر لکھا تھا اس کے

کچھ اشعار نمونہ درج کیے جاتے ہیں۔

چمن دہریں کیا طرف بہار آئی ہے
جس کا یہ گنبد خضرا بھی تماشا شائی ہے
فرط شادی سے ہوتے غنچوں کے وابستہ قبا
گل کترتی ہوئی کیا تازہ فضا آئی ہے
آنکھیں نرگس نے بچھائی ہیں سر رہ اپنی
کس کی آمد کی خبر باد صبا لائی ہے
وہ نوا سنجی مرغان چمن کا عالم
جد تر تم نہ کسی بات کی شنوائی ہے
سرودر باغ بیک جاے استاد دست نگر
جارج پنجم کی جو آمد کی خبر پائی ہے

جلوۂ روشنی کثرت مصباح نہ پوچھو
 عدل سے اس کے برابر ہیں قوی اور ضعیف
 تیغ برتاں سے سوا ہے نظر قبر اس کی
 زلیست حاصل ہوئی پھر تنگم دہلی کو
 ختم کرتا ہوں دُعا پر یہ قصیدہ اپنا
 باغ عالم رہے سر سبز قدم سے اس کے

بزمِ پنجسم ہے کہ گردوں سے اتر آئی ہے
 مشرب ثور و اسد دہر میں یکجائی ہے
 اک اشارے میں عدو شاہ کا جوزائی ہے
 اس کے قدموں میں یہ اعجاز مسیحائی ہے
 اے خدا تجھ سے تمتائے پذیرائی ہے
 آج پھلدار ہے وہ شاخ جو مر جھائی ہے

جارج پنجم کا رہے دہر میں سکے جاری
 اسی مقصد کا سخا دل سے تمتائی ہے

منشی احسان علی خاں۔ احسان

منشی احسان علی خاں خلیفہ منشی قائم علی خاں شاہجہا پوری حضرت شاہ نصیر الدین
 چراغ دہلوی کے خلیفہ جلال الدین بخاری کی نسل سے ہیں ۱۲۶۶ھ میں بمقام اوٹا ضلع بریلی پیدا ہوئے۔
 ۱۸۵۶ء کے سیلاب میں بہہ کر شاہجہا پور چلے آئے اور یہیں کی مستقل سکونت اختیار کرنی۔ اسی شہر
 میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی اور پرورش پائی۔ سولہ سال کی عمر سے شعر و سخن کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔
 استاد وقت حافظ نثار احمد خاں تائب کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور مشق سخن سے صاف
 اور دلچسپ شعر موزوں کرنے لگے کچھ مدت بعد جب نواب حیدر علی خاں حیدر ابن نواب قادر علی خاں
 کو درس دینے کے سلسلے میں سید ضامن علی جلال لکھنوی شاہجہا پور تشریف لائے تو ان کی شاگردی
 قبول کر لی اور ایک مدت تک حضرت جلال لکھنوی کے ممتاز شاگردوں میں رہے۔ آخری دور میں
 دکن جا کر حضرت داغ دہلوی کے بھی شاگرد ہوئے تھے۔ جولائی ۱۸۹۶ء سے ایک گلہ ستر
 'ارمغان' جاری کیا جو دسمبر ۱۸۹۹ء میں بند کر دیا ارمغان کے ساتھ رسالہ 'تشبیہ یار' بھی جاری
 کیا تھا جو فن تشبیہ پر تھا۔ ۱۸۸۶ء میں محکمہ بندوبست گورکھپور میں ملازم ہوئے۔ گرداوری
 منصرمی اور پیشکاری کے فرائض ادا کئے ۱۸۹۰ء میں سند مختاری حاصل کر کے وطن آکر عدالت
 فوجداری کلکٹری میں مختاری شروع کر دی آخر زندگی تک ہی وسیلہ معاش قائم رہا۔ بریلی شاہجہا پور
 و دور و نزدیک کے نو مشق شعرا کثیر تعداد میں آپ سے مشورہ سخن لیتے تھے عربی کی لیاقت بقدر ضرورت اور فارسی کی زبردست

استعداد تھی۔ غزل گوئی کی طرف زیادہ مائل تھے۔ تاریخ گوئی میں مہارت تھی دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی قصیدے بھی تصنیف کئے اور اس وقت کے والیان ریاست کی مدح سرائی کی۔ نواب صاحب منگہ ولی کی تعریف میں ایک قصیدہ نام نہاد مناظرہ حسن و عشق نہایت نفیس و پر مضمون لکھا تھا۔ ایک دیوان نمکدہ خیال زندگی میں طبع ہو چکا تھا شاہجہانپور کی تاریخ بھی لکھی تھی جو ناتمام رہ گئی۔ اس تاریخ کا پتہ نہیں چلتا کہ کہاں غائب ہو گئی اور کس کے پاس ہے یا نذر وقت ہو گئی۔ سنا ہے کہ شاہجہانپور کی تاریخ کی ابتدا پیدائش حضرت آدم سے کی گئی تھی اور بہت تفصیل سے معلومات تحریر کی تھیں۔

محلہ مہمند جلال نگر میں سکونت تھی۔ ۲۲ ربیع الاول ۱۲۹۲ھ کو بروز پنجشنبہ حافظ جعفر خاں ابن غلام امام خاں ابن محمد یوسف خاں قوم افغان چکنی ساکن محلہ گاڑی پورہ کی دختر کے ساتھ شادی ہوئی۔ آپ کے فرزند آل نبی ارمان بھی شاعر اور احسان صاحب اپنے والد کے شاگرد تھے۔ حضرت احسان بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں رحلت فرما گئے۔ نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیے۔

دم بھر ادھر لڑی تو گھڑی بھر ادھر لڑی
مقتل میں جو لکھا تیری تیغ نظر لڑی
احسان شوق دید کا حیرت کا ہے سلوک
اس بت سے جلوہ گاہ میں پہروں نظر لڑی
وعدے کی شب جو بیٹھ رہے وہ عدو کے گھر
کیا کیا فلک سے آہ مری رات بھر لڑی
دل مرا کشتہ ہوا ہے خنجر بیداد کا
قتل گہ میں کیجئے جلو مبارک باد کا
آج بھی رہ جائے گی کیا دل میں حسرت قتل کی
دم چراغے لیتا ہے خنجر مرے جلا د کا
کیا کہوں نقش و نگار یار کی تعریف میں
وہ لورٹے لے گئے مری دولت سرائے دل
باقی اک آرزو نہ رہی دل میں ہائے دل
سنتا ہوں میں مذاق محبت نہیں انھیں
احسان ضبط و صبر کر و شکر حق کے ساتھ
تم کیوں مرے گھر آئے کچھ اس کی بھی خبر ہے
عشاق کو دکھانی ہے جادو کا تماشا
مجرم وہ محبت کا ہے کیا اس کا تعجب

ڈاکٹر قمر رئیس کو انڈیا آفس لندن میں ڈاکٹر مرزا محمد ہادی رسوا کے ناول "شریف زادہ" طبع ۱۹۰۵ء، شاہ اودھ پریس لکھنؤ کے آخر میں احسان علی خاں احسان کی یہ غزل ملی:

عشق سے فرصت نہ ملی دل کو سنبھلنے کے لئے

مجھ پہ آفت بھی جو آئی تو نہ ٹلنے کے لئے
 میرے سمجھانے سے یہ اور زخود رفت ہوئی
 آپ ہی کہیے طبیعت سے سنبھلنے کے لئے
 اسے غم و یاس یہ کیا بھیڑ لگا رکھی ہے
 راہ دو دل سے تمتا کو نکلنے کے لئے
 پاؤں رکھتا ہی نہیں فرس زمیں پر مغرور
 دو قدم کون کہے ناز سے چلنے کے لئے
 یہ تمتا ہے کہ پٹائے رہیں ہم احسان
 یار آغوش میں گھبرائے نکلنے کے لئے

نواب محمد جمیل الدین خاں - یاس

نواب محمد جمیل الدین خاں یاس خلع نواب ممتاز الدین خاں نواب بہادر خاں کی اولاد میں ہیں۔ فطرطاً ذہین و ذکی اور نہایت سلیم الطبع پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم امرار کے لاڈلے اور کھلاڑی بچوں کی طرح ہوئی۔ معمولی بیاقت تھی مگر بسبب ذہانت شاعری میں تھوڑی سی عنایت سے اچھا شعر کہنے لگے تھے۔ ابوالعجاز احسان شاہ بہا نپوری سے مشورہ سخن لیتے تھے۔ طبیعت معنی آفریں اور عاشقانہ پسند تھی۔ عین جوانی میں ۹ محرم ۱۲۳۴ھ کو انتقال ہو گیا۔ کوئی اولاد نہیں تھی۔ نوجوان بیوہ اپنے پیچھے چھوڑی۔

نمونہ کلام

اہلِ بخوم دیتے ہیں مژدہ وصال کا
 برپا کریں گے حشر کا ہنگامہ ایک دن
 ہنس بول کے گزار دو شبِ عیش و صل کی
 کرتا ہوں شکر طالع فرخندہ خال کا
 ہم جانتے ہیں حال حسینوں کی چال کا
 موقعِ خوشی میں آج نڈھونڈ ہو ملال کا

گھر میں بیٹھا ہوں آہیں کرتا ہوں دم تری عاشقی کا بھرتا ہوں

دم لبوں پر بے شدتِ غم سے
دیکھ اب کوئی دم میں مَرتا ہوں
شکوے اس بت کے میں کروں کیونکر
یاسِ قہرِ خدا سے ڈرتا ہوں

چمن میں پھر نظر آتے ہیں پھولِ جامِ بکنت
وہ رکھ کے ہاتھ سبرِ مدعی پہ کہتے ہیں
خدا کا شکر کہ پھر موسمِ بہار آیا
مری قسم کا تجھے اب تو اعتبار آیا

یہ تصور ہے وہ گویا پاس ہے
غیر سے بچنے کو لب پر رات دن
اس سے اچھا کون سا دوسو اس ہے
غم نہیں وہ بت کرے لاکھوں ستم
اب قل آغوذ بربِّ الناس ہے
یاس کو لطفِ خدا کی آس ہے

محمد وصی علی خاں وصی

محمد وصی علی خاں وصی ابن ملک شیر علی خاں ساکن محلہ امین زئی تھے۔ تعلیم معمولی تھی مگر شعرو سخن کا شوق تھا۔ طبیعت موزوں پائی تھی۔ منشی احسان علی خاں احسان کے شاگرد تھے۔ عالم جوانی ہی میں بتاریخ ۱۲ جمادی الثانی ۱۳۱۳ھ کو والدین کو داغ مفارقت دے گئے۔

نمونہ کلام

پوچھتے کیا ہو بلا آئی کہ آفت آئی
تو بھی اچھا ہے ترا حسن بھی اچھا لیکن
گھر میں اک جان کی دشمن شبِ فرقت آئی
ہو اگر حشرِ خرامی سے تجھے بھی انکار
ہم بھی اچھے ہیں جو اچھے پہ طبیعت آئی
کس بناوٹ سے شب وصل وہ بولے ہم سے
تیری ٹھوکر تو یہ کہتی ہے قیامت آئی
لے وصی۔ تجھ پہ ہماری بھی طبیعت آئی

قاصد کو بھلایا اثر آہِ رسا نے
تا صبح کوئی کام شب وصل نہ نکلا
دھوکے سے عدو کے مجھے آیا ہے بلانے
بے خود مجھے رکھا نگہ ہو شربانے

تم ناز سے چلو گے جو میدانِ حشر میں
 کیوں کر بتائیں دل کی جو حالت ہے آجکل
 اب کیا اٹھیں گے بسترِ غم سے کبھی دہی
 محشر بھی بول اٹھے گا قیامت کی چال ہے
 ہم خود نہیں سمجھتے ہیں کچھ ایسا حال ہے
 وہ ضعف ہے کہ آنکھ اٹھانا محال ہے

دل کی خواہش ہے کہ پہلو سے نکالا ہوتا
 دل کے جانے کا نہ ہوتا ہمیں ایسا افسوس
 رہزریں کسی معشوق کے ڈالا ہوتا
 ناز سے اس کو اگر ہم نے نہ پالا ہوتا

حکیم احمد حسین خاں - دانش

حضرت احمد حسین خاں دانش خلیفہ محمد حسین خاں ابن حضرت عباس خاں مونس
 متانی پٹھان تھے۔ ابتدائی تعلیم مدرسوں میں حاصل کی۔ فارسی پڑھ کر طب کا شوق ہوا۔ ضروری معلومات
 حاصل کر کے شاہ عبدالرحیم کی مسجد میں بیٹھ کر مطب کرنے لگے اور ساتھ ہی معلمی بھی۔ شاعری کا شوق
 تھا۔ حضرت احسان شاہ بہمانپوری کے شاگرد ہو کر مشورہ سخن کرنے لگے۔ ۱۸۸۶ء میں تلاش معاش
 میں گورکھپور کا سفر کیا مگر کوئی وسیلہ نہ پیدا ہوا۔ کچھ دنوں بعد اپنی سسرال فیروز آباد ضلع آگرہ
 چلے گئے جہاں میونسپلٹی میں محرری پر تقرر ہو گیا۔ جوان ہی تھے کہ انیسویں صدی کی آخری
 دہائی میں انتقال ہو گیا۔

نَمُونَةُ كَلَامٍ

کہوں میں اس سے دل کا مدعا کیا
 اشاروں میں بھی شانِ دلربائی
 خدا چاہے گا جھیلیں گے اسے بھی
 نہیں سنتا کسی کی جب وہ ظالم
 جو جھنجھلا کر کہے تو نے کہا کیا
 اسے سمجھے کوئی دل کے سوا کیا
 شبِ فرقت ہے اے گردوں بلا کیا
 ہماری آرزو کیا۔ مدعا کیا

بندر ہمتی ہیں شب و روز ہماری آنکھیں
راہ پاتے نہیں وہ دل سے نکلنے کے لئے
شمع کی طرح ہیں میرے جگر و دل دونوں
ایک جلنے کے لئے ایک گھلنے کے لئے

الم میں درد میں آہ و بکا میں
پڑا ہے ایک دل کس کس بلا میں

جو لوگ محبت کے گنہگار تھے دانش
میدان قیامت میں وہی بے خطر آئے

حسرتیں ہیں کہ تمنائیں ہیں ہم دیکھیں گے
مجھ سے کہتے ہیں دیئے جاؤ ذرا دل اپنا

عظمت علی ارشاد

عظمت علی ارشاد کا آبائی وطن شاہ آباد ضلع ہر دوتی تھا مگر ان کے والد بسلسلہ ملازمت
دہلی میں رہتے تھے اور دہلی ہی میں رحمت علی نے شادی کر لی تھی ان سے عظمت علی پیدا ہوئے۔
رحمت علی اور ان کی بیوی کا جب انتقال ہو گیا تو عظمت علی کے چچا کرامت علی جو ڈاکٹر تھے
عظمت علی کی پرورش کرتے رہے۔ کرامت علی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد راجہ نرائن سنگھ
رئیس پرور عظمت علی کو لے کر پرور چلے گئے جہاں رئیس پرور نے ایک شرفا خانہ کھولا تھا۔ جس
میں کرامت علی اور عظمت علی کو ملازم کر لیا تھا۔ پرور ہی میں ۱۵ مئی ۱۸۹۶ء شب پنجشنبہ یکم
ذالحجہ ۱۳۱۳ء زہر کھا کر راہی ملک عدم ہوئے۔ کہتے ہیں کسی پر عاشق تھے اس کی بے رخی
برداشت نہ کر سکے اور جان دے دی۔ جب تک دہلی میں رہے حضرت راسخ سے مشورہ شیخ
یا شاہجہاںپور آئے تو حضرت احسان سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ مذاق سخن اچھا تھا۔

نمونہ کلام۔

نگہ ملتے ہی لے لیا میرے دل کو
قیامت نھا ان کا ادھر دیکھ لینا
پئے سیر گل جاتے ہو کیوں چمن میں
ہمارا ہی زخم جگر دیکھ لینا

بچو دوہ بنانے کو ادھر دیکھ رہے ہیں ہم دور سے شوخی نظر دیکھ رہے ہیں
خالی نظر آتا ہے جو قاتل کا نمکدال ہنس ہنس کے اسے زخم جگر دیکھ رہے ہیں
وحشی تو شب غم میں نہیں ہو گئے ارشاد اٹھ اٹھ کے گریبان سے دیکھ رہے ہیں

لب پر اس شوخ کا گلا بھی ہے شکوہ بخت نارسا بھی ہے
بے وفائی کریں گے وہ کب تک ظلم کی ان کی انتہا بھی ہے

اب خوشی زندگی کی کیا ارشاد جان جانے میں کچھ رہا بھی ہے

میر فضل علی فضل

میر فضل علی فضل کی سکونت محلہ گاڑی پورہ کی تھی۔ کب ولادت ہوئی اس کے بارے میں معلوم نہ ہو سکا آپ چونکہ نواب غلام حسین خاں حسین کے شاگرد تھے اس لیے غدر ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے پیدا ہوئے ہوں گے۔ فضل کے متعلق مشہور ہے کہ نہایت ذہین تھے اور علم و فضل میں بھی ممتاز تھے۔ نواب غلام حسین کی معیت میں جب لکھنؤ تشریف لے گئے تو ناسخ نے دوران ملاقات اپنی ایک تازہ بتازہ غزل سنائی جس کا ایک شعر یوں تھا۔

ایک سے بچ جائے گر کوئی تو کاٹے دوسرا

دونوں زلفیں دونوں گالوں پر ہیں جوڑا سانپ کا

میر فضل علی نے غزل سن کر اسی وقت ایک شعر موزوں کر کے سنا دیا جس کی تعریف ناسخ اور نواب غلام حسین نے فرمائی:

دونوں زلفیں دونوں ابرو چار ہیں موزی بہم ایک ہے بچھو کا جوڑا ایک جوڑا سانپ کا
حکیم معشوق علی خاں صاحب جوہر شاگرد غالب نے مولوی صبیح الدین میاں صاحب سے فرمایا کہ
فضل نے فسانہ عجائب کو گلزار نسیم کی بحر و وزن پر منظوم کیا تھا اور عجیب صنعت و قابلیت سے
لکھا تھا اس فسانہ میں انجمن آرایا ملکہ مہر نگار کا سراپا انوکھے طریقے سے نظم کیا تھا۔ فضل صاحب

بسلسلہ ملازمت ریاست گوالیار رہے اور پھر جے پور کوچلے گئے وہیں انتقال ہوا ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپ کا انتقال لکھنؤ میں ہوا۔ سال رحلت کا پتہ نہیں۔ آپ کے ایک صاحبزادے سید محمد حسین یحییٰ شاعر تھے اور ریاست رام پور میں ملازم تھے۔

یہ شوق دید کہ پتھر کے رہ گئیں آنکھیں
نوک مڑگاں پہ تماشہ ہے مرے اشکوں کا
بزم میں مطرب و ساقی بھی ہے انگور بھی ہے
ہے یہ کس آرام جاں کا قصہ راحت فرا۔

ہمیں تو مر کے بھی اس بت کا انتظار رہا
سامنے دار بھی ہے آنکھوں میں منصور بھی ہے
میکشو مژدہ خم و ساغر بتور بھی ہے
لکھتے لکھتے ہو گئیں میری قلم پر انگلیاں

سید شریف الحسن - فوق

سید شریف الحسن فوق خلیفہ سید محمد اسحاق صاحب حضرت غوث الاعظم شیخ محمد عبدالقادر
یلانی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں تھے۔ باپ کے ناز پروردہ تھے۔ اردو فارسی اور عربی کی استعداد اوسط
درجہ رکھتی تھی۔ سید محمد علی میاں خیال سے عربی پڑھی تھی۔ کلام میں بھی انھیں سے مشورہ لیا مگر بعد میں حضرت جلال
لکھنوی کے شاگرد ہوئے اور مشورہ سخن لیتے رہے۔ انگریزی سے ناواقف تھے حیدر آباد جاکر وکالت کا
امتحان دیا اور وہاں رہ کر وکالت کا پیشہ اختیار کر لیا۔ ترقی کا زمانہ آیا ہی تھا کہ یکا یک نومبر ۱۸۹۲ء مطابق
ربیع الثانی ۱۳۱۰ھ کو روح نفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ عین عالم جوانی تھا۔ نہایت خوبصورت اور
وجیبہ تھے۔

نمونہ کلام

ان کے گیسو نہیں مشاط سنورنے والے
دل مدچاک کسی کا نہ ہو جب تک شانہ
اور مرے خون سے محشر میں مکر نے والے
نگہ لطف شہیدان محبت پہ زرا
جمع ہیں در پہ ترے سیکڑوں مرنے والے
پھر اسی خنجر ابرو کا اشارہ ہو جائے
ڈھونڈھ لیتے ہیں بہانہ کوئی مرنے والے
جان دی فوق نے فرقت میں بقول استاد

منظر ہیں عبث قیامت کے

دیکھ لیں چال یار کی واعظ

حالت کہوں میں کیا دل پر اضطراب کی
تیرے لبوں میں یار مزہ ہے شراب کا
اس بت کو ہے سکوت سوال رقیب پر
شاید سمجھ کے غیر کا نام لکھیں جواب

خود بھی خراب میری بھی مٹی خراب کی
میرے دل برکشتہ میں لذت کباب کی
لو اب خدا نے میری دعا مستجاب کی
قاصد مجھے، اُمید ہے خط کے جواب کی

سید محمد علی میاں خیال

شاہجہانپور میں بہت واجب التعظیم، نہایت صحیح النسب اور حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ سے ایک خاندان عمدہ جھنڈا کلاں میں آباد ہے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ حکیم سید اکبر علی میاں مرحوم و مغفور کے فرزند اصغر جناب سید محمد علی میاں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے دولت مند کیا تھا۔ شفیق والدین نے بہت ناز و نعمت سے پرورش کیا رسم مکتب کے بعد پڑھنے لکھنے میں مشغول ہوئے۔ نہایت ذہین و طباع تھے اور شوق علم بھی بید تھا اس لئے برابر پڑھتے رہے۔ طبیعت کبھی اچاٹ نہیں ہوئی۔ علماء و فضلاء سے فارسی پڑھی۔ عربی پڑھی۔ طب پڑھی۔ دماغ فلسفیانہ پایا تھا۔ منطق نہایت ذوق و شوق اور کمال کوشش و محنت سے پڑھی علاوہ اس کے قوت تقریر بہت زیادہ تھی۔ ہمیشہ اپنے ہم عمروں اور ہم سبقوں میں ممتاز رہے مگر جو کچھ پڑھا شاہجہاں پور ہی میں پڑھا۔ تعلیم کا زمانہ ہی تھا کہ شاعری کا شوق پیدا ہو گیا۔ شعر موزوں کرنے لگے مونی میاں مرحوم کے مکان میں مشاعرہ ہوتا تھا وہاں جانے لگے۔ سخن فہمی کی قوت ابتدا ہی سے اچھی تھی مضامین کی جدت کو خوب سمجھتے تھے چنانچہ منیر شکوہ آبادی اور غالب و مومن ہر وقت زبان پر تھے کلام ان کا دل سے پسند تھا اور خود بھی انھیں اساتذہ کے رنگ میں غزل لکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ عالم خیال سے ڈھونڈھ کر خیال تخلص لائے اور اسی کو اختیار کیا۔ مولوی علیم الدین مرحوم سے منقول و معقول اور مولوی نور الدین سے بھی معقول پڑھ کر جب فارغ ہوئے تو خود طلباء کو درس دینے لگے۔ صبح کو یہ شغل ہوتا تھا جو آتا اس کو محبت اور شوق سے پڑھاتے اس کے بعد آزاد تھے۔ دوستوں سے ملنے اور سیر و تفریح سے جی بہلاتے فن موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔ حضرت جب پڑھ کر مدرسے سے مکان کو آتے تھے تو راستے میں ایک

ستار نواز برہمن کے پاس بیٹھتے اور کچھ دیر ستار بجا کر مکان کو واپس آتے تھے گو بعد کو یہ شوق کسی وجہ سے جاتا رہا مگر خوش الحانی کا ذوق دل سے کبھی نہیں گیا۔ اچھا گانا سنا کہ بیتاب ہو گئے۔ حضرت خیال بڑے رنگین خیال اور آزاد منش آدمی تھے آپ کشیدہ قامت تھے شکفتہ اور گول چہرہ، فراخ سینہ تھا۔ سر پر چھوٹے چھوٹے بال جن کو نہایت خوبصورت بیل کی دوپٹی ٹوپی سے چھپائے رہتے۔ خشکی داڑھی۔ لباس میں ڈھیلا پاجامہ جس میں تقریباً آٹھ انگل کی خوبصورت گوٹ لگی ہوئی۔ چھ کلیا انگر کھا اس کے پینچے کرتا مگر شاہجہاںپور والوں کی طرح نہ کندھے پر رومال اور نہ ہاتھ میں پانوں کی ڈبیا اور بٹوا۔ وضع جسمانی و لباسی میں مولانا خیال فرد تھے باوجود ذی علم ہونے کے ٹخنے سے اونچا پاجامہ پسند نہیں تھا۔ لکھنؤ کے خوش وضع اور خوش لباس حضرات کی تقلید پیش نظر تھی تمام عمر ایک ہی وضع سے ختم کر دی۔ موسم سرما میں سرمائی کپڑوں کے پہننے کا بوجھ بھی طبیعت نے کبھی گوارا نہیں کیا سردی میں گرمی کے لباس کا استعمال انھیں کام تھا۔ آزادی کا یہ حال تھا کہ کبھی نہ گھر کا کام دیکھا نہ کاروبار زمینداری کی طرف توجہ کی نہ اہل برادری اور اپنے گھر کی شادی وغنی سے سروکار رکھا۔ بے فکری کا یہ عالم کہ گھر سے نکلے پاس کوڑی نہیں۔ سامان سفر ساتھ نہیں نہ پھر کارادہ دوستوں نے ہاتھ پکڑا زبردستی ریل پر بٹھایا اور لکھنؤ جاتا رہا۔ مولانا خیال کو اس کا خیال بھی نہیں کہ گھر والے پریشان ہوں گے چار پانچ روز دوستوں کے ساتھ تفریح کی اور گھر کو واپس چلے آئے۔ ایسا واقعہ چند بار ہوا۔ گھر والے سمجھ جاتے تھے۔ اتہما سے زیادہ آزادی کا اثر سمجھا جائے یا رنگین مزاج احباب کی صحبت کا رنگ خیال کیا جائے کہ مولانا خیال کو حضرت غالب کی طرح میگساری کا شوق بھی تھا۔ سنا ہے موضع راجھا کے رہنے والے سید ہادی حسن معلیٰ کے سلسلے میں آئے اور مولانا خیال کے مکان میں قیام کیا۔ مولانا ہادی حسن تحت اللفظ مرثیہ بھی پڑھتے تھے اور خوش لباس بھی تھے اہل لکھنؤ کی وضع پر داڑھی بھی کتری ہوئی رکھتے تھے۔ شعر گو بھی تھے ہادی تخلص تھا مگر شرابخو بھی تھے ابتداء میں جب مولانا خیال کا ان سے یارانہ ہوا تو حضرت ہادی نے اپنے رنگ میں رنگ لیا وضع بھی اپنی سی بنادی اور میخواری بھی سکھادی۔ زندگی بھر ساتھ رہا اور پیتے پلاتے رہے۔ مشہور ہے کہ ہادی حسن نے اپنی صحبت میں اکثر دوستوں کو شرابی بنا دیا۔ آدمی بظاہر نیک طبیعت اور خلیق تھے۔ ہادی صاحب کا ۲۵ اگست ۱۸۹۲ء بعارضہ وجع الصدر انتقال ہوا۔ حضرت خیال ان تمام مشغلوں کے باوجود پابند صوم و صلوات تھے دیکھنے والوں نے دیکھا کہ رنڈی کے گھر میں تفسرینا

بیٹھے ہیں با وضو ہیں نماز کا وقت آگیا فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور کسی گوشہ میں رومال بچھا کر نماز ادا کر لی۔ مزاج ایسا ہنس مکھ اور مہربان مریخ کہ کسی سے کبھی سخت بات نہیں کی نہ کسی سے شر کیا دوسرے کا غصہ ہمیشہ ہنس کر مٹال دیا۔ ہر شخص مولانا کا لحاظ و پاس کرتا اور تعظیم سے پیش آتا تھا۔ مشاعرہ میں ایسی عمدہ ترکیب اور خوش ادائیگی سے غزل پڑھتے تھے کہ سارا جلسہ بے تاب ہو جاتا تھا۔ اور اس کثرت سے داد ملتی تھی کہ جھولیاں بھر لیتے تھے اس طرح پڑھنے سے رنگ غزل بہت خوشنما ہو جاتا تھا مولانا نے اساتذہ کے دو ادیب فارسی اور اردو بہت دیکھے تھے اس لیے ان کو سیکڑوں شعر چیدہ چیدہ یاد تھے۔ فارسی گوئی کی طرف توجہ نہیں کی ورنہ فارسی کی علمی قابلیت ایسی تھی کہ بہت عمدہ فارسی گو شاعر ہوتے۔ سخن فہمی کا مادہ طبیعت میں اچھا تھا شعر کا حسن و قبح خوب سمجھتے تھے وہ جتنے اچھے سخنور تھے اس سے کہیں اچھے سخن فہم تھے۔ ابتدا میں دو چار غزلیں مولانا نثار احمد خاں تائب کو دکھائیں اور مشورہ سخن یا مگر اس زمانے میں ہو اور دوسری تھی محمد علی خاں و فخر آبادی اور منیر شکوہ آبادی کی جدت کلام پر لوگ مٹے ہوئے تھے۔ حضرت تائب کا مشورہ مولانا کو ناپسند ہوا اس کے بعد خود و شاعر بن گئے جو کچھ کہتے مشاعروں میں پڑھتے۔ داد سخن پاتے مجال کس کی تھی کہ ایک منطقی اور ذی علم شخص کے سامنے زبان اعتراض کھوتا بعد رحلت نواب کلب علی خاں وائی رامپور حضرت امیر احمد ترک تعلق کر کے لکھنؤ میں رہنے لگے تھے اسی زمانے میں مولانا خیال لکھنؤ پہنچے اور حضرت امیر سے ملے اور کچھ ایسے پسند آنے کہ مولانا خیال نے شاہجہانپور واپس آکر حضرت امیر کی شاگردی کا اعلان کر دیا۔

مولانا خیال بڑے بزرگ و خوش تقریر و ظریف و حاضر جواب تھے۔ اچھے اچھے علماء و فضلاء شعراء سے ملے تھے ذی علم و ذکی تھے اور علم سینے میں محفوظ تھا اپنے ہم عصروں میں شاعر بھی اچھے تھے نازک خیالی اور جدت کے عاشق تھے۔ مولانا خیال جس طرح عجیب و غریب حالات کے انسان تھے اسی طرح ان کی موت بھی عجیب حالات میں واقع ہوئی۔ محلہ رنگینے چوپال میں ۲۰ جنوری ۱۹۰۶ء کو اتوار کے دن حسب معمول مشاعرہ تھا مولانا خیال بھی شریک مشاعرہ ہوئے۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ شعراء نے غزلیں پڑھیں آخر میں نوبت مولانا خیال کی آئی غزل پڑھی مطلع تھا

آئی تھی شب ہجر کے پردے میں قضا بھی ظالم یہ تصور ترا دم بھر کو ہٹا بھی
مولانا خیال نے غزل ختم کی اور خوب داد پائی اس کے بعد اور سب سے آخر حضرت

ماتب نے غزل شروع کی ہنوز ایک مطلع پڑھا تھا اور دوسرا مطلع پڑھ رہے تھے۔

دوڑی ہوئی آئی سوئے مقتل ہے قصا بھی

قاتل ہے چلا کھینچے ہوئے تیغ ادا بھی

یہ ایک مولانا خیال کے سینے سے ایک دردناک آواز نکلی اور اُن کے ایک طرف کو مٹھکتے چلے گئے۔ اجل نے ایک پل کی جہلت نہیں دی اور روح پرواز کر گئی۔ تمام مشاعرہ میں کہرام پڑ گیا۔ جیتی جاگتی تصویر خاک میں مل گئی۔ دو سکر دن سپرد خاک کیے گئے۔ خدا جنت نصیب کرے مولانا خیال کا دل ہمیشہ خلوص و محبت اور انسانیت سے بربز رہتا تھا۔ بلا کے فخر اور فراخ دل تھے اپنے در سے کسی ضرورت مند کو محروم نہیں جانے دیتے تھے۔ جس کو جس چیز کی ضرورت پیش آئی بخرندہ پیشانی، عجز کے ساتھ نذر کر دی۔ ان کی آزادی میں کبھی کوئی چیز حائل نہیں ہوئی۔ مولانا ممدوح کے بڑے بھائی سید محمد ولی میاں زندہ تھے وہ بعد انتقال اپنے والد سید اکبر علی میاں کا روبرو خانہ داری اور انتظام ذمہ داری با اختیار خود کرنے لگے تھے اور پہلے سے بھی مختار تھے اس زمانے میں مولانا سید محمد علی میاں ہر باو سے بالکل سبکدوشی اور آزاد تھے لیکن جب اٹھارویں محرم ۱۳۱۹ھ مطابق ۸ مئی ۱۹۰۱ء بروز بدھ ان کا انتقال ہو گیا تو مولانا خیال اپنی تنہائی سے گہرا گئے اور تردد میں پڑ گئے کہ آزادی مقید ہوگئی اور پاؤں میں زنجیر پڑ گئی۔ گھر میں پاؤں توڑ کر کس طرح بیٹھیں گے اور خانگی بھگڑے کیوں کر طے ہوں گے مگر واہ رے زندہ دل کہ آزادی کی آن بان نہیں بھوڑی نقصان برداشت کیا اس طرح چلنا پھرنا بلنا جلنا شطرنج گنچہ چوسر تاش شاعری آجباب کی صحبت کا لطف اٹھانا قائم رہا۔ خدا کے فضل و کرم سے اولاد جوان ہوگئی تھی وہ سب کام کرتی تھی اور مولانا صاحب کی برائے نام نگرانی تھی۔ سید محمد ولی میاں بھی بڑے خوش مزاج اور مہمان نواز و دانشمند و منظم شخص تھے ان کی ذات ہم عصروں میں غنیمت تھی گو جوانی دیوانی کے جوش میں ابتداً تو سب کچھ کیا آخر میں توبہ کر کے ایسے سچے کہ بالکل ثقہ بن گئے۔

حضرت خیال کے فرزند سید محمد نبی میاں نے اپنی زندگی نہایت احتیاط اور وقار سے گزاری اب ان کے پوتے سید محمد ممتاز علی میاں حیات ہیں (خدا تادیر زندہ رکھے شہر کی آبرو ہیں) ذی علم اور صاحب ذوق ہیں یقین ہے کہ مولانا سید محمد علی میاں خیال مرحوم کے مرتبہ دیوان سے جوان کی تحویل میں ہے انتخاب کر کے ایک مجموعہ زیور طباعت سے آراستہ فرمانے میں مزید تاخیر نہ ہونے دیں گے تاکہ عاشقان کلام خیال شاد کام ہوں۔

اب قارئین! حضرت خیال مرحوم کے کلام سے لطف اندوز ہوں۔

نظر اس شان سے اس شوخ کی صورت آئی
میرا کیا ذکر ہے حیرت کو بھی حیرت آئی
ناتوانی بھی ہوئی قوتِ بازو لیکن
مجھ میں ہستی سے گزرنے کی نہ طاقت آئی
پہلے اپنے بت پندار کو توڑا ہوتا
تجھ کو زاہد نہ کبھی طرز عبادت آئی
دمدم عشق میں حالت متغیر ہے خیال
چہرے سے ایک گئی دوسری رنگت آئی

دیکھا نہیں دل کی طرف اس جان ادا نے
مشکل ہوئی گردیکھ لیا آ کے قضا نے
حق یہ ہے جو ایمان کی پوچھے کوئی ہم سے
آپ اس بُتِ کافر کو بنا یا ہے خدا نے
یوں نکلی خیال آرزو سے دل کہ نہ نکلی
پرے ہی میں رکھا شبِ وصل اس کو حیا نے

دل پستی ہے لغزش پا کا یہ حال ہے
ظالم کی بے پئے ہوتے مستانہ چال ہے
مشاطگی رحمتِ حق کا خیال ہے
کیا ہے گناہگار اگر بال بال ہے
حل ہو چکا ہے پیرمغاں سے یہ مسئلہ
حاجت کے وقت خونِ بطمے حلال ہے
زاہد بھی آ کے عشق کا اعجاز دیکھ لے
بت مجھ سے بولتے ہیں یہ میرا کمال ہے

اس وجہ سے یہ رنگ طبیعت ہے اے خیال

معشوق وہ ملا ہے جو نازک خیال ہے

ہیں تیرے نقشِ پا کی بدولت نگاہ میں
محشر سے لاکھ فتنہ خوابیدہ راہ میں
زخمی تو دل ہے زخم مگر بے نشاں ہیں سب
عنقا کے پر ہیں آپ کے تیرنگاہ میں

حشر کرتے ہیں وہ یا اس سے سوا کرتے ہیں
دیکھیے شوخی رفتار سے کیا کرتے ہیں
زخمِ دل حان گتے ہوں گے کوئی راز کی بات
کہ یہ رونے کے عوض خوب ہنسا کرتے ہیں

وصال کی جو اشاروں میں گفتگو ہوتی
تمہیں کہو، مجھے مرنے کی آرزو ہوتی
ترے وصال میں جیتا فراق میں مرتا
یہ آرزو جو نہ ہوتی وہ آرزو ہوتی
فشارِ ضعف سے اتنا ہو بدن میں نہیں
خیال تیغ جو قاتل کی سرخرو ہوتی

سید منور علی سحاب

سید منور علی سحاب خلف اصغر علی ساکن محلہ تلیا گھورن ایک غریب گھرانے کے تھے اس سے عمدہ تعلیم حاصل نہ کر سکے اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم کے بعد سلسلہ تعلیم منقطع ہو گیا۔ نہایت ذہین و طباع تھے۔ آغاز شباب کا زمانہ آیا تو مادہ موزونیت نے جو دل و دماغ میں فطرت کی طرف سے ودیعت تھا اپنا کام شروع کر دیا۔ شاہجہانپور میں بہادر علی قاری اور کریم بخش فرقت کی وجہ سے مشاعر ہوتے رہتے تھے۔ شاعری کا چرچا تھا۔ منور علی کی طبیعت بھی غزل گوئی کی طرف مائل ہوئی۔ غزل کہہ کر حضرت فرقت سے مشورہ سخن لیا اور مشاعرے میں پڑھی۔ تھوڑے دنوں بعد حضرت فرقت کے بجائے حضرت احسان سے مشورہ سخن لینے لگے اور سحاب تخلص قرار پایا۔ بہت جلد احسان صاحب کے ہونہار شاگردوں میں گنے جانے لگے۔ باوجود کم علمی کلام بہت صاف اور دلچسپ ہوتا تھا مگر منور علی سحاب عمر بہت کم لے کر آئے تھے۔ ایک ہونہار اور دنیا سے سخن میں نام پیدا کرنے والا جوان الشعر شاعر مبتلا سے پہنچنے ہو کر بروز جمعرات ۱۹-۸ء مطابق ۲۲ ذی قعد ۱۳۲۴ھ اس دنیا سے فانی کو چھوڑ کر راہی ملک بقا ہوا۔

نمونہ کلام

وہ دل رہے جو بھرتا ہے دم تیری چاہ کا	میں بھی دعا طلب ہوں تیرے خیر خواہ کا
لغزش ہوئی نہ دل کو کچھ اظہار درد میں	مجھ سے بیان چست ہے میرے گواہ کا
وہ آگے جو پرکشش غم کو شب فراق	چوما اثر نے دوڑ کے منہ میری آہ کا

آوارہ گھر سے صورت بوئے چمن ہوا	جوش جنوں میں یوں میں غریب الوطن ہوا
آنکھیں بھی تو اٹھانے سکا روبرو سے یار	کیسا خضیف آج مرا بانگین ہوا

نہ ٹالو آج تم مجھ کو ہنسی میں	کہ میں اک آرزو لایا ہوں جی میں
تیکڑے سے نہ دیکھو آرسی میں	وہ منہ پر کہہ نہ دے کچھ دل لگی میں
سحاب ایمان اپنا کھونہ دینا	کسی کا فرادا کی دوستی میں

قضا کا کام کرے جو، وہ ہے ادا کس کی
 مے جنازے کے جو ساتھ ہیں وہ دیکھ تو لیں
 وہ مجھ سے پوچھے تو کہہ دوں ترے سوا کس کی
 یہ پیچھے پیچھے ہے حسرت برہنہ پاکس کی

بابو راجہ بہادر احقر

بابو راجہ بہادر احقر ایم۔ اے (فارسی) خلف منشی سوہن لال حقیر قوم کے کہروا کا لیٹھ اور محلہ مظفر گنج کے قدیمی رہنے والے تھے۔ ان کی ولادت ۱۸۰۹ء میں ہوئی تھی۔ اپنے ہم عمروں میں حسین و خوبرو اور نازک اندام و کشیدہ قامت تھے۔ شاہجہانپور گورنمنٹ اسکول سے انٹرنس پاس کر کے لکھنؤ سے ایم۔ اے کیا اور منصفی کے لئے منتخب کر لئے گئے ادبی مذاق بہت صاف ستھرا تھا۔ قابل اور لائق باپ کی لائق اولاد تھے۔ شعر و شاعری سے بھی رغبت تھی خود بھی شعر موزوں کرتے تھے۔ حکیم حافظ معشوق علی خاں جوہر شاگرد غالب سے قصائد خاقانی اور حذیقہ حکیم ثنائی کے مطالب وغیرہ حل کئے تھے کیوں کہ ایم۔ اے کے کورس میں اسی مرتبہ کی مشکل اور دقت پسند کتابیں شامل تھیں۔ احقر نہایت ہونہار اور باپ کے اکلوتے بھی۔ اس وقت تک شاہجہانپور میں کسی نے ایم۔ اے کی ڈگری نہیں پائی تھی وہ پہلے شخص تھے افسوس کہ قضا نے جلدی کی اور بمر ۲۶ سال والدین کو داغ مفارقت دے گئے۔ موتی میاں کے یہاں ایک مشاعرے میں وہ بھی شریک تھے اور اپنی غزل پڑھی تھی جس کا ایک شعر دستیاب ہوا ہے جو ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

گردن نہ ہلے کہیں تہہ تیغ
 احقر یہی وقت امتحاں ہے

لالہ یگانہ

محمد عمر خاں ہی کے شاگرد اور اسی نام سے مشہور تھے ۱۲۰۸ھ میں انتقال ہوا۔ فارسی میں شعر کہتے تھے حضرت سرور سے بھی استفادہ کیا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کس خاندان سے

تعلق تھا۔ کب پیدا ہوئے اور ان کا اصل نام کیا تھا سرور نے اپنے تذکرہ میں زیادہ حال تحریر نہیں کیا ہے کلام کا نمونہ ہدیہ ناظرین ہے۔

از بہر دیدن نو سراپا نظارہ ام ہم شبنم و ہم آئینہ ام ہم ستارہ ام

از بسکہ حسیں اندہمہ اہل زمانہ در کیسہ ماہی بگذارند درم را

دشنام ز لعل لب جاناں مزہ دارد ترشی سیاں شکر ستاں مزہ دارد

دیدم چو ترا اشک فرور بخت ز چشم گر دید برائے تو گہر بارنگاہم

ہر نگاہ چشم جادوئے کہ افسوں کار داشت یاد آیا میکہ زلف پیچ و تاب یار داشت

کیکہ در کو بہار عالم چو لار داغی بکام دارد
مدام از سر خروئی خود شراب گلگوں بجام دارد

نواب کرامت اللہ خاں - کرامت

نواب کرامت اللہ خاں ابن نواب ارادت اللہ خاں خلف حافظ الملک نواب حافظ رحمت خاں شہید نے اپنی نانہال میں پرورش پائی۔ نواب عبداللہ خاں آخری وانی شاہانپور نانا تھے۔ جنگ دو جوڑہ جس میں وزیر الملک نواب شجاع الدولہ کے قصابے میں حافظ رحمت خاں کو شہادت و شکست نصیب ہوئی اور خاندان تباہ و برباد ہو کر تتر بتر ہو گیا تھا۔ نواب ارادت اللہ خاں اپنی سسرال چلے آئے تھے اور یہیں کی خاک کا پیوند ہو گئے۔ قلعہ اس زمانے میں شعر و سخن کا مرکز تھا شاہجہانپور کے سخنوروں کی آمد و رفت رہتی اور مجلسیں منعقد ہوتیں اور گاہے گاہے لکھنؤ دہلی کے نامور شعرا بھی مدعو کیے جاتے تھے۔ اسی ماحول میں

نواب کرامت اللہ خاں کرامت سن شعور کو پہنچے شعر و شاعری کا شوق پیدا ہو گیا۔ شعر موزوں کرنے لگے۔ اُردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے مگر کل کلام بزمانہ غدر ۱۸۵۷ء تلف ہو گیا۔ فارسی کا ایک شعر دستیاب ہوا ہے جو نذر قارئین ہے۔

جاں بُرد نہ تنہا ز من آں آفت جانے
شد جاں بچہاں کشتہ آں جان جہانے

شیخ عنایت حسین۔ عنایت

شیخ عنایت حسین عنایت خلیفہ شیخ عبدالجبار محلہ گاڑی پورہ کے رہنے والے تھے۔ فارسی کی استعداد اچھی تھی فوج سے پنشن یافتہ تھے۔ نہایت متین و مہذب اور خوش گفتار آدمی تھے۔ شعر کہتے تھے مگر یہ نہیں معلوم کس سے اکتساب فن کیا۔ اس دور میں مولوی کاظم علی کا شہرہ تھا ممکن ہے انھیں سے مشورہ سخن لیا ہو ۱۸۵۷ء کے بعد اخیر تیرہویں صدی ہجری میں انتقال ہوا۔ چند اشعار دستیاب ہوئے جو نقل کیے جاتے ہیں۔

ناتوانی کے سبب آپس میں دونوں مل گئے
خجر بکف پھر تو نہیں ہے مضائقہ
کیا خوشگوار ذائقہ آب تیغ تھا
رنگ رو میرا تمھاری زعفرانی چوڑیاں
پھبتی نہیں ہے تم پہ ابھی بالے پن میں تیغ
مشتاق ہو کے زخم نے رکھ لی دہن میں تیغ

منشی سیوارام جوہر

منشی سیوارام جوہر عیوض رائے مسرت کے شاگرد تھے نسباً کالیستھ اور محلہ رنگ محلہ کے باشندے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے دوران کسی بات سے استاد سے خفا ہو کر کلکتے چلے گئے تھے اور وہیں تملہ علم کیا مگر جب شاہجہانپور واپس آئے تو استاد اس درمیان سفر آخرت کر چکے تھے۔ جوہر کو استاد کے انتقال کا بے حد غم ہوا۔ گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ تصنیف و تالیف

میں مصروف رہے۔ 'دلیل الترتیب'، 'جوہر الترتیب'، 'املائے جوہری اور جواہر الترتیب' آپ کی تصنیفات سے ہیں یہ تصنیفات عنقا ہو گئیں۔ شاعر بلند مرتبہ تھے۔ اولاد موجود نہیں ہے۔ چند اشعار جو دستیاب ہو سکے درج ذیل ہیں۔

ابیات درخاتمہ کتاب جواہر الترتیب

بعد فن نحو خواں فن معانی و بیباں
تا شوی بالغ بہر یک طرز اے عالی مقام
کا ملاں اصلاح مضمض منصفال تحسین کنند
عرض دارد جوہر بے جوہر اکنوں از کدام
طالبان راحت ز نظم کامیاب فیض کن
تا دعائے شاں مرا از رحمت سازد بجام
سال ہجرت یک ہزار و دو صد افروز سی پنچ
عہد ظل اللہ اکبر شاہ کردم اختتام
منشی سیوارام جوہر نے جواہر الترتیب کا ۱۲۳۵ھ میں اختتام کیا۔ اس کے بعد کب تک
حیات رہے اور کب راہی ملک عدم ہوئے تو تاریخ خاموش ہیں۔

منشی امین خاں امین

منشی محمد امین خاں صاحب امین شاہجہاں پور کے باشندہ اور مہتمم رسالہ 'رمغان شاہجہاں پور' کے شاگرد تھے نمونہ کلام بابت ماہ اپریل ۱۸۹۶ء سے نقل کر کے ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ مزید حالات معلوم نہ ہو سکے۔

طعنے دینے لگے اس نبت سے جو الفت دیکھی
غیر تو غیر ہیں اپنوں کی یہ حالت دیکھی
عشق میں رنج ہے ہجر کی آفت دیکھی
دل نے جو ہم کو دکھائی وہ مصیبت دیکھی
دیکھ کر میری طرف غیر سے فرماتے ہیں
آپ عاشق ہیں مرے، آپ کی صورت دیکھی
حسن محبوب کی تعریف تو ممکن ہی نہیں
مختصر یہ ہے کہ اک نور کی صورت دیکھی
طالبان سے نہیں ملتی ہے الہی تو بہ
تیری ثابت قدمی اے شبِ فرقت دیکھی
جو مرے دل پہ گزرتی ہے وہ تم کیا جانو
تم کبھی آتے مرے گھر مری حالت دیکھی
دل سے جاتے گی کبھی ان کی محبت نہ امیں
جو نہ بھولے گی کبھی ہم کو وہ صورت دیکھی

سید احمد شاہ - مُشیر

سید احمد شاہ مُشیر شاہجہانپور کے رہنے والے اور حضرت حسن بریلوی کے تلامذہ میں تھے نمونہ کلام رسالہ 'بہار بے خزاں' بریلی بابت نومبر ۱۹۰۳ء سے نقل کیا جاتا ہے۔ وہاں بزم عود میں ان کی چوٹی گندھنے والی ہے کسی نے زلف پیچاں کھول کر شانوں پہ ڈالی ہے لڑکپن جانیوالا ہے جو انی آنے والی ہے میری بالیں پہ میری حسرتیں مل مل کے روتی ہیں سوال وصل پر منہ پھیر کر جھنجھلا کے فرمایا لہو جب پی چکا سوزِ جدائی خون کا پیاسا

یہاں حسرت نے پھانسی گردنِ عاشق میں ڈالی ہے
خبر ہے عاشقوں کو آج پھانسی ہونے والی ہے
ابھرنے والے جو بن نے عجب سبج دھج نکالی ہے
اجل تسکین دیتی ہے کہ صحت ہونیوالی ہے
اے کجخت تو نے کیوں ہماری جان کھالی ہے
زباں تب ہاتھ بھر کی تیغِ فرقت نے نکالی ہے

مُشیرِ خستہ کے مرقد پہ وہ رورو کے کہتے ہیں

اسیرِ قیدِ تنہائی ترا اللہ والی ہے

محمد ریاض الرضا خاں فروغ

والد کا نام احمد رضا خاں تھا۔ نسباً علینزی پٹھان۔ اعلیٰ خاندان اور شرفائے شہر سے تھے۔ محلہ علینزی میں سکونت تھی۔ شاعری سے بے حد شوق تھا۔ بھگو گئی میں آپ کو سودا کا مرتبہ حاصل تھا ایک دیوان 'پگاہ فروغ' ۱۳۱۳ھ میں طبع ہو چکا تھا۔ قصبہ شاہ آباد ضلع ہردوئی میں ناہنہال تھی اور وہیں ۱۳ مارچ ۱۹۱۴ء کو آپ نے رحلت فرمائی۔ اپنے ناہنہالی قبرستان میں مدفون ہوئے۔ آپ کے انتقال کے بعد کہتے ہیں کوئی صاحب آپ کا کلام اٹھالے گئے جس کا پتہ نہ لگ سکا 'تاریخ صبیح' میں صرف ایک شعر تحریر ہے۔ راقم الحروف نے اپنی بساط بھر مزید کلام حاصل کرنے کی از حد کوشش کی مگر ناکام رہا مجبوراً اسی ایک شعر کو تیرک سمجھ کر درج ذیل کرتا ہے۔

شعر۔ طیش سے بڑھا اور بھی حسن یار کنہیا بنے وہ جو سوؤ نلا گئے

منشی ہری رام خورم

تذکرہ سرور سے اس قدر پتہ چلتا ہے کہ منشی ہری رام خورم محلہ گاڑی پورہ کے باشندہ تھے۔ پیشہ طبابت تھا اور لالہ بہت پرشاد سرور کے تلامذہ میں تھے۔ شعر و سخن کا شوق دیوانگی کی حد تک تھا۔ خاندانی و دیگر ذاتی حالات کا پتہ نہیں چلتا۔ دو شعر مولوی صبیح الدین میاں مولف تاریخ صبیح نے خورم کے لکھے ہیں وہی یہاں درج کیے جاتے ہیں ان کے علاوہ کلام دستیاب نہیں ہوا۔

ابھی گو ہر گوش جہاں کن داستا نم را
بہ بحر لفظ و معنی آشنا گرداں ز بانم را
آن لب جاں بخش را آلودہ صہبا ممکن
خون مشتاخاں خود بر گردن مینا ممکن

منشی دیارام دانانا

قوم کے کالیتمہ باشندہ شاہجہاںپور تھے۔ فن شعر میں لالہ سب سیکھ رائے مسرور کے ممتاز اور قابل شاگرد تھے۔ یگانہ فرحت۔ وہبی۔ نثار۔ سرور۔ اظہر۔ ساقی۔ مجروح۔ خورم۔ مسرت وغیرہ جن کا زمانہ حیات یکے بعد دیگرے ختم ہوا ہے ایک وقت میں دیارام کے ہم صحبت و ہم جلسہ رہے تھے۔ سخنوران ہم عصر کی ہم نشینی کا اثر کسی طباع اور ذہین انسان کے واسطے کیا ہو سکتا تھا۔ مسرور کی فیض تربیت نے اور شعرا کی ہم آہنگی نے دیارام کو اچھا خاصہ رنگین ادا اور پاکیزہ خیال شاعر بنا دیا۔ دانانا نے میرزا مظہر جان جاناں نور اللہ مرقدہ۔ نواب میر جملہ ترخاں خاں بہادر مفتوں اور فاخر مکیں سے نامور اور ماہرین فن استادوں کی زیارت کی تھی۔ دانانا نے اپنا دیوان یقیناً مکمل کیا ہوگا مگر وہ غالباً زمانے کی دستبرد سے نہ بچا اور تلف ہو گیا۔ غالباً وہ کسی جواڑے میں منشی تھے اپنے دیوان سرکار کی خدمت میں جو اشعار بھیجے تھے ان شعروں میں سے فارسی کا ایک شعر دستیاب ہوا ہے جو پیش خدمت ہے۔

تحت تسلیم کہ بود مستمندان است و بس
از من مسکین نیاز و نذر دیوان است و بس

مولوی دوست محمد خاں

مولوی دوست محمد خاں کے حالات میں سرمد نے اپنے تذکرہ میں بہت اختصار سے کام لیا۔ جس سے نہ مولوی صاحب کے خاندان کا پتہ چلتا ہے نہ یہ کہ کس سے اکتساب علم کیا البتہ ان کی علمیت اور قابلیت کے متعلق تحریر کیا ہے کہ آپ عالم و فاضل تھے اور درس و تدریس کا شوق تھا۔ شرح گلستاں و شرح ثنائی و عرضی آپ کی تصنیفات سے ہیں۔ مسرت نے مطلع دیوان ثنائی کی شرح میں چالیس معنی لکھ کر آپ کو بھیجے تھے اور ایک قطعہ بھی ساتھ میں تحریر کیا تھا۔ مولوی دوست محمد خاں نے اس کی داد دی تھی اور مسرت کی لیاقت کو تسلیم کیا تھا جو اباً ایک قطعہ اور ایک رباعی موزوں کر کے مسرت کو بھیجی تھی۔ اس قطعہ رباعی کے علاوہ آپ کا کلام دستیاب نہیں ہوا۔ سرور نے مولوی صاحب کا تخلص بھی تذکرہ میں نہیں تحریر کیا۔ رباعی پر غور کرنے سے رسا تخلص معلوم ہوتا ہے۔

رباعی

اے دل تو سخن خوشنوائی گفتمے گفتی و رساتر از رسانی گفتمے
گر گفتم بیک روش ثنا چہل بیت چہل معنی بہ یک بیت ثنائی گفتمے

قطعہ

اے آنکہ رساتر از رسانی رائی نہ کہ بلکہ عین رائی
در مدح تو صد قصیدہ گفتمے گر زندہ شدے دگر ثنائی

منشی پدم سکھ فائر

شاہجہاںپوری کالیستھ تھے محمد عمر خاں وہابی سے جو شاہجہاںپوری میں ایک ذی تعلیم و ہمہ داں سخنور اور فخر استاد شاعر گزرے ہیں فن شعر و سخن کا استفادہ کیا ہے۔ علم فارسی اچھا جانتے تھے۔ یہ قابل صحبت اور عمدہ تعلیم کا اثر تھا کہ فارسی کا شعر اچھا کہتے تھے مگر افسوس کہ فائر نوجوانی میں انتقال کر گئے لہذا پدم سکھ فائر کی وفات کا زمانہ معلوم نہیں ہوا۔ محلہ مسجد گنج

کے رہنے والے تھے۔ غالباً بارہویں صدی کے آخر میں گزرے ہیں۔ چند شعر جو دستیاب ہوئے لکھے جاتے ہیں۔

گر کُنم فائز خیالِ چیدہ گلگون او
دود آہم بر ہوارنگ شفق پیدا کند
در آب ز عکس تو عجب جلوہ گری بود
امواج بدریا ہمہ چوں بال پری بود
یک قطرہ ز خونِ دل لخت لخت ماست
اں رنگِ پان کہ برب جاناں رسیدہ ماند
جوشِ خونِ جگر م لالہ صفت موجزن است
لختِ دل رنگِ گل و سینہ بزرگ چمن است

فدا دی سیواؤ لو

فدا صاحب کا پورا نام کیا تھا یہ نہیں معلوم مگر یہ اپنے نام یا تخلص کے ساتھ 'دی سیواؤ لو' لکھتے تھے۔ محکمہ پولیس میں سب انسپکٹر تھے اور شاہجہانپور کے متوطن تھے۔ کلام رسالہ زبان اردو بابت ماہ جنوری ۱۹۱۱ء سے منقول ہے۔

یہاں دل میں لئے ہم شوق وصل یار بیٹھے ہیں
دل عشاق کو کچھ تو تلتی دو کہ چین آئے
تھارا حسن غالب بن یوسف پر ہے اس پر بھی
بہار آتے ہی شوق مے پرستی کھینچ لایا ہے
رقیبوں سے نہیں اچھی محبت کی یہ سرگرمی
مسیحاد دردِ فرقت سے لبوں پر جان آئی ہے
اٹھاؤ گے نہ رندوں کو تو محفل سے نہ اٹھیں گے
وہاں غصہ میں وہ کھینچے ہوئے تلوار بیٹھے ہیں
جگر تھامے ہوئے ہاتھوں سے سب کے یار بیٹھے ہیں
کہ تم پرندہ شیں ہو وہ سر بازار بیٹھے ہیں
جو میخانے کے گرد آ آ کے بادہ خوار بیٹھے ہیں
مے پہلو میں آجائیں وہاں بیکار بیٹھے ہیں
لگائے آسرا تیرا ترے بیمار بیٹھے ہیں
جہاں بیٹھے ہیں جم کر یہ خدائی خوار بیٹھے ہیں

حسینان جہاں اک بوسہ لب پر اسے لے لیں
فدا ہم نیچنے کو دل سر بازار بیٹھے ہیں

بابو محمد احسن خاں - احسن

بابو محمد احسن خاں صاحب شاہجہاںپوری کا کلام رسالہ اردو زبان بابت ماہ جنوری ۱۹۱۰ء میں دستیاب ہوا ہے اس رسالے کے مہتمم صاحب منشی کتید حسین احمد صاحب ارمان اور مرتب نواب ناظم علی خاں ہجر تھے۔ پتہ نہیں چلتا ہے کہ یہ کس گھرانے کے تھے اور کس محلے کے ساکن تھے۔ نمونہ کلام حاضر خدمت ہے۔

یہ کس کا سر قلم کرنے کو تیار بیٹھے ہیں
کسی دن خاک میں مل جائیں گے فرشِ زمیں ہو کر
پڑا لپکا یہاں تک میکشی کا شیخ صاحب کو
گھٹا اٹھی ہے کسی جھوم کر کسی بہار آئی
یہ اپنا اپنا ساقی ظرف ہے جو تیری محفل میں
کسی دن آکے بیماروں کی حالت تو ذرا دیکھو
دکھائیں تو کوئی جوہر وہ اپنی تیغ ابرو کا

کہ محفل میں دھرے زانو پہ وہ تلوار بیٹھے ہیں
ترے در پر سیجا سب ترے بیمار بیٹھے ہیں
کہ آخر رہن رکھ کر جبہ و دستار بیٹھے ہیں
در میخانہ پر کیسے ڈٹے مئے خوار بیٹھے ہیں
بہت ہتھیار بیٹھے ہیں بہت سرشار بیٹھے ہیں
کہ دم آنکھوں میں ہے اور طالب دیدار بیٹھے ہیں
یہاں تو جان دینے کے لیے تیار بیٹھے ہیں

قضا صناحت جوئے یار کا احسن یہ ہے ہم سے
کہ رکھے ہاتھ پر ہاتھ آپ کیوں بیکار بیٹھے ہیں

منشی محمد عزیز اللہ خاں - اثر - کٹروی

منشی محمد عزیز اللہ خاں صاحب اثر قصبہ میراں پور کٹرہ ضلع شاہجہاںپور کے ساکن تھے۔ آپ گو حضرت ناظم لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ نمونہ کلام رسالہ اردو زبان بابت ماہ جنوری ۱۹۱۰ء سے لیا گیا ہے۔ مزید حالات پر پردہ ہے۔

طبیعت آگئی ہے اک بت نوخیز پر اپنی
تمہیں تو مشق ناوک آگئی اک کھیل ہے گویا
وہ ظالم بے طرح بگڑا، یہ پوچھا تھا کہ میں نے

اسی باعث گلے میں ڈال کر زنا بیٹھے ہیں
یہاں تو ایک دل پر سیکڑوں سو فار بیٹھے ہیں
مری جاں آپ کے پہلو میں کیوں اغیار بیٹھے ہیں

اثر کیا پوچھتے ہو کیا سنائیں حال ہم اپنا
اجل کے منتظر ہیں زلیست سے بیزار بیٹھے ہیں

منشی عطار اللہ عطا

منشی عطار اللہ صاحب المتخلص بہ عطا شاہجہانپور کے رہنے والے اور حضرت طاہر
فرخ آبادی کے شاگرد تھے۔ زیادہ حال معلوم نہیں۔ نمونہ کلام رسالہ 'زبان اردو' بابت ماہ جنوری
۱۹۱۰ء سے نقل کیا جاتا ہے۔

کہیں کیا ایک حسرت سے کھڑے ہیں ہم سر محفل
تصور ہے کسی پردہ نشین کا خانہ دل میں
مرے سینے سے نکلیں بھی تو نکلیں کس طرح قاتل
دل شیدا کو بہلاتے ہیں یاد چشم جاناں میں
تصور میں نہ آئے تھے کسی دن ابروؤں والے
عطا قابو میں آئے گانہ یہ بھی مثل جاناں کے
بغل میں ہم دل پر غم لیے بیکار بیٹھے ہیں

منشی حسمت اللہ خاں حسمت

رسالہ زبان اردو شاہجہانپور بابت ماہ جنوری ۱۹۱۰ء سے منشی حسمت اللہ خاں صاحب
حسمت کا کلام نقل کیا گیا ہے۔ اس سے زیادہ حالات معلوم نہیں بجز اس کے کہ وہ شاہجہانپور
کے باشندہ تھے۔

کچھ ایسے نشہ الفت میں ہم سرشار بیٹھے ہیں
تھاری طرح وہ بھی ناز معشوقانہ کرتی ہے
کہ جیسے پی کے مئے میخانے میں میخوار بیٹھے ہیں
اجل آتی نہیں ہم جان سے بیزار بیٹھے ہیں

شب وعدہ کہاں کی نیند ہم بیدار بیٹھے ہیں
وہ اپنے سامنے رکھے ہوئے تلوار بیٹھے ہیں

ہمیں تو خواب کا آنا بھی آنا ہو گیا ان کا
نہا معلوم کس کا قتل ہے تیرے نظر ان کو

رائے اجودھیا پر شاد زیبا

رائے اجودھیا پر شاد زیبا روستائے شہر سے تھے۔ شعر و شاعری کا شوق تھا۔ ابوالعجاز منشی احسان علی خاں احسان کے شاگرد تھے۔ مزید حالات دستیاب نہیں ہوئے چند اشعار کے علاوہ کلام نہ ملا۔

چوٹ کھا کر کبھی دل کو نہ سنبھلتے دیکھا
بتخانوں میں قدرت کے تماشے نظر آئے
جس کو وہ بت تو کیا زمانہ سُننے
روئے تلوار سے گلے مل کے

ترچھی نظریں بھی حسینوں کی غضب ہیں زیبا
زیبا نگہ چشم حقیقت سے جو دیکھا
ہجر میں یوں ہو قصہ خوانی غم
شکر ہے آج آبلے دل کے

منشی اسرار حسن خاں اسرار

منشی اسرار حسن خاں رئیس شاہجہانپور تھے۔ شعر و شاعری سے دلچسپی تھی اور نواب ناظم علی خاں ہجر شاہجہانپوری اڈیٹر زبان اردو کے شاگرد تھے۔ باقی حالات پردہ خفا میں ہیں۔ زبان اردو بابت ماہ جنوری ۱۹۱۰ء سے کلام معقول ہے۔

کبھی خنجر کبھی کھینچے ہوئے تلوار بیٹھے ہیں
بس اتنا ہی سمجھ لو جان سے بیزار بیٹھے ہیں
جدھر دیکھو ادھر میخوار ہی میخوار بیٹھے ہیں
قیامت ہے انھیں گھرے ہوئے اغیار بیٹھے ہیں
وہی ہم ہیں کہ اب محو خیال یار بیٹھے ہیں

انھیں جب دیکھیے آمادہ پیکار بیٹھے ہیں
کہیں کیا خیر جو ہم پر گزرتی ہے گزرتی ہے
جناب شیخ میخانے میں مجمع سا مجمع ہے
دل رشک آشنا کو اب تلی ہو نہیں سکتی
وہی ہم تھے کہ نفرت تھی ہمیں اسرار الفت سے

منشی سخاوت علی خاں - سخا

منشی سخاوت علی خاں صاحب المتخلص بہ سخا شاہجہاںپور کے قدیمی باشندہ تھے۔ شعر و شاعری سے نہایت لگاؤ تھا۔ خاندانی حالات بتانے والا کوئی موجود نہیں ہے۔ آپ کا کلام رسالہ زبان اردو بابت ماہ جنوری ۱۹۱۰ء سے نقل کیا جاتا ہے۔

مدینہ کی ہوس بنے ہند سے بیزار بیٹھے ہیں
 چلو اے قافلہ والو کہ ہم تیار بیٹھے ہیں
 نہ وہ طوفِ حرم ہے اب نہ ہے وہ سیرِ میخانہ
 کسی کی راہ میں مدت سے ہم بیکار بیٹھے ہیں
 مر میں اس در پہ آکر کہہ دو یہ فرہاد و مجنون سے
 عبث دونوں میانِ وادی کہسار بیٹھے ہیں
 نہ اک پہلو بٹھایا بیقرا ری نے شبِ فرقت
 ہزاروں بار بیٹھے ہیں ہزاروں بار بیٹھے ہیں
 زباں تک بھی نہیں آئی ابھی تو باتِ مطلب کی
 خدا جانے وہ کیوں روٹھے ہوئے بیزار بیٹھے ہیں
 کہا یوسف انھیں میں نے تو وہ غصہ سے یوں بولے
 کہ ہم پردہ نشیں ہیں وہ سر بازار بیٹھے ہیں

گدایانِ محبت کیا کریں گے چتر شاہی کو
 ترے کوچے میں زیر سایہ دیوار بیٹھے ہیں

لالہ مہتاب رائے رغبت

آپ مشہور شاعر منشی عیوض رائے مسرت کے حقیقی بھانجے تھے۔ ماموں کے زیر تعلیم و تربیت رہے جس سے استعدادِ علمی اچھی ہو گئی تھی۔ انشا پر داز بھی تھے۔ تذکرہ سرور میں سرور نے ان کی لیاقت اور علمی قابلیت کی تعریف کی ہے۔ مزید خاندانی حالات نیز سن دلالت و رحلت کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ ان کا صرف ایک شعر دستیاب ہو سکا۔

نے مطلبی نخواہم نے ہچکار خود را
 گرم پیرے نگاہے دامان مار خود را

محمد حسن علی خاں حسن

جناب محمد حسن علی خاں صاحب حسن باشندہ شاہ بہمانپور اور حضرت حیدر کے شاگرد تھے۔ نواب حیدر علی خاں صاحب حیدر حضرت جلال لکھنوی کے شاگرد تھے اور صاحب تلامذہ تھے۔ حضرت حسن شاہ بہمانپوری کا نمونہ کلام رسالہ 'زبان اردو' بابت ماہ مارچ ۱۹۱۱ء کو شاہ بہمانپور سے زیر ادارت نواب ناظم علی خاں ہجر شائع ہوتا تھا نقل کیا گیا ہے۔ خاندانی و ذاتی حالات پر مدہ خفا میں ہیں۔

ملت میں جس کی خونِ مسلمان حلال ہو
بالیدگی خزاں میں ہو جو شس جنوں کو کیا
سمجھا دیا ہے عشق کی آتش ہے پر غضب
رسوا ہوا ذلیل ہوا خاک میں ملا
داغِ فراق وہمِ زخمِ جگر بنا
دشمن کا بھی نہ اس بت کا فر پہ آئے دل
فصل بہار لے گئی نشوونما سے دل
اب بھی اگر نہ مانے تو دوزخ میں جائے دل
اس کی یہی سزا تھی ادھر اور جائے دل
ہو جائے درد ہجر ہی یارب دوائے دل

منشی محمد فرحت اللہ خاں فرحت تلہری

منشی محمد فرحت اللہ خاں صاحب فرحت قصبہ تلہر ضلع شاہ بہمانپور کے ساکن تھے۔ اساتذہ وقت میں گئے جاتے تھے۔ صاحب تلامذہ تھے۔ نمونہ کلام 'زبان اردو' بابت ماہ مئی و جون ۱۹۱۰ء سے منقول ہے۔

بجلی ہے نہ شعلہ نہ پھلاوہ نہ شر ہے
اللہ: مرے رشکِ سیما کو منال
میں شوق میں بیتاب ہوں وہ شرم سے مضطر
کیوں ناوک دل دوز کو کھینچا مرے دل سے
پھر کیوں دل بیتاب تپاں آٹھ پہر ہے
ناصح تری باتوں میں تو جادو کا اثر ہے
تسکین شب وصل ادھر ہے نہ ادھر ہے
آئے چارہ گراب حال مرانوع دگر ہے
ہر ایک ہوتا ہے گمانِ نفعِ صُور
فرصت تیرے نالوں میں قیامت کا اثر ہے

مولوی احمد خاں احمد

نخچانہ جاوید تصنیف لالہ سریرام دہلوی میں آپ کے بارے میں تحریر ہے کہ عالم متبحر اور خوش تقریر بزرگ تھے۔ مدتوں حافظ رحمت خاں کی رفاقت میں رہے۔ فارسی دیوان مرتب ہو گیا تھا مگر وہ مسودہ تباہ ہو گیا۔ ریختہ میں بھی گاہے گاہے فکر کیا کرتے تھے۔ حضرت احمد کا اس سے زیادہ حال دستیاب نہ ہو سکا۔ ایک مختصر غزل پیش خدمت قارئین ہے۔

کیوں نہ ہوئے دل مرا نچیر زلف
عاشقاں کی قید ہے زنجیر زلف
مار ڈالے چاہنے والوں کو وہ
دیکھی ہم نے کچھ عجب تاثیر زلف
مصحف خوبی کا کرتی ہے بیباں
حسن معنی کی لکھے تحقیق زلف
کیا پریشانی میں ڈالادل کو آج
ہیں نجانوں کس نے کی تقریر زلف
دشت مجنوں کا مجھے احمد ہے شوق
دل پہ میرے ہے مگر تاثیر زلف

امام الدین خاں ناظر

امام الدین خاں ناظر کے بارے میں نواب محبت خاں نے اپنی یادداشت تذکرۃ الاحباب میں صرف ان کا نام تحریر کیا ہے دیگر خاندانی اور ذاتی حالات درج نہیں ہیں۔ ایک اردو غزل دستیاب ہو سکی۔ جو یہاں درج کی جاتی ہے۔

دغل دے کر بزم خلوت میں ہر اک دمساز کو
مت سبک فرمائیے یوں قدر حسن ناز کو
سر و بالا تجھ میں جو انداز ہے رفتار کی
کبک کیا جانے ہیں اس رفتار کے انداز کو
یوں تو اے صیاد اب مطلق مری پروانہ کر
مرغ پر بستہ بھی ہوتے ہیں کہیں پرواز کو
راز عشق آخر مرآفاق میں افشا کیا
کیا کہوں میں اشک باراں قطرہ دمساز کو
کل دوا ہو چشم ناظر اے مرے دام میں
آکے کیسار م سن کر تری رفتار کو
اس غزل کا مقطع ناقابل فہم ہے جس طرح تحریر ہے نقل کر دیا غالباً تاریخ صبیح کے مولف

نے بھی اس کو اسی طرح تذکرۃ الاحباب میں دیکھا ہوا یا کاتب نے غلط نقل کیا ہو۔

منشی مقصود علی خاں مقصود

منشی مقصود علی خاں صاحب مقصود شاہجہاں پور کے متوطن تھے اور شعرا کے شاہجہاں پور میں شمار ہوتے تھے نمونہ کلام ایک بہت پرانے گلدستہ سے نقل کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ بہار بے خزاں، بریلی سے نکلتا تھا۔

گرائیں بجلیاں رنگین تبسم نے دل جاں پر	نمک ذوق خلش نے خوب چھڑکا زخم نہاں پر
جلانے والا پروانوں کا کوئی اور تھا لیکن	ہے گا حشر تک الزام اس کا شمع سوزاں پر
بدل دی دل کی دنیا زلف برہم کے تصور نے	چڑھایا رنگ وحشت نے خیالات پریشاں پر
گنہگاروں کے حق میں مر جا باران رحمت تھے	جو مڑگاں سے گرے اشک ندامت فرد عصیان پر
زمانہ رو رہا ہے وہ زمانے سے نرالے ہیں	کہ آتی ہے ہنسی ان کو مے حال پریشاں پر
نگاہیں داور محشر کی پڑتی ہیں بصد حیرت	ادھر قاتل کے چہرے پر ادھر قاتل کے داماں پر
انہیں فرتوں میں ہیں خاک لہر جو م کے ڈرے	کرم کرنا ذرا موج ہوا رنگ بیاباں پر

خزاں کے آتے ہی مقصود کچھ ایسی ہوا بدلی
کہ پانی پھر گیا یکبارگی رنگ گلتاں پر

ہدایت اللہ ہدایت

آپ نے شیخ محلہ مہمند ہون کے ساکن تھے۔ استعداد علی معمولی تھی مگر صحبت یافتہ تھے۔ طبیعت موزوں پانی تھی مشورہ سخن کے لیے اساتذہ وقت میں کسی سے تخصیص نہیں تھی جس سے جی چاہا کر لیا۔ ۱۹۲۳ء میں بمرستہ سال انتقال ہوا کلام بہت تھا مگر تلف ہو گیا۔ بدقت جو کلام دستیاب ہو سکا درج ذیل ہے۔

نگاہ مہر نہیں ہے وہ التفات نہیں
میں ہوش میں ہوں مگر ہوش ایسی بات نہیں
وہ زندگی جو رہن غم حیات نہیں
ذرا سی بات ہے لیکن ذرا سی بات نہیں

یہ کیا سبب ہے کہ پہلی سی اب وہ بات نہیں
مری خودی کا مری بے خودی کا کیا کہنا
اسے حیات تو کیا موت سے کر میں تعبیر
فسانہ غم الفت کو کوئی کیا جانے

کچھ ایسی بدلی ہدایت فضا زمانے کی
سکوں میں گزری ہو کوئی بھی ایسی رات نہیں

شامل ہے دوستی بھی تری دشمنی کے ساتھ
ہوتا ہے یہ معاملہ ہر آدمی کے ساتھ
ہاں، درد میں کمی تو ہے لیکن کمی ساتھ
ایسے سلوک کرتا ہے کوئی کسی کے ساتھ

کچھ رُخ بدل کے کہدیا کچھ بے رخی کے ساتھ
اپنے پرانے چھوڑ چلے سب خوشی کے ساتھ
پوچھیں جو حال دل تو یہ کہہ دینا نامہ بر
جینا کہاں کا مرنا بھی مشکل ہے اب ہمیں

اب سب ملیں گے ہم دم و دمساز و غمگار
دیکھے گئے ہو آج ہدایت کسی کے ساتھ

بیسویں صدی کے شعراء

۱۱

اعتبار الملک و نظام الشعراء حکیم مولوی ضمیر حسن خاں - دل

نظام الشعراء اعتبار الملک حکیم مولوی ضمیر حسن خاں دل ابن احمد حسن خاں صاحب ابن حکیم مولوی قدرت علی خاں صاحب ابن مولوی عزیز الدین خاں صاحب ابن شیخ غلام سرور خاں صاحب ابن شیخ وارث خاں صاحب خلف شیخ حکیم الدین خاں صاحب بن شیخ واصل خاں صاحب بن شاہ قاسم سلیمانی کے مختصر خاندانی حالات یہ ہیں کہ شاہ واصل عرف بابا صاحب سے نواب عمدۃ الملک بہادر خاں چغتائی نے اپنی بیٹی خدیجہ بیگم کا عقد ۱۰۳۸ھ میں کر کے جہیز میں بارہ مواضع دئے تھے۔ آبادی شاہجہانپور کے وقت جب نواب بہادر خاں کا خاندان نوآباد شہر میں سکونت کے لیے آیا تو شاہ واصل بعد اپنی شریک حیات کے ہمراہ تشریف لائے تھے آپ نے قلب شہر سے بجانب مغرب اور دریائے گرا کے مشرقی حصہ پر اپنا سکونتی مکان تعمیر کروایا۔ یہ پرفصحا مقام گرا کے نام سے مشہور ہوا۔ خدیجہ بیگم کا جب کچھ مدت بعد انتقال ہو گیا تو

شاہ واصل نے کابل جا کر دو عقد کیے۔ ایک زوجہ سے شیخ حکیم الدین تولد ہوئے اور انھیں کی اولاد میں مولوی حکیم ضمیر حسن خاں دل ہیں۔ ۱۸۷۵ء میں حضرت دل کی ولادت ہوئی۔ بچپن ہی میں سایہ پدری سے محروم ہو گئے ان کی والدہ بچوں کو لے کر اپنے برادر حقیقی کے مکان واقع محلہ ہاتھی تھان میں اٹھ آئیں۔ حضرت دل کی تعلیم و تربیت کا بند و بست ماموں نے کیا۔ حسبِ رواج قدیم ابتدائی تعلیم ایک معلم رکھ کر گھر میں کرائی۔ فارسی پڑھ کر درس نظامی کی معقولات و منقول کی کتابیں فاضل اساتذہ سے پڑھیں۔ فن طب مولوی حکیم محمد صاحب شاہ جہاں پوری تمیز حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں دہلوی سے سیکھا بعد میں حکیم بشیر اللہ خاں قد نخل سے بھی استفادہ کیا۔ فن شعر میں حضرت امیر مینائی کے شاگرد ہو گئے۔ کچھ ہی دنوں میں اپنی فطری صلاحیت کے سبب شاگردان رشید میں شمار کیے جانے لگے شاعری اور آپ کے مزاج میں قدرتی مناسبت تھی، مشق سخن اور استاد کی توجہ سے نکھرتی چلی گئی۔ ہندوستان کے رسائل و جرائد اور گلہ ستوں میں کلام پہلے بھی چھپتا تھا مدیران کے طلب و تقاضوں نے حضرت دل کے نام و کلام کو ملک کے گوشہ گوشہ تک پہنچا دیا۔ ہر عظیم الشان مشاعرے میں شرکت کے دعوت نامے آنے لگے اور آپ کی ذات ادبی و شعری اجتماعات کے لیے ایک ضرورت بن گئی۔ رفتہ رفتہ شاگردوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ ملک کے ہر حصہ کے کچھ نہ کچھ شعرا آپ کے کلمات سے مستفیض ہونے لگے۔ تلامذہ دل کی طویل فہرست ہے۔ حضرت دل نہایت متین و سنجیدہ ہذب و شائستہ انسان تھے۔ انکساری طبیعت کا فاصلہ بن چکی تھی لیکن ساتھ ہی بے مد خود دار اور غیرت مند بھی تھے۔ میروں کی مجلس ہو یا کم حیثیت لوگوں کی محفل آپ کو اپنی عزت و توقیر کا ہمیشہ خیال رہتا تھا۔ غریب مساکین کے ساتھ بڑی شفقت و محبت کا سنوک کرتے تھے۔ وراثت میں زمینداری پائی تھی۔ زمیندار اپنی رعایا کے ساتھ عمومی طور پر سخت گیر تھے لگان اور بقایا لگان کی وصولیابی کے سلسلے میں تشدد پر بھی اتر آتے لیکن حضرت دل کا آسامیوں کو شاید ہی کبھی شکایت کا موقع ملا ہو اور سختی کا شکار ہوئے ہوں۔ حضرت دل کو جس پہلو سے بھی میزان انسانیت پر تولنے پورے اتریں گے۔ آپ صرف بلند پایہ ناظم ہی نہیں ناشر بھی تھے۔ لاتعداد خطوط اور مفید مضامین لکھنے کے علاوہ دو ناول 'درد دل' اور 'دل سوز' تصنیف فرمائے تھے جو شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ دل صاحب نے تقریباً ساٹھ سال ادب کی خدمت کی بحیثیت شاعر آپ کا مقام بہت ارفع و اعلیٰ تھا۔ اپنی حیات میں شرفاں شہر کے روبرو عزیز شاگرد حضرت عابد حسین مابد کو شاہجہانپور میں اپنا

جانشین مقرر فرما دیا تھا جناب عابد کے مقابلہ کوئی دوسرا شاگرد جانشینی کا اہل نہیں تھا۔ آپ کے دو صاحبزادے جناب شبیر حسن خاں ایڈوکیٹ اور جناب شفیق حسن خاں شفیق مینائی وارث خاندان ہوئے دکن صاحب ایک طویل مدت تک صاحب فراش رہ کر ۱۹۵۹ء میں راہی ملک بقا ہوئے۔ چھوٹے صاحبزادے شفیق مینائی کی صحت خراب تھی ہر ممکنہ معالجے کے باوجود صحت بحال نہیں ہوئی۔ تپ دق کے مرض میں مبتلا تھے۔ حضرت دکن کو شفیق کی بیماری نے قلبی دکھ پہنچائے۔ خود شفیق مینائی بھی والد کی رحلت کے بعد، مئی ۱۹۶۶ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ حضرت دکن کا دولت خانہ دہلی اور لکھنؤ دونوں مکاتب فکر کے مقتدر شعرا کی آمد و رفت کا مرکز تھا اس وقت شاید ہی ایسا کوئی نمایاں شاعر ہو جو شاہجہانپور آکر حضرت دکن سے ملاقات کیے بغیر واپس چلا گیا ہو۔ حضرت دکن نے تقریباً ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن غزل آپ کی سب سے زیادہ محبوب صنف تھی اور غزل گوئی میں اپنا منفرد مقام رکھتے تھے پاکیزگی، صفائی، بلند خیالی، بے ساختگی اور سادگی آپ کے کلام کی ایسی خصوصیات ہیں جو بیک وقت کسی ایک شاعر میں نظر آنا ناممکن تو نہیں لیکن مشکل ضرور ہے۔

کلام حضرت دکن

غزل کے اشعار ملاحظہ فرمائیے:

بہلا رہے ہیں اپنی طبیعت خزاں نصیب دامن پہ کھینچ کھینچ کے نقشہ بہار کا

وہم باطل تھا مگر وہ منظر عیش و نشاط پہلوئے عاشق میں ہنگام سحر کوئی نہ تھا

کوچہ یار میں مٹنا مگر اک شان کے ساتھ خاک ہونا تو محبت کا نشاں ہو جانا

یہ بھگی رات یہ ٹھنڈا سماں یہ کیف بہار یہ کوئی وقت ہے پہلو سے اٹھ کے جانے کا

ہائے وہ دل کہ جس نے بے سمجھے تیرے وعدے کا اعتبار کیا
وقت رخصت تلتیاں دے کر اور بھی تم نے بے قرار کیا
تیرے مشتاق اور منظر حشر کس قیامت کا انتظار کیا

یاد ہے ہاں یاد ہے طرز نگاہ مست یار
چلتے چلتے کس نظر سے اس نے دیکھا کیا کہوں
ایک نازک پنکھڑی سے پارہ پارہ دل ہوا
دل کے افسانے میں اک ٹکڑا نیا شامل ہوا

اس کی ہمت اب اگر پامال کر ڈالے کوئی
خاک ہو جانا محبت میں ہمارا کام تھا

معمور تجلی ہو تختیر کا اثر آج
آئینہ بنادے مجھے اے ذوق نظر آج

حضور یار شکووں کا تو کیا ذکر
گراں ہے مدعا اے دل زیاں پر

کیا جانے کس خیال سے چھوڑا بجال زار
مجھ پر بڑا کرم ہے مرے چارہ ساز کا

وہ اپنے مجرموں کو دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں
اگر اے دل انھیں منظور ہوتا ہے سزا دینا

نیا منظر دکھاتا ہے ہمیشہ جوش غم میرا
طریق عشق میں پہلا قدم ہے ہر قدم میرا

خاموش دل زار تہہ خنجر قاتل
شکووں کا ہے یہ وقت کہ تسلیم و رضا کا

نارسائی کا سبب کیا ہے یہی جوش طلب
بڑھ گئے ہم اس قدر آگے کہ رہبر رہ گیا

مصیبت سے ادھر جوش طلب بڑھتا ہی جاتا ہے
ادھر منزل کا نالیوسی کی حد تک دور ہو جانا

رہنما کی کیا ضرورت عشق کا بل چاہیے
دل جہاں تڑپے سمجھ لینا یہی ہے کوئے دوست

کب تک شب غم کوئی بدلتا رہے پہلو
تسکین کی صورت نہ ادھر ہے نہ ادھر آج

کوچہ عشق میں ہر ذرہ دل ہے پامال جو وفادار ہیں مٹ کر بھی وفا کرتے ہیں

اٹھے تو محو تمنا ملے تو غرق نیاز نگاہ شوق کو فکر مال کا رہ نہ ہو

قربان ہو کے آج کسی کی نگاہ شوق زینت فزائے حسن خداداد ہو گئی

کہیے تو کہدیں عرش بریں کو مقام دوست ہمت مگر کچھ اور ہے اپنے خیال کی

دب نہیں سکتا ہے اب غنچوں کا جوش انبساط رک نہیں سکتی ہے ہونٹوں پر ہنسی آئی ہوئی

کہاں کا لطف مجھ پر غنچہ و گل نے غضب ڈھایا بہار آئی تو شاخیں جھک گئیں میرے نشیمن کی

جھگڑا تو روز ٹھوکر میں کھانے کا مٹ گیا اچھا ہوا کہ خاک نشیں خاک ہو گئے

روشن علی خاں - روشن واریث

روشن علی خاں روشن واریث خلیف جناب مقصود علی خاں ساکن محلہ تراہی کی ولادت فروری ۱۸۷۵ء میں ہوئی گھر میں تعلیم پوری کر کے موضع بھرگواں، جاگر ایک مولوی صاحب سے فارسی کی تکمیل کی۔ درجہ آٹھ تک انگریزی پڑھی اور مضامین بھی پڑھے لیکن انگریزی اردو نیز فارسی میں ہمیشہ ممتاز رہے شاعری میں غالب دہلوی کے کسی شاگرد کے شاگرد تھے۔ حضرت روشن کے تلامذہ میں فخر عالم سیوہاروی اور سید عنایت علی ساکن (کنڈرکی) ضلع مراد آباد مشہور شاعر گزرے ہیں۔ جون ۱۹۵۸ء میں رحلت فرمائی۔ نمونہ کلام۔

ہم نے جس دم جھک کے ان کے پاؤں پر سر رکھ دیا
بار ہجراں لے فلک کیا تو نے دل پر رکھ دیا
مُسکرا کر ہاتھ سے قاتل نے خنجر رکھ دیا
شیشہ نازک پہ اک بھاری سا پتھر رکھ دیا

کھیل کے دن ہیں لڑکپن ہے انہیں کیا دل کی قدر
ہو گئے رسوائے عالم رازِ الفت کھل گیا
جب کہا میں نے قسم کھا جاؤ پھر بھی آئیں گے
دیکھا بھالا اٹا پلٹا اور مسل کر رکھ دیا
آہ نے جو کچھ کہ تھا دنیا کے منہ پر رکھ دیا
مسکرا کر ہاتھ اس نے میرے سر پر رکھ دیا

ہلے روشن کو جو یاد آئی وہ چشم مست ناز

رو کے بیچارے نے آہستہ سے ساغر رکھ دیا

تری نگاہ نے پہلو وہ بے رخی کے لیے
جناب خضرہ میکہ بنا دیتے
خدا گواہ ہے توبہ پہ بھی یہ کافر دل
ابھی سے دیر و حرم ترک کر دئے روشن
اٹھی نہ عرصہ محشر میں بھی کسی کے لیے
خدا نے آپ کو بھیجا ہے رہبری کے لئے
مجل محل گیا اکثر یہ میکشی کے لئے
ابھی سے ہو گئے دیوانہ کس پری کے لئے

سید حسین احمد میاں - بیباک

محہ جھنڈا کلاں میں ایک خاندان مبارک نشان حضرت غوث الاعظم محبوب سبحانی قطب ربانی
شیخ محمد عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا آباد ہے۔ اسی خاندان کی آپ یادگار تھے۔ آپ کے دلثوں میں عرصہ
سے سلسلہ پیری و مریدی کا چلا آتا تھا چنانچہ آپ کے والد بزرگوار سید تاج محل حسین عرف جن میاں صاحب
مسند سجادگی پر رونق افروز رہے۔ حضرت بیباک کی تعلیم اچھی ہوئی تھی۔ عربی و فارسی کی عمدہ قابلیت
حاصل کی طبیعت نہایت ذکی و رسا پائی تھی اسی وجہ سے فن شعر میں ترقی کر کے لکھنؤ و دہلی میں نامور ہو
گئے تھے۔ قوت مکالمہ و مناظرہ بھی اچھی پائی تھی۔ ابتداء میں آپ نے مشورہ سخن سید محمد علی میاں
خیال سے کیا بعد جب مشق ہو گئی تو آپ نواب مرزا خاں داغ کے شاگردوں میں داخل ہو گئے مگر
دہلی کے رنگ خصوصاً غالب و مومن کی غزل گوئی سے بہت متاثر رہے۔ اس لئے آپ کے کلام
میں زبان لکھنؤ کی اور خیال و مضامین مومن و غالب کے نظر آتے ہیں۔ دہلی سے لکھنؤ تک جو دھوم
دھام سے مشاعرے ہوتے تھے ان میں آپ بطور خاص مدعو کئے جاتے تھے۔ آپ شاگردان
مرزا داغ میں امتیاز کے حامل تھے۔ آپ نے اپنی حیات میں دیوان ترتیب دے دیا تھا مگر
قضا نے طباعت کی مہلت نہ دی۔ آج بھی ناقدری کا شکار ہے اور ورنہ اسے توجہ کا طلبگار

ہے آپ کے اشعار بطور نمونہ کلام ناظرین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

کوچہ یار سے دشوار ہے لانا دل کا
 اک قیامت کا اٹھانا ہے اٹھانا دل کا
 وارے اے بکیسی عشق کہ وہ بھی نہ رھا
 صبر مروج تھا اک دوست پرانا دل کا
 پہلے بیتاب کیا آنکھ ملا کر شب وصل
 پھر ہنسیے دیکھ کے قابو میں نہ آنا دل کا
 کہہ نہ دیں شکوہ غم پر وہ کہیں اے بیباک
 آج سے چھوڑ دیا ہم نے ستانا دل کا

حوصلہ مجھ پر نہ کر تو اے فلک بیداد کا
 دیکھنے والا ہوں چشم خانماں بر باد کا
 دی ہے بندگی کو اگر اللہ نے عقل سلیم
 ایک نظارہ ہے کافی عالم ایجاد کا
 بوائے اشک آنے لگی مجھ کو شبیہ یار سے
 ساتھ اس کے دل بھی شاید کھینچ گیا بہزاد کا

وہی آنکھیں دکھا دینا وہی غصہ میں بھر جانا
 یہ تم نے عرصہ محشر کو بھی کیا اپنا گھر جانا
 کسی کی جستجوئے وصل کچھ کہنے کو ہے مجھ سے
 ذرا لے درد دم لینا زرا اے دل بھڑ جانا
 محبت میں کچھ ایسی زندگی دشوار ہے ہم کہ
 نوید جانفزا بھی کوئی سن لینا تو ڈر جانا
 اسی کے جاننے کے ہم تو اے بیباک قائل ہیں
 دم اقرار جس نے اس کا انداز نظر جانا

وہ حال مرا ہجر میں دیکھا ہے قضائے
 روتی ہوئی جاتی ہے مسیحا کو بلانے
 اے چرخ نشاں قبر عدو کا تو مٹا دے
 سنتا ہوں کہ جائیں گے وہ مردوں کو جلانے
 دشمن کو وہ اللہ دکھائے نہ سنائے
 جو حال مرے دل کا کیا تیری جفانے

دیکھو تو حسن و عشق میں الفت کمال ہے
 میرے لئے وہ زلف بھی آشفۃ حال ہے
 جانے دے خار دشت کہ روتے ہیں آبلے
 کیا چھیرنے کا لطف جب ان کا یہ حال ہے
 ناخوش دعائے وصل پہ ہوتے ہو کس لئے
 تم سے نہیں سوال خدا سے سوال ہے

دم آخر غضب تھا دیکھنا حسرت سے بسمل کا
 چھٹا پڑتا ہے خنجر جی بھرا آتا ہے قاتل کا
 نہ پوچھو جب ہم آوارہ دشت محبت ہیں
 یہ آنکھیں پھوٹ جائیں منہ اگر دیکھا ہو منزل کا

رفتہ رفتہ بیقراری عشق میں خو ہو گئی
کیا مشیت ہے تری یارب کہ عشق دوست میں
درد رہتے رہتے میرے دل کے اندر رہ گیا
دل گیا لیکن چلنے کے لئے سر رہ گیا

لذت کش جفا دل دیوانہ ہو گیا
دل میں جو ایک قطرہ خون تھا مدار زلیست
بے لطف درد عشق کا افسانہ ہو گیا
وہ بھی نیاز حسرت پیمانہ ہو گیا
کی اس قدر وفا کہ وہ بیگانہ ہو گیا

جان عزیز راہ وفا میں نکل گئی
شوخی تو دیکھیے کہ دم عرض مدعا
اب جل کے وہ کشاکش سعی عمل گئی
بھولوں گا یہ صبا کا نہ احساں عمر بھر
وہ بات کی کہ یاس و تمنا میں چل گئی
یہ جان لو وہ عشق میں بے موت مر گیا
جب آئی منہ سے خاک درد دوست مل گئی
جانانہ ہم نے جان کا جانا بھی عشق میں
درماں سے جس مریض کی حالت سنبھل گئی
بیباک قتل ہو کے ہوا بھی تو یہ ہوا
اک آہ تھی کہ منہ سے ہمارے نکل گئی
اک دہ گہری کو اپنی طبیعت سنبھل گئی

جاتے ہی ترے جان نکل جائے گی غم سے
یہ حال ہے دل کا کہ جو لکھتا ہوں خط شوق
یہ دیکھ کے کس طرح رہا جائے گا ہم سے
جی تو یہ کہتا ہے کہ حضرت بیباک کے اسی طرح ہزاروں اشعار لکھتا چلا جاؤں مگر کتاب کی ضخامت
بہت ہے لہو صفحہ کا غنڈ پہ قلم سے
بڑھ جانے کے خیال سے جبر کرتا ہوں۔ حضرت بیباک تاریخ ۱۹ء راہی ملک بقا ہوئے
اور شاہجہاںپور ایسے باکمال شاعر سے محروم ہو گیا۔

نواب ناظم علی خاں ہجر غوریہ خیل

نواب ناظم علی خاں ہجر کا براہ راست تعلق بانیاں شاہجہاںپور سے تھا جیسا کہ ذیل کے نسب نامہ سے ثابت ہے۔ نواب ناظم علی خاں بھی نواب خادم علی خاں ابن نواب اشرف خاں خلعت نواب

محبت خاں ابن نواب فیض علی خاں ابن نواب صالح محمد خاں ابن نواب مرتضیٰ خاں ابن نواب فتح محمد خاں ابن نواب دلیر خاں - والدہ نواب ناظم علی خاں ہجر بنت نواب زین العابدین خاں عرف عید و خاں ابن نواب مہتاب خاں خلف نواب بدر الدین خاں ابن نواب شہاب الدین خاں ابن نواب عبدالغنی خاں ابن نواب بختیار خاں بن نواب بہادر خاں چغتاد اوڈی غوریہ خیل، اس طرح آپ خالص نوابین شاہجہانپور کی اولاد اور نسل سے تھے۔ نواب دلیر خاں آپ کے جد اعلیٰ نے شاہجہانپور کی سکونت ترک کر کے بیس میل دور بجانب جنوب و مشرق شاہ آباد بایا تھا جو اب ضلع ہردوئی کا مشہور قصبہ ہے اور جہاں آج بھی اصلی نسلی پٹھان کثیر تعداد میں رہتے ہیں۔ آپ کے بزرگوں میں سے کسی نے شاہ آباد کی سکونت ترک کر دی تھی اور شاہجہانپور میں نواب بہادر خاں کے عالی شان قلعہ کے جانب مشرق مکان تعمیر کر کے رہائش اختیار کی تھی یہ مقام اب بالائے قلعہ کہلاتا ہے۔

نواب ناظم علی خاں ہجر کی استعداد علمی واجبی تھی لیکن خداوند کریم نے شاعرانہ صلاحیت وافر عطا کی تھی۔ آپ اوائل عمری سے شعر کہنے لگے تھے۔ نواب، مرزا داغ سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ حضرت، ہجر نے ۱۹۱۰ء میں ایک گلدستہ جاری کیا جس کا نام زبان اردو رکھا تھا اس رسالے میں مقامی اور بیرونی شعرا کا طرحی کلام شائع ہوا کرتا تھا۔ لیکن چند سال کے بعد رسالہ کی اشاعت بند کر کے بمبئی چلے گئے جہاں مختصر سی علالت کے بعد ۲۰ جون ۱۹۱۲ء کو رحلت فرما گئے اپنی موت سے کچھ دن قبل آپ نے ایک شعر میں اپنی کیفیت یوں بیان فرمائی تھی۔

لئے ہجر وقت ٹل نہیں سکتا ہے موت کا

لیکن یہ دیکھنا ہے کہ مٹی کہاں کی ہے

یہ شعر دور دور مشہور ہو گیا تھا۔ جناب، ہجر کا ہجر چونتیس سال میں عالم جوانی میں انتقال کر جانے سے شاہجہانپور اپنے ایک ممتاز شاعر سے محروم ہو گیا تھا۔ شاہجہانپور اور بیرون شہر میں آپ کے کثیر سناگر تھے۔ خود نہایت خوش گو اور پرگو شاعر تھے۔ ہندوستان کے دیگر شہروں کے بڑے بڑے مشاعروں میں مدعو کئے جاتے تھے۔ اہل ذوق آپ کا ادب و احترام کرتے تھے اور کلام دلچسپی سے پڑھتے اور سنتے تھے۔ آپ کا دیوان طبع ہو چکا تھا مگر اب دستیاب نہیں ہوتا صرف غزل سے آپ کو فطری لگاؤ تھا لیکن دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ تلاش بسیار کے بعد جو کچھ کلام حاصل ہوا ہے بخیاں تحفظ کل درج کرتا ہوں۔ یہ شاہجہانپور کی بد نصیبی ہے کہ اس کے

بہت سے قادر الکلام شعراء کا کلام محفوظ نہ رہا اور بعض شعراء کا تو ایک شعر بھی دستیاب نہیں ہوتا۔
اتفاقاً ایک نظم بھی ہاتھ آگئی جو بمبئی سے نکلنے والے ایک رسالے 'غیظہ جاوید' میں شائع ہوئی تھی۔ یہ
رسالہ سید کاظم حسین ہدف لکھنوی کے اہتمام سے شائع ہوتا تھا۔ ہجر صاحب نے یہ نظم
'غیظہ جاوید' کے سالانہ جلسے کے لئے کہی تھی۔ نظم میں طبیعت کی جولانی لائق دید ہے۔

غزل ۱

زبانی ان کو یہ پیغام اے باد صبا دینا	کسی دن خواب ہی میں چاند سی صورت دکھا دینا
پڑھے غش میں کتنی دیر سے کوئی سہر محفل	زرا تکلیف کرنا اپنے دامن کو ہوا دینا
وہ اک تم ہو وفا پر بھی جفا جوئی ستمگاری	وہ اک ہم ہیں جفا پر بھی دُعا کرنا دعا دینا
وہ حال لذت تعذیر پوچھیں گے تو کہہ دوں گا	کسی کی ہو خطا لیکن مجھی کو تم سزا دینا
ادھر یہ ہے کہ میں کہتا ہوں میری آرزو سن لو	ادھر یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں سن لیں گے سنا دینا
کسی کی اس ادا میں کچھ ستم ہے کچھ لگاؤ ہے	کہ میرا نام لکھنا اور پھر لکھ کر مٹا دینا
لیا ہے ساتھ یہ سمجھا بچھا کر آج ناصح کو	انھیں بچھا بچھا کر میرے سینے سے لگا دینا
ہماری حسرتوں کی پردہ داری ہو تو کیوں کر ہو	کوئی پوچھے نہیں حال دل مضطر سنا دینا

کسی کی یہ ادائے ہجر تڑپا دینے والی ہے
سوال وصل سنا اور سن کر مسکرا دینا

غزل ۲

عہد طفلی جا چکا اب ہے شباب آیا ہوا	کہہ رہا ہے صاف جو بن ان کا گدرا یا ہوا
ایک بوسہ دے رہے تھے شوق سے وہ لیکے دل	مُفت کی حجت میں اب وہ بھی گیا آیا ہوا
دید کے قابل کسی کا حال تھا صبح وصال	گفتگو جھینپی ہوئی انداز شرمایا ہوا
نیند آنے کا بہانے شام ہی سے وصل میں	یہ تو فقرہ ہے کسی اچھے کا سمجھایا ہوا
ہو چکی بس انتہائے شرم الفت ہو چکی	خواب میں بھی کوئی آیا ہے تو شرمایا ہوا
شیخ جی ایسے میں بھی وہ چیز نا جائز ہے کیا	فصل گل آئی ہوئی ہے ابر ہے چھایا ہوا
دیکھ کر میرا دل افسردہ وہ کہنے لگے	پھول اچھا تھا اگر ہوتا نہ مڑھبایا ہوا

ہائے کیا جانے پڑی ہے کیا مصیبت ہجر پر
پھر رہا ہے ہر طرف بیچارہ گھبرا یا ہوا

غزل ۳

دے کے دل ان کو ہوئی ہے اب یہ شکل اور بھی
 پہلے دیکھا آئینہ پھر مجھ سے فرمانے لگے
 ٹوٹ کر پہلو میں میرے رہ گئے پیکان تیر
 عشق میں ایسا مزہ پایا کہ اب کہتا ہوں میں
 بانگین میں یہ بھی یکتا شوخیوں میں وہ بھی فرد
 تم نے رکھا تھا تسلی کے لئے سینے پہ ہاتھ
 روٹھے جاتے ہیں کہ لیں گے ہم کوئی دل اور بھی
 کیا ہمارا ہے کوئی مد مقابل اور بھی
 مل گئے ان کی عنایت سے کئی دل اور بھی
 دوسرے پہلو میں ہوتا دوسرا دل اور بھی
 لے اڑی قاتل کو میرے تیغ قاتل اور بھی
 بڑھ گئی لیکن میری بیتابی دل اور بھی

دے رہا ہے عشق میں کوئی اپنے دامن کی ہوا

کیوں نہ اب ہو جائیں ہم اے ہجر غافل اور بھی

غزل ۴

طبیعت ہی میری مجھ پر محبت کی بلا لائی
 عجب انداز سیکھے ہیں تیری چتون نے اے ظالم
 تمنا اپنی اپنی لائی ہے دو توں کو مقتل میں
 زمانے بھر میں چرچے ہیں تری خلوت نشینی کے
 میری چشم تصور نے کیا کیا کام کیا کہنا
 وہ کہنا دیکھ کر مقتل میں مجھ کو میرے قاتل کا
 یہ چوری تو نہیں تیری نظر کی سبب زوری ہے
 جو آئی بھی تو کیا آئی جولانی بھی تو کیا لائی
 کسی کا دل اڑا لائی کسی کا دل چسرا لائی
 انھیں شوق ستم لایا مجھے میری قضا لائی
 تجھے پردے سے باہر کھینچ کر تیری حیا لائی
 عدو کی گود سے اس کو اڑا لائی اٹھا لائی
 یہاں تم آپس آئے ہو یا تم کو قضا لائی
 لڑی جس کی نظر سے بس اسی کا دل اڑا لائی

غضب کا چلبلا پن ہجر ہے تیری طبیعت میں

خدا جانے یہ کس سفاک کی شوخی چسرا لائی

غزل ۵

یارب کسی کو عشق کسی کا کبھی نہ ہو
 مانگو دعائے وصل تو کہتا ہے وہ حسیں
 ہر وقت اک نہ اک ہمیں معشوق چاہیے
 حسرت ٹپک رہی ہمارے بیان سے
 دشمن بھی ہو تو اس کو غم عاشقی نہ ہو
 مقبول یہ دُعا مرے یارب کبھی نہ ہو
 پہلو میں ہوں نہ آپے کیا درد بھی نہ ہو
 وہ بات ہی نہیں جو محبت بھری نہ ہو
 جب لطف ہے ملا ہوا سینے سے سینہ ہو

کروٹ بدل کے آپ نہ سوئیں شبِصال

وہ آرزو ہی کیا جو مٹانے سے مٹ سکے وہ درد ہی نہیں جو کبھی ہو کبھی نہ ہو
 کینا وہ ان کا ہنس کے سوال وصال پر سب دل لگی ہو ہم سے یہی دلگی نہ ہو
 کرتے ہو سب سے مئے کی بُرائی جناب ہجر
 ایسے ہی ہو اگر تو بھلے آدمی نہ ہو

غزل ۶

دل میرا ان کی زلف شکن در شکن میں ہے ہے کس چمن کا پھول مگر کس چمن میں ہے
 سوز تپ دروں نے جلایا ہے اس قدر بس ایک مشت خاک میرے پیرن میں ہے
 کچھ حال دل کہا نہ گیا ان کے روبرو کس کام کی زبان ہمارے دہن میں ہے
 بے خود ہیں سب کسی کو کسی کی خبر نہیں اک دو کسرا جہان تری انجمن میں ہے
 ہنسنے کی بات کیا ہے دم وعدہ وصال ظاہر ہوا فریب تمھارے سخن میں ہے
 رہ رہ کے یاد آتے ہیں اے ہجر ہم وطن
 ہم ہیں سفر میں دھیان ہمارا وطن میں ہے

مظہر علی خاں صاحب - آبر - شہباز نگری

منشی مظہر علی خاں صاحب آبر کے والد ماجد کا نام خان فضل احمد خاں تھا۔ شہر کے عین متصل
 قصبہ شہباز نگر کے ساکن تھے آپ کا خاندان تمول واثر میں ممتاز تھا۔ آبر صاحب کی ابتدائی تعلیم
 حسب رواج شرفار گھر میں ایک مولوی سے ہوئی بعد شہر کے مدرس عربیہ میں اکتساب علوم عربی و
 فارسی کیا۔ انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں آپ کی ولادت ہوئی تھی اور ۱۹۵۷ء کے اواخر میں
 ایک دیوار کے گرنے اور اس میں دب جانے سے موت واقع ہوئی۔ آپ نے اپنے اکلوتے
 جوان العمر بیٹے مظہر علی خاں کی موت کے بعد گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ خاندان کے لوگ
 پاکستان ہجرت کر گئے مگر آپ نے اپنا آبائی مکان جو پگھوں پر پھیلا ہوا تھا چھوڑنا گوارا نہ
 کیا۔ آج نہ وہ وسیع حویلی ہے نہ ان کا پائیں باغ۔ اس آراضی پر کاشت ہوئی ہے۔ حضرت آبر

کو شعر و شاعری کا اوائل عمری سے شوق تھا۔ حضرت احسان شاہ بھہانپوری کے شاگرد تھے۔
آپ کا کلام تلف ہو گیا جو بہت تھا نمونہ کلام۔

غزل

آج وہ وعدہ شکن مہمان ہے سارے گھر میں عیش کا سامان ہے
میں یہ کہتا ہوں کہ دل قسربان ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ تو نادان ہے
بس، یہی نا، جان میری جا رہے گی وہ نہ آئیں اور کیا نقصان ہے
زندگی سے تنگ ہوں میں اسے اجل وہ رہیں زندہ جنہیں ارمان ہے
تیز خنجر کر کے مقتل کو چلے آج کس کے قتل کا سامان ہے
ات دن ہے بارش لطف و کرم ابر پر اللہ کا احسان ہے
کہتے ہیں منصف سخنور بھی یہ ابر
کامل فن سخن احسان ہے

انوری جہاں بیگم حجاب

آخری والی شاہ بھہانپور نواب عبداللہ خاں چغتیا صولت جنگ کے باندہیر دیوان حسین خاں
کی پرپوتی اور مولوی عنایت اللہ خاں صاحب ساکن محلہ دیوان جوگر ارج کی نامور دختر انوری جہان بیگم
حجاب ۱۸۸۰ء کے نس پاس تولد ہوئیں۔ بچپن کا زمانہ تھا کہ چیچک کا عارضہ لاحق ہو گیا اور دونوں
آنکھوں کی بصارت سے محروم ہو گئیں لیکن اس سانحہ سے قبل فارسی کے فاضل استاد مولوی
نواب غلام حیدر خاں سے بوستان اور سکندر نامہ پڑھ رہی تھیں نابینا ہوجانے کے باوجود تعلیم
جاری رکھی سن کر حافظہ میں محفوظ کر لیتی تھیں۔ آنکھوں کی بصارت سے محروم کر کے خداوند کریم
نے غضب کا حافظہ اور بلا کی ذہانت بخش دی تھی۔ اہل علم کی صحبت سے استفادہ کرتی رہیں۔
شاعری کا مادہ طبیعت میں پہلے سے موجود تھا۔ شعر موزوں کرنے لگیں پہلے منشی احسان علی
خاں صاحب احسان سے مشورہ سخن لیا بعد میں حضرت جلال لکھنوی کے حلقہ تلامذہ میں
داخل ہو گئیں۔ مشق سے پُرگوئی اور زودگوئی پیدا ہو گئی۔ شاہ بھہانپور کے باہر دو

شہروں میں بھی آپ نے مشاعروں کی شرکت فرمائی اور خوب خوب داد پائی۔ منتظین مشاعرہ حجاب صاحبہ کو نہایت ادب و احترام سے لے جایا کرتے تھے اور پردہ کا انتہائی اہتمام کیا جاتا تھا ان کی اپنی رہائش گاہ پر روزانہ شعراء شہر اور گاہے گاہے غیر مقامی شعراء بھی تشریف لاتے۔ گھنٹوں شعرو سخن کی صحبتیں جاری رہتیں نہایت متواضع اور ہماں نواز واقع ہوئی تھیں دونوں وقت اس قدر کھانا تیار کیا جاتا تھا کہ دو چار ہماں کھالیں۔ کسی دن کوئی ہماں نہ موجود ہوتا تو غیر استعمالی کھانا غریبوں کو تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ زندگی کے کسی حصے میں آپ نے ازدواجی زندگی بھی گزاری۔ مسمیٰ شفیع اللہ خاں ساکن تارین بہادر گنج سے عقد کر لیا تھا مگر کچھ عرصے بعد شفیع اللہ خاں ایک روز اس طرح غائب ہو گئے کہ آئندہ کبھی ان کا پتہ نہ چلا کہ کہاں چلے گئے اور کن تاریکیوں میں کھو گئے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

حجاب نے اپنی زندگی میں بقدر کئی دیوان ذخیرہ شاعری تیار کر لیا تھا مگر بعد وفات تلف ہو گیا یا لوگوں نے غائب کر دیا۔ گلدستوں میں جو شائع ہو وہی اب سرمایہ ہے۔ لغت کہنے پر قدرت حاصل تھی اور شعر نہایت پر اثر موزوں کرتی تھیں۔ آپ کی ایک لغت کا بہت مشہور مطلع ہے۔

محمد مصطفیٰ کا غم ہے جی میں

کہیں میں مر نہ جاؤں اس خوشی میں

حجاب کا حلقہ تلامذہ بھی وسیع تھا۔ فن شعر سے واقف تھیں اکثر اساتذہ وقت سے تبادلہ خیال ہوتا رہتا تھا۔ ہندوستان کے بیشتر مشاہیر شعراء آپ سے شرف ملاقات حاصل کرنے تشریف لائے اور حجاب کی جودت طبع اور سخن گوئی نیز سخن فہمی سے بہت متاثر ہوئے۔ حجاب نے اوسط عمر پائی تھی۔ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں آپ کا انتقال ہوا۔ نمونہ کلام گلدستوں سے نقل کیا گیا ہے۔

کلام حجاب

ازار مغاں بابت ماہ اپریل ۱۸۹۶ء

جھوٹ ہے جو کوئی کہتا ہے محبت دیکھی
آپ نے ضد مرے دل کی شب خلوت دیکھی
قد آدم مری آنکھوں نے قیامت دیکھی
حشر کے دن ترے دیدار کی حسرت دیکھی

ان سینوں میں ستانے ہی کی عادت دیکھی
اس نے ہر بات پر اصرار کیے ہیں کیا کیا
قامت یار کا آیا جو تصور مجھ کو
جن میں تھا شوق کا گھر ہم نے انھیں آنکھوں میں

ازارمغاں بابت ماہ مئی ۱۸۹۶ء

عرش پر جب تک شہ عالم رہے
آپ سے باہر جو شب بھر ہم رہے
بے قرار اتنے ہی اے بت ہم رہے
ہمکنار ان سے سحر تک ہم رہے

لطف حق معراج میں پیہم رہے
کیا کوئی پیمیاں شکن آنے کو تھا
دی تلی تو نے جتنی وصل میں
خواب میں اکثر شبِ غم اے حجاب

ازمغاں بابت ماہ فروری ۱۸۹۶ء

کیا تاشا ہے کہ پھر دعوائے یکتائی بھی ہے
بات مطلب کی ابھی لب تک کہیں آئی بھی ہے
کچھ تغافل ہے کچھ اس کو خوف رسوائی بھی ہے
ہائے اک چلتی چھری انداز گویائی بھی ہے
کچھ مری اس شوخ چتون سے شناسائی بھی ہے
ہم بتائے دیتے ہیں وہ شوخ ہر جانی بھی ہے

آئینہ رکھ کر وہ مصروف خود آرائی بھی ہے
میرے بانگے کی چڑھی جاتی ہیں ناحق تیوریاں
اس کی بے پروائیوں سے ناامید اے دل نہ ہو
قاتل عاشق فقط ناز خموشی ہی نہیں
مانگ بیٹھوں چلبلی آنکھوں کا بوسہ کس طرح
تم کو دل دینا ہے تو دے دو مگر دیکھو حجاب

منشی شیخ علی اختر - اختر

منشی علی اختر کے والد کا نام منشی اکبر علی تھا۔ محلہ ہمند گڑھی کے ساکن تھے ان کی سکونت قدیم سے شاہجہانپور کی تھی۔ منشی علی اختر کچھری میں محافظ دفتر تھے۔ آپ کو صنعت و حرفت سے بہت شوق تھا صنعت و حرفت پر ایک کتاب بہار قلم المعروف بہ منیار اختر لکھی تھی لیکن طبع نہ ہو سکی۔ تعذیب بنانے میں ید طولی رکھتے تھے۔ آپ کے ہاتھ کا بنایا ہوا ایک تعذیب دہلی کی ۱۹۲۵ء کی نمائش میں بہت پسند کیا گیا تھا۔ اور انعام میں سونے کا تمغہ عطا کیا گیا تھا۔ جناب اختر کو شعر و شاعری کا شوق اوائل عمری سے تھا نواب مرزا داغ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔

نمونہ کلام

پڑا تھا بے کفن لاشہ میرا کس نے مگر ڈھانکا
خط ہے جان سے بھی بڑھ کے اس میں نینایاں کا

ہوا احسان گردن پر مری ریگ بیاباں کا
نہ جا اے دل کہ ہے یہ خوف رستہ زلف پیمیاں کا

ابھی آپس میں دونوں کافر و دیندار مل جائیں
 نہ پوچھا ایک دن بھی حال تو نے لے کے دل میرا
 اسیری میں تری سیاد رہ کر وہ مزہ پایا
 ہمارے سر میں سودا ہے ہمارے دل کو وحشت ہے
 الجھ پڑتے ہیں وحشت میں نہیں سنتے ذرا میری
 گھٹا ہے۔ باغ ہے وہ گلبدن ہے اور مئے بھی ہے
 بس اب اللہ سبلی ہے ہمارے دین ایمان کا

میتسر ہر گھڑی ہے دید کیا بیدار نجاتی ہے
 مقدر رشک کے قابل ہے اختر اس کے درباں کا

منشی سید منظور علی ارشاد

منشی سید منظور علی صاحب ارشاد شاہ بھہانپوری حضرت مرزا داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ ان
 کے گھرانے میں ایسا کوئی وجود نہیں ہے جس سے حضرت ارشاد کے حالات زندگی کا کچھ پتہ
 مل سکے۔ ان کا کلام رسالہ 'زبان اردو' بابت ماہ جنوری ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا ہے جو نقل
 کیا جاتا ہے۔ اس رسالہ میں عام طور پر طرحی کلام شائع ہوا کرتا تھا۔

جدھر دیکھیں انھیں کے طالب دیدار بیٹھے ہیں
 یہ آنا کوئی آنا ہے یہ ملنا کوئی ملنا ہے
 خوشی ہے دید کے قابل مرے شوق شہادت کی
 کسی دن تو جھرو کے میں نظر آئے گی وہ صورت
 ہمیں تو بے خودی نے کر دیا ہے آپ سے باہر
 مرے گھر کی تباہی کا سبب رونا ہوا میرا
 کہیں دس بیس بیٹھے ہیں کہیں دو چار بیٹھے ہیں
 وہ آئے ہیں مگر مجھ سے الگ بیزار بیٹھے ہیں
 سنا ہے جب سے وہ خنجر بکھت تیار بیٹھے ہیں
 اسی اُمید میں جم کر پس دیوار بیٹھے ہیں
 خدا کی شان ہے ہم بے پئے سرشار بیٹھے ہیں
 یکا یک مسمسا کر سب درو دیوار بیٹھے ہیں

مراد دل خود بخود ارشاد کچھ بیٹھا سا جاتا ہے
 سنا ہے جب سے ان کی بزم میں اغیار بیٹھے ہیں

پنڈت جگموہن ناتھ رینہ شوق

شوق صاحب کے والد کا نام پنڈت ویشو ناتھ رینہ تھا۔ آپ کا خاندان کشمیری برہمنوں میں معزز شمار ہوتا ہے آپ کے جد امجد پنڈت شیو ناتھ رینہ غفور خاں والی ریاست جاوہر کے یہاں دیوان تھے۔ حکام انگریزی میں بھی اچھا سوخ تھا۔ شوق صاحب ۱۸۹۰ء میں ڈپٹی کلکٹر کے معزز عہدے پر سرفراز کیے گئے جو اس وقت ہندوستانیوں کے لئے سول میں سب سے بڑا عہدہ تھا۔ بعد پینشن محلہ گوہر پورہ میں قیام فرما ہوئے نوجوانی سے شعر و سخن کا شوق تھا۔ سب سے پہلے حضرت امیر مینائی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا پھر کچھ عرصے بعد حضرت نوح مچھلی شہری سے مشورہ سخن کرنے لگے۔ طبیعت رسا اور رنگین پائی تھی۔ آپ نے اردو فارسی پر احسان فرمایا، ایک تذکرہ کشمیری پنڈتوں کا شائع فرمایا جو ان زبانوں میں شاعری کرتے تھے شوق صاحب تاجیات شعر و شاعری میں مشغول رہے۔ آپ نے نشستوں اور مشاعروں کے لئے ایک عریض و وسیع مشاعرہ گاہ تعمیر کروائی جس میں پابندی کے ساتھ ہر اتوار کو بوقت صبح نشست اور ہر ماہ کے آخری سینچر کو شب میں عام مشاعرہ منعقد کرواتے تھے اور تقریباً ہر سال بڑے پیمانے پر کل ہند سطح کے مشاعرے اپنے صوفے سے کراتے تھے۔ یہ کل ہند سطح کے مشاعرے دو دو تین تین دن تک جاری رہتے تھے انتہائی وضع دار تھے۔ طبیعت میں خلوص، انکسار، محبت اور خوش اخلاقی بدرجہ اتم تھی جس سے ملتے جھکتے اور اس کے مرتبے کو ملحوظ رکھتے تھے۔ آپ نے طویل عمر پائی اور آزادی ہند سے کچھ قبل اس جہان فانی سے عالم جاودانی کو سدھارے۔ ان کے پوتے اور پر پوتے مرکزی گورنمنٹ میں بلند عہدوں پر فائز ہیں۔

نمونہ کلام

ہم روک لیتے گریہ بے اختیار کو	اے صنعت توڑ سکتے جو اشکوں کے تار کو
رشک فلک بنا دیا مشت غبار کو	بخشا زوج، حق نے یہ مجھ خاکسار کو
پاس آ کے دیکھ لیجئے سنگ مزار کو	مدفن یہی نہ ہو کسی ناکام کا حضور
گہرا کے کھونہ بیٹھنا صبر و قرار کو	اے دل وہ آ رہے ہیں یہ ہے وقت امتحان
اب دیکھنا ہے آپ کے خنجر کے وار کو	پیکان تیر کو تو جگر نے چھپا لیا
اے خاک گور لیے غریب الدیار کو	یہ کچھ نہ پوچھ کون ہے اور اس کو کیا ہوا

اک گوشہِ خلد میں پڑا رہنے دو اُسے
 چلنے لگے عدم سے تو کچھ آگیا خیال
 لے دے کے اب تو اکت ہی ہمدم اپنے ساتھ
 یاد وطن کی طرح رہی بے کسی بھی ساتھ
 کیا فائدہ اڑانے سے مشیتِ غبار کو
 لے آئے ساتھ ہستی ناپائیدار کو
 بھڑکانہ دیتے جیسے گادل پر شرار کو
 چھوڑا نہ تا برگِ غریبِ الدیار کو
 دیکھیں نظر بھی پڑتی ہے اس پر کسی کی شوق
 بیٹھے ہیں ہم لئے دل امیدار کو
 میں تو اس سے اک دلِ مظلوم ہی مانگا کیا
 کاتبِ روزا زل کیا جانے کیا لکھا کیا

بوقت امتحان لے دل ہے کچھ پاس خود داری
 کہیں سرپا سے قاتل پر نہ گھبرانے میں رکھ دینا

میکہ چھوڑتے تو چھوڑ دیا
 کسی پہلو اجل نہیں تلتی
 شوق کس رنگ میں ہو تم ڈوبے
 اب ٹھکانہ نظر نہیں آتا
 کچھ بہانہ نظر نہیں آتا
 کیا زمانہ نظر نہیں آتا

حسرتیں کہتی تھیں کیوں کر پاؤں پھیلائیں گے ہم
 وسعتِ دل کو جو دیکھا وہ بھی حیراں ہو گئیں

سب پوچھتے ہیں شہرِ خموشاں میں کون ہو
 حیراں ہیں کیا بتائیں مسافر کہاں کے ہیں

ہونا تھا جو وہ ہو گیا اس کا گلہ نہیں زرا
 دل پہ جو کچھ گزر گئی اس کی تمہیں خبر نہیں

پڑی ہیں پاؤں میں مستوں میں موجِ مئے کی زنجیریں
 اسیر بے خودی سب میں یہ ہے تعذیرِ میخانہ

شکستِ توبہ کی بنیاد تا برسوں رہے قائم
 ہماری خاک ہوگی شاملِ تعمیرِ خانہ

اٹھو اے شوقِ اب تم کر چکے ہو خم پہ خمِ خالی
 تمہاری کوئی ملکیت نہیں جاگیرِ میخانہ

سید تصدق حسین قرار

سید تصدق حسین قرار شرفائے شہر سے تھے۔ حضرت امیر احمد امیر مینائی لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ پختہ گو اور اساتذہ شہر میں شمار ہوتا تھا۔ نمونہ کلام۔

ادھر سینہ اٹھائے وہ لئے تلوار بیٹھے ہیں
ادھر ہم سر جھکائے جان سے بیزار بیٹھے ہیں
مٹایا دل تو کیا پایا جو ہاتھ آیا تو یہ آیا
کہ اب وہ ہاتھ رکھے ہاتھ پر بیکار بیٹھے ہیں
بتوں کی راہ میں یہ ضعف یارب تو ہی یاور ہے
ہزاروں بار اٹھے ہیں ہزاروں بار بیٹھے ہیں
ادھر انداز نخوت ہے ادھر جوش محبت ہے
وہ گھر میں اپنے بیٹھے ہم پس دیوار بیٹھے ہیں

قرار اٹھو یہ موقع ہے گلے سے اب تو لپٹالو

کہ وہ مست جوانی ہیں بہت سرشار بیٹھے ہیں

مولوی عبدالحکیم سیف

آپ کے والد ماجد کا نام سید عبدالرحیم تھا۔ آپ شاہجہا پور کے قدیمی باشندے تھے۔ مشہور متبحر عالم مجدد الدین احمد عرف مولوی مدن جو جید جامع معقول و منقول تھے اور جن کو نواب سعادت علی خاں والئی اودھ نے حاکم عدالت العالیہ لکھنؤ مقرر کیا تھا کی نسل سے تھے۔ انہی مولوی مدن کی تعریف میں انشائے اللہ خاں انشانے کہا تھا۔

ہزار شیخ نے ڈاڑھی بڑھائی سن کی سی
مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی
مولوی عبدالحکیم کی استعداد عربی بقدر ضرورت تھی مگر فارسی کے عالم تھے۔ سن شعور ہی سے سخن گوئی کا شوق پیدا ہوا اور سولہ برس کی عمر میں حضرت جلال لکھنوی کے شاگرد ہو گئے۔ تکمیل فن میں عمر کا ایک بڑا حصہ صرف کیا اور طویل عرصے تک لکھنؤ میں قیام کیا۔ استاد کی خدمت میں شب و روز حاضر رہتے اور ادبی نکات کو نقش دل بناتے۔ کچھ ہی مدت میں حشو و زوائد اور بے تکی بلند پروازی سے کلام پاک ہو گیا ۲۸ مئی ۱۹۰۹ء کو جلال مرحوم نے آپ کو اپنے ارشد تلامذہ اور افضل شاگردوں میں شمار کرنے کا اعلان کیا اور سند مرحمت فرمائی۔ حضرت سیف کثیر التعداد تلامذہ کے استاد تھے۔

حضرت جلال کے بعد بہت سے شاگرد حضرت سیف کو اپنا کلام دکھاتے اور مشورہ سخن کرتے تھے۔
حضرت سیف کا انتقال ۱۹ء میں گھریلو تنازعات کے سلسلے میں قتل کئے جانے سے ہوا۔ آپ
نے اپنے پیچھے کلام کا بہت بڑا ذخیرہ چھوڑا تھا مگر ورثہ کی عدم توجہی سے تلف ہو گیا۔ جہاں
جہاں سے جس قدر دستیاب ہو سکا پیش قارئین ہے۔ نمونہ کلام سیف
ادھر بالیں سے اٹھ کر وہ کسی کا اپنے گھر جانا ادھر بیمار غم کا کھینچ کر اک آہ مر جانا

دل میرا اس رشک یوسف کے لئے دیوانہ تھا دو جہاں جس کی خریداری کا اک پیمانہ تھا

ہائے پھر دل میں کسی کی یاد نے لیں چٹکیاں پھر خیال آ کر کسی کا مجھ کو تڑپانے لگا

کیا سے میری شب غم کی مصیبت کا خیال دن چڑھے تک جو دولائی تان کر سویا کیا

ہم کو جلیا رات بھر سوز جگر نے کیا کیا اس سے لگی نہ بچھ سکی دیدہ تر نے کیا کیا
ہجر کی سختیاں تو کچھ میرے ہی دل سے پوچھئے شام الم نے کیا کیا غم کی سحر نے کیا کیا
شمع لحد ہوئی جو گل بلبلوں نے کیا ہجوم سیف نیا اک گل کھلا باد سحر نے کیا کیا

ان کے آنچل کی ہوانے یہ کیا طرفہ اثر ناتوان عشق کو اب روز غمش آنے لگا

بھلا کیوں ابر رحمت نے اٹھائی اس قدر زحمت برسنے کے لئے کافی تھی حسرت میرے مدفن پر

کیا تر اس میں بگڑتا تھا بتا تو اے فلک دو گھڑی کو شاد ہو جاتا جو اک ناشاد دل

شوق ہوا جاتا ہے سینہ بس ہٹاؤ اپنا ہاتھ تب تھی تم اگر دو گے تو مر جائیں گے ہم
آ رہے ہیں میری تربت پر وہ یہ کہتے ہوئے آج چل کر اپنے روٹھے کو منالائیں گے ہم
کون ایسی ناز برداری کرے گا آپ کی کیجیے گا یاد، جب دنیا سے اٹھ جائیں گے ہم

طور پر چلنے کی تم نے اسے حکیم اچھی کہی کچھ تم آئے دیکھ کر کچھ جا کے دیکھ آئیں گے ہم

بس اب آنسو پوچھ ڈالو کوئی روتا ہے بھلا وقت رخصت چاہیے ہے تم کو سمجھانا ہمیں

شب غم کی اذیت میں مجھے راحت ملی کیسی
 تڑپ ہر مرتبہ کروٹ بدلواتی رہی کیسی
 یہ میری آہ سوزاں کا ہوا لٹا اثر کیسا
 الہی بیٹھے بیٹھے آگ دل میں لگ گئی کیسی
 نسیم صبح سے سن کر پیام اس غیرت گل کا
 کھلی جاتی ہے میرے دل کی پڑ مردہ کلی کیسی
 بتاؤ سیف آخر کہہ دیا کیا آ کے قاصد نے
 یہ تم پر بیٹھے بیٹھے مردنی سی چھا گئی کیسی

خزنگ نظر۔ امرتسر مئی ۱۹۰۴ء

بے محل تسکیں سے کچھ ہوگا حاصل اور بھی
 بس یہی ناخوب تڑپے گا مرا دل اور بھی
 نیم جانی نے کیا ہے مجھ کو بسمل اور بھی
 تیرے صدقے ایک پورا ہاتھ قاتل اور بھی
 میرا نالہ عرش تک کیوں جاتے جاتے رک گیا
 اس کو ملے کرتا ہے ایسی ایک منزل اور بھی
 وہ بھی دن ہوگا کہ نکلے گی ہمارے دل کی پھانس
 یہ تمنا تو کئے دیتی ہے بسمل اور بھی
 سیف کیا تنہا تھیں ہو دل سے مداح جلال
 ان کی استاد ی کے تولا کھوں ہیں قاتل اور بھی

خزنگ نظر۔ امرتسر جون ۱۹۰۴ء

حکیم مولوی سلامت اللہ خاں قادری رضوی - سلامت

حضرت سلامت اللہ خاں سلامت کے والد ماجد کا نام حشمت اللہ خاں تھا۔ سکونت محلہ رنگین چوپال کی تھی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ مدرسہ میں حسب رواج قدیم اردو فارسی اور عربی اساتذہ مدرسہ سے پڑھی۔ حکمت کی سند حاصل کر کے طبابت کو بطور پیشہ اختیار کیا۔ شعر و شاعری کا بچپن سے شوق تھا۔ طبیعت موزوں پائی تھی۔ حافظ نثار احمد خاں عرف حافظ بدھن خاں تائب کا شہرہ تھا اور وقت کے علامہ تھے۔ قادر الکلام اساتذہ میں گنے جاتے تھے حضرت سلامت تائب صاحب کے شاگردوں میں شامل ہو گئے۔ فن شاعری میں تائب صاحب کی رہبری نے سونے پر سہاگے کا کام کیا آپ کا شمار استاد کے ارشد تلامذہ میں تھا۔ ایک مجموعہ کلام شعولہ بطور جس کا تاریخی نام تحریر سلامت ہے طبع ہو چکا ہے اس انتخاب کلام میں غزلیات شنویاں۔ منظوم خطوط۔ قطعات۔ قصائد اور نعتیں ہیں حضرت سلامت نہایت خوش اخلاق۔ خوش طبع اور منکسر المزاج انسان تھے۔ شہرت کے کبھی طالب نہیں ہوئے۔ آپ کا بیشتر کلام عدم توجہی کے سبب ضائع ہو گیا۔ اجاب کے اصرار پر جو ضائع و برباد ہونے سے بچ گیا تھا وہ کلام یکجا کر کے طبع کر دیا ورنہ یہ بھی تباہ ہو جاتا۔ حضرت سلامت کے جانشین مجسم حکیم احمد علی خاں وفا ہیں جن کے تین دیوان طبع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ سلامت صاحب کے اور بھی بہت سے شاگرد ہیں جو اب تک اپنے استاد کا نام روشن کئے ہوئے ہیں۔ حکیم سلامت اللہ خاں صاحب جہاں بحیثیت شاعر ایک منفرد مقام رکھتے تھے بحیثیت طبیب بھی آپ کا دور دور شہرہ تھا اور اپنے فن میں کمال حاصل تھا۔ غزبار و مساکین کے ساتھ خاص مروت و محبت اور ہمدردی سے پیش آتے تھے۔ آپ کا انتقال ۵ نومبر ۱۹۶۸ء میں ہوا۔

نمونہ کلام حضرت سلامت

حقیقت میں یہ جینا ہے جسے کہتے ہیں مرجانا
کسی کا مشغلہ ٹھہرا مرا جی سے گزر جانا
قیامت ہے مرے پیارے ترے دل سے اتر جانا
پتہ یہ اس کے گھر کا ہے اسی پر نامہ بر جانا
سلام شوق کہہ دینا اگر اس بت کے گھر جانا

دم آخر خدا کی یاد میں جی سے گزر جانا
جو کچھ بولوں بگڑتے ہیں جو روتا ہوں تو ہنستے ہیں
خفا مجھ سے اگر تو ہو تو میں کس کا رہوں ہو کر
کوئی بیدل کوئی بے سر کوئی بے جاں پڑے ہوں گے
نسیم صبح اتنی ہے ہماری التجا تجھ سے

سلامت آرزو یہ ہے جناب کبریائی سے
کہ عشقِ احمدی میں ہو میستر ہم کو مرجانا

سیکڑوں پردوں میں رہ کر آج بے پردہ ہوا
نظمِ شہبائے فرقت زلف کا سودا ہوا
کھا کے بل وہ کاکل مشکیں نبی طوق گلو
دور بین معرفت کا آنکھ میں چشمہ لگا
بیٹھے بیٹھے حسن کو خود عشق کا چسکا ہوا
بڑھتے بڑھتے قامت آہ رسا طوبیٰ ہوا
طلقہ زلف معبّر کان کا بالا ہوا
پی کے صہبائے محبت میں جو متوالا ہوا
میں سلامت صوفیوں میں پیشتر مشہور تھا
اب تو بندہ ہو گیا ہوں دختِ رخسار کا

نواب حیدر علی خاں - حیدر

نواب حیدر علی خاں حیدر نواب قادر علی خاں رئیس قلعہ کی تیسری بیوی کے بطن سے تولد ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے دور میں بوجہ الزام بغاوت جب کل جائیداد نواب قادر علی خاں کی ضبط ہوئی تو سرکار نے ازراہ عنایت خورد و نوش و پرورش کے لئے تین مواضع پنپتی۔ پنچولی اور سربانگ پور ضبط کیے اور ان کو حیدر علی خاں کے حوالہ کر دیئے مگر قلعہ کے ساتھ جب رہائشی مکانات بھی زمین کے برابر کر دیئے گئے تو خورد محل (والدہ نواب حیدر علی خاں) نے معہ فرزندوں کے پنپتی، میں مکانات تعمیر کر کر سکونت اختیار کر لی۔ چند سال کے بعد تینوں بھائیوں جعفر علی خاں، اصغر علی خاں اور حیدر علی خاں نے جائیداد تقسیم کر لی۔ پنچولی حیدر علی خاں کو موضع پنپتی جعفر علی خاں اور سربانگ پور اصغر علی کے حصہ میں آیا۔ حیدر علی خاں نے پنچولی اور اصغر علی خاں نے سربانگ پور بوجہ قرصہ کے فروخت کر ڈالا۔ جب حیدر علی خاں قابل تعسیم کے ہوئے تو معلم رکھ کر مکان ہی پر پڑھنے لگے۔ طبیعت موزوں لے کر پیدا ہوئے تھے شاعری کا بھی شوق ہوا حافظ نثار احمد خاں تائب کے شاگرد ہوئے ان کو پنپتی میں ملازم رکھ کر کچھ زمانہ تک پڑھا اور عروض کی کتابیں دیکھیں، کلام میں اصلاح لی۔ دو تین سال رہ کر حافظ نثار احمد خاں تائب پنپتی سے شہر کوچے آئے۔ کثرت مشق اور اساتذہ لکھنؤ و دہلی کے

کلام نے دوسرا استاد ڈھونڈنے کی تحریک کی چنانچہ جعفر علی خاں لکھنؤ کو بھیجے گئے وہ نواب احمد حسین خاں جوش کو لے آئے جو حضرت امیر مرحوم کے کہنے مشق شاگرد اور نواب محبت خاں ابن حافظ رحمت خاں شہید کی اولاد میں تھے۔ قریب ایک ماہ وہ مقیم رہے مگر ان کی قابلیت پسند نہیں آئی اس لئے واپس کر دیا۔ دوسری مرتبہ جعفر علی خاں سید ضامن علی جلال لکھنؤ کو لے آئے ان کی لیاقت استادانہ بہت پسند آئی لہذا بلا مجتہد نواب حیدر علی خاں شاگرد ہو گئے اور حضرت تائب سے قطع تعلق کر لیا۔ کچھ ہی عرصے میں یہ اچھے خاصے شاعر ہو گئے۔ ریاست سروہی میں تحصیلداری پر مامور ہوئے۔ بڑے خلیق و مہمان نواز انسان تھے کلام بہت تھا۔ گلدستوں میں چھپتا تھا۔ آپ کے شاگرد شاہجہانپور اور بیرون شاہجہانپور بھی کافی تعداد میں تھے۔ نمونہ کلام کے بطور کچھ اشعار درج ذیل ہیں۔

تم نے شاید ابھی دیکھے نہیں مرنے والے	امتحان اور کالو ہم نہیں ڈرنے والے
یوں ہنہا دھو کر نکھرتے ہیں نکھرنے والے	خون میں ڈوب کے اس تیغ کے جوہر چمکے
لئے مرتے ہیں مسیحا کو بھی مرنے والے	ایک الزام مجسم ہیں تمہارے بیمار

دکان مئے لگا کر ہم سر بازار بیٹھے ہیں	بھلا توڑے تو آکر محتسب مینا و ساغر کو
لسان گرد ہم اٹھ اٹھ کے توتوتو بار بیٹھے ہیں	ترے کوچے میں کل بیتابی دل کا یہ عالم تھا

اپنا بھی رنگ بزم طرب میں جمائے دل	شوخی پر آئیں وہ تو شرارت پر آئے دل
حیدر کہو کچھ اور بھی ہے مدعاے دل	اُن کا شب وصال یہ شوخی سے پوچھنا

اب آنکھ میں سرمے کی جگہ گرد سفر ہے	رخصت کی گھڑی شام جوانی کی سحر ہے
دل دے کے خریدتا ہے یہ وہ درد جگر ہے	کس طرح نہ ہو جان سے قربان ہوں اس پر
کانوں سے یہ سنتے رہو تم، آپ کا گھر ہے	دل میں وہ جگہ دیں گے نہ اپنے کبھی حیدر

حاجی میر تاج حسین صاحب تاج تلمیذ حضرت تائب

حاجی میر تاج حسین صاحب تاج تلمیذ خدای گنج سے منسلک موضع جلال پور ضلع شاہجہانپور کے رہنے والے تھے مگر آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ بمبئی میں گزرا۔ آپ شاہجہانپور کے مشہور شاعر جناب حافظ نثار احمد خاں تائب کے شاگرد تھے اس سے زیادہ حالات کا پتہ نہیں لگایا جاسکا۔ نمونہ کلام رسالہ جلوۂ یار میرؒ بابت ماہ فروری ۱۹۱۰ء سے منقول ہے۔

بآسانی تمنا وصل کی کیا دل سے نکلے گی
بڑی الجھن بڑی دقت بڑی مشکل سے نکلے گی
صدائے اُن نہ مقتل میں لب بسمل سے نکلے گی
ہو اے روح پرورد امن قاتل سے نکلے گی
بڑا کرتے ہو دیکھو کر رہے ہو حجت پیمسا
نئی پھر بات کوئی بحث لاطائل سے نکلے گی
حصول مدعا کے واسطے ہے شرط قسمت بھی
نہ کوئی بات اپنی سعی لا حاصل سے نکلے گی
ہمارے دل میں تم ہو گے تمھارے دل میں ہم ہوں گے
یہ صورت دیکھ لینا الفت کامل سے نکلے گی
جہاں ٹھہریں گے ہم تو ہو گا آغوش تصور میں
ہماری منزل مقصود ہر منزل سے نکلے گی
ہم ان سے پا کے موقع حشر میں کچھ کہنے والے ہیں
مگر کاہے کو خلقت اس بھری محفل سے نکلے گی
شکست عہد و پیمان ظلم بیجا ہی سہی لیکن
دعا پھر بھی ہمارے ٹوٹے پھوٹے دل سے نکلے گی
بسی ہے اے تاج تلمیذ ایسی تصویر اپنی آنکھوں میں
کہ عالم کے مرقع میں بڑی مشکل سے نکلے گی

ملک حشمت اللہ خاں قیس

ملک حشمت اللہ خاں قیس ابن ملک ہدایت اللہ خاں ساکن محلہ خلیل شرفی ۱۰ فروری ۱۸۸۶ء کو پیرا ہوئے۔ خاندانی تمول تھا۔ باپ دادا زمیندار تھے ناز و نعم میں پرورش پائی۔ حسب رواج معاش سے گھر پر ابتدائی تعلیم ہوئی۔ انگریزی اسکول میں انٹرینس تک پڑھا۔ فوٹو گرافی کا بچپن سے شوق تھا شوق کی تکمیل کے لئے اسی فن کو پیشہ بنا لیا۔ اردو فارسی سے اچھی واقفیت تھی طبیعت میں شاعری کا مادہ موجود تھا۔ شعروں کو لگے اور نواب ناظم علی خاں ہجر کے شاگردوں میں شامل ہو گئے۔

۱۹ فروری ۱۹۷۲ء کو اس دار فانی سے عالم جاودانی کو سدھار گئے۔

نمونہ کلام

کیا مبارک تیری بے ہوشی دل بیمار تھی تیرے رُخ پر جب ہوائے دامن دلدار تھی
بجر کی ایک ایک ساعت کاٹنی دشوار تھی میری ہر ہر سانس میرے واسطے تلوار تھی

ارمان ترے ہیں کوئی بیگانہ نہیں ہے اب خانہ دل خیر سے وایرانہ نہیں ہے
ہنس ہنس کے جو تم پوچھتے ہو رازِ محبت دیوانہ اب اتنا دل دیوانہ نہیں ہے

کسی کے رحم و کرم کا امتیاز نہ ہو گناہ یہ بھی ہے زاہد گناہ گار نہ ہو
قسم نہ عذر تغافل پہ کھایے میری جو اعتبار بھی ہوتا ہو اعتبار نہ ہو

جھٹک کے ہاتھ سے دامن وہ مسکرا کے چلے دل و جگر پہ مرے بجلیاں گرا کے چلے
گرے وہ ٹھوکریں کھا کر جو سراٹھا کے چلے بشر کو چاہیے گردن ذرا جھکا کے چلے

منشی عابد حسین عابد مینائی

آپ کے والد کا نام احمد بخش قریشی تھا فوج میں غلہ کے ٹھیکیدار تھے۔ آبائی وطن شاہجہانپور ہے۔ حضرت عابد ۱۸۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ امداد الاسلام میرٹھ سے فارسی کی سند لی اور مدرسہ عین العلوم شاہجہانپور سے عربی میں تکملا کیا ۱۹۱۵ء سے آغاز شعر گوئی ہو اور اسی وقت اعتبار الملک حضرت دل شاہجہانپوری کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ استاد محترم کی زندگی تک خود کو ان کے سایہ شفقت سے بے نیاز نہیں رکھا اپنی ذاتی قابلیت اور ذہانت کی وجہ سے بہت جلد فارغ التحصیل ہو چکے تھے اور کثیر تعداد میں شعراء خود ان سے فیض حاصل کرتے تھے مگر اس کے باوجود اپنے استاد محترم کی زندگی میں حضرت عابد نے اپنے آپ کو استاد کے مفید مشوروں کا دست نگر سمجھا ۱۹۵۵ء میں مقامی شعراء ادبار معززین شہر کی موجودگی میں حضرت دل نے عابد صاحب کو اپنا

جانشین مقرر کر دیا۔ عابد صاحب کے ہم عصر شعرا حضرت اسعد شاہ بھہا پوری حضرت گوکب شاہ بھہا پوری اصغر علی خاں صاحب اصغر شاہ بھہا پوری اور جناب عبدالسمیع خاں نکیت شاہ بھہا پوری وغیرہ ہم تھے۔ حضرت عابد کے دو مجموعے طبع ہو چکے ہیں۔ اور اہل نظر سے داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اپنی آخری عمر میں ذہنی توازن میں فرق آجانے سے وہی تباہی گشت کرتے رہتے تھے۔ ۲۳ جون ۱۹۶۹ء کو بیٹھے بیٹھے گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور پھر یہ پتہ نہ چل سکا کہ ان کا کیا حشر ہوا۔ ان کے اکلوتے فرزند حضرت حامد مینائی باپ کی واپسی کا انتظار کرتے کرتے تھک کر قبر میں جا سوئے۔ حضرت عابد نے اپنی زندگی میں اپنا بہت سا کلام خود صنائع کر دیا۔ اصناف سخن میں غزل اور رباعی کی طرف میلان خاطر زیادہ تھا فردوس جمالی، مجموعہ رباعیات اور 'فردوس خیال' انتخاب غزلیات ہے۔

بقول جناب شبیر حسن خاں صاحب ایڈووکیٹ ان کے کلام سے بہتوں کا بھلا ہوا اور وہ اسے کار ثواب سمجھ کر لٹاتے رہے۔ عابد صاحب کے شاگردوں کی کثیر تعداد ہے جو ہندوستان اور پاکستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ عابد صاحب کی زندگی میں پورا شاہ بھہا پور مشاعرہ گاہ تھا۔ آج یہاں کل وہاں روز کسی نہ کسی محلے اور علاقے میں ان کے دم سے مشاعرے ہوتے تھے ان کے جلتے ہی گویا ہر طرف سناٹا اچھا گیا شاید ایسا کوئی مرد میدان شعر و سخن نہ تھا جو ان کی جگہ پر کر سکتا۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

نمونہ کلام (رباعیات)

قسمت میں تری فکر رسا ہے کہ نہیں
دل کو کوئی احساس ملا ہے کہ نہیں
یہ چاند یہ تارے یہ فضا سے رنگیں
یہ وہم ہے کیوں تجھ کو خدا ہے کہ نہیں

روداد محبت نہ کہو تم عابد
بیرگاہ تکیں دل مایوس ہی
اچھا یہ ہے خاموش رہو تم عابد
جذبات کی رو میں نہ بہو تم عابد

عابد رخ پرواز بدل دوں، تو بہ
اجباب کا اعزاز تو ہے نظروں میں
میں اپنی تگ و تاز بدل دوں، تو بہ
گفتار کا انداز بدل دوں، تو بہ

خوش ہوں کہ ملے آج سہارے مجھ کو
ساحل کی حقیقت ہے مری نظروں میں

پیغام سکوں دے گئے دھارے مجھ کو
ساحل سے نہ اب کوئی پکارے مجھ کو

بیگانوں میں ہمراز نکل آتے ہیں
کچھ مونس و دمساز نکل آتے ہیں
مایوس نہ ہوائے دل آشفۃ نصیب
انداز سے انداز نکل آتے ہیں

پروائے کرم ہے نہ تمناے کرم
ہوتا دل مایوس پہ کچھ اور ستم
ناکامی پیہم نے بدل دی فطرت
عابد مرے ہر غم میں ہے اک لذتِ غم

تحریر سے تحریر بدلنا ہے مجھے
تصویر سے تصویر بدلنا ہے مجھے
اک زندگی نو کا طلب گار ہوں میں
زنجیر سے زنجیر بدلنا ہے مجھے

ناکام ابھی تک ہے تری سعیِ عمل
احساس حقیقت نہیں اب تک تجھ کو

جینا ہے اگر تجھ کو تو انداز بدل
اس عالم رنگ و بو سے اور آگے چل

آشنا ہے ترے جلووں کی حقیقت سے نظر
لب نازک پہ تبسم کا یہ دلکش انداز
کبھی دنیا سے تسلی کبھی اک نشتر جاں
شکبہ غم ہے نہ بر باد می دل کا ہے ملال
جلوے بے تاب تماشہ تبسم ہے فضا

کیوں نہ اک موج تبسم ہو مرے ہونٹوں پر
جیسے کوثر سے اٹھی ہو کوئی موج کوثر
کوئی سمجھانہ ابھی تک ترا انداز نظر
کیوں ہے شر مندہ بیداد وہ معصوم نظر
آج شاید ہے ترا نام مرے ہونٹوں پر

ہوس باد پرستی ہے ابھی تک دل میں بعد تو بہ بھی مرے لب پہ ہے ساغر ساغر
کس سے افسانہ ناکامی تقدیر کہوں نوحہ بن جاتا ہے نغمہ بھی مرے ہونٹوں پر
عظمت میکدہ پوچھے کوئی مجھ سے عابد
پینے آتا ہے یہاں شیخ حرم چھپ چھپ کر

رعنائی جمال کا دل رازداں کہاں یہ داستان شوق ابھی داستاں کہاں
مجھ سا چمن میں اب کوئی آتش بیاں کہاں کچھ ہم مذاق تو ہیں مگر ہم زباں کہاں
برباد ہو کے اور سکوں مل گیا مجھے جب آشیاں نہیں تو غم آشیاں کہاں
کچھ اور حادثے بھی ہیں کچھ اور غم بھی ہیں مرزاہ وفا میں حسد امتحاں کہاں
گزر اہوں آستاں حرم سے تو بارہا جس کی مجھے تلاش ہے وہ آستاں کہاں
کس سے کہوں فسانہ سوز و گداز دل کچھ غم گسار تو ہیں مگر رازداں کہاں
شامل مری نوا میں ٹوکے سروش ہے
عابد یہ طرز خاص یہ کیفیت بیاں کہاں

فرید الشعراء سید ظہور احمد وحشی

سید ظہور احمد وحشی کے والد ماجد کا نام سید احمد اللہ تھا۔ اصل وطن بخارا تھا جہاں سے اس خاندان کے جد امجد حضرت سید عابد صاحب قدس اللہ سرہ دور مغلیہ میں وارد ہندوستان ہوئے اور چتلی قبر پرانی دہلی میں قیام فرمایا۔ جب افراد خاندان میں اصناف ہو اتو ادھر ادھر شہروں میں منتقل ہو گئے۔ سید احمد اللہ ذی علم اور صاحب فضیلت تھے۔ اپنے بیٹے کی تعلیم پر توجہ خاص مبذول کی کچھ خداداد ذہانت اور شوق اکتساب علم اور کچھ والد محترم کی نگرانی و تربیت ابتدائی تعلیم کے بعد ندوۃ العلماء، لکھنؤ بھیج دیئے گئے۔ فارسی اور عربی میں غیر معمولی مہارت حاصل کر لی۔ ۱۹۰۲ء میں جبکہ وحشی صاحب کی عمر بارہ سال کی تھی ان کے عروسی اور عربی داں ہونے کا شہرہ ہو چکا تھا اتفاق سے اسی سال بدایوں کے ایک سن رسیدہ عروسی جو عالم ادیب اور شاعر بھی تھے دارالعلوم میں تشریف لائے۔

انہوں نے حضرت وحشی کا امتحان لیا چند عربی اشعار کی تقطیع اور ذہافات دریافت کئے جس کا جواب بے تامل دیا گیا۔ وہ بزرگ حیرت زدہ رہ گئے انہوں نے بار بار امتحان لیا اور ہر بار ان کی حیرت میں اضافہ ہوا انہوں نے وہ واقعات اخبار، وکیل، امرتسر، اور کرزن گزٹ، دہلی میں شائع کئے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں بارہ سال کی عمر کا ایک لڑکا ایسا زبردست عروضی ہے۔ حضرت وحشی نے عربی زبان میں شعر موزوں کرنا شروع کر دیئے۔ حضرت مولانا سید عبدالحمیٰ نائب ناظم ندوہ کے ایک عربی قصیدے کی بحر و زمین میں خود ایک نعتیہ قصیدہ تصنیف کیا۔ جس کی وہاں کے علماء نے بے حد تعریف کی۔ ہر تقریب کے موقع پر حضرت وحشی سے بزبان عربی سپاس نامہ یا اشعار لکھوائے جاتے تھے۔ دارالعلوم وحشی صاحب کے بعض احباب مثلاً مولوی جمیل حسین انیق، مولوی رکن الدین دانا سہسرامی۔ مولوی مصطفیٰ حسین صاحب مصطفیٰ ملیح آبادی۔ مولوی محمد احمد صاحب تلہری (شاہجہا پوری) مولوی احمد حسین صاحب لکھنوی وغیرہ اردو میں شعر کہتے تھے۔ حضرت وحشی کو اردو شاعری کی بالکل مشق نہ تھی ان احباب نے مشاعرہ منعقد کیا۔ طرح تھی =

ہا سے بے نور پڑی ہے مری تربت کیسی۔ وحشی صاحب کو بھی غزل کہنے پر مجبور کیا وحشی صاحب نے باوجود اردو میں غزل گوئی کی مشق نہ ہونے کے ایک غزل تصنیف کی جس کا ایک شعر دستیاب ہوا ہے

میں شب و روز تمہیں یاد کیا کرتا ہوں
اور کیا جانئے ہوتی ہے محبت کیسی

وحشی صاحب کی عربی شاعری کا یہ زور تھا کہ بات بات میں شعر کہتے تھے۔ ان کے اساتذہ اردو مضامین کو عربی میں وحشی صاحب سے ترجمہ کراتے تھے۔ اگرچہ ان کی عمر کا تیرہواں سال تھا مگر عربی زبان کی ان بجز میں شعر کہتے تھے جن کو ہزاروں عربی داں اشخاص صحیح وزن کے ساتھ پڑھ بھی نہیں سکتے تھے اور جن میں عروض کی کامل واقفیت کے بغیر ایک مصرع بھی صحیح طور پر موزوں نہیں کیا جاسکتا۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد وحشی صاحب لاہور چلے گئے اور وہاں کی صحبتوں سے متاثر ہو کر اردو شاعری کا رخ کیا اور مولانا رومی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور کے مشورے سے وحشی تخلص اختیار کر لیا۔ اسی دوران فخر پنجاب شیخ سید عبدالقادر سے جو اس وقت انگریزی اخبار 'آبزرور' اور اردو رسالہ 'مخزن' کے ایڈیٹر تھے ملاقات ہو گئی۔ شیخ صاحب اسلامیہ کالج کے پروفیسر بھی تھے۔ شیخ صاحب وحشی صاحب سے بہت محبت سے پیش آئے اور ایک دن دوران ملاقات وحشی صاحب سے فرمایا کہ وہ مشق شاعری کے بجائے مضمون نویسی کی مشق کریں۔ شیخ صاحب

عنوان دے کر مضمون لکھوانے لگے۔ وحشی صاحب دو سال لاہور میں رہے اس دوران ہزار ہا صفحات نثر کے لکھ ڈالے لیکن شعر ایک بھی نہیں کہا چوں کہ جذبات دل جوانی کی منزل میں تھے شاعرانہ تحصیل اپنا ایک صحیح موزوں اور ادبی ذوق اپنی رعنائیوں کے مظاہرے کے لئے ایک عملی میدان کا طالب تھا۔ ۱۹۰۶ء میں وحشی صاحب کانپور تشریف لے گئے اور کچھ دن وہاں رہنے کا اتفاق ہوا وہاں حکیم الطاف احمد آزاد انصاری سے ملاقات ہوئی۔ حکیم آزاد اردو کے مقبول شاعر تھے۔ حکیم آزاد کی ملاقات اور ترغیبات نے وحشی صاحب کے ذوق خوابیدہ کو بیدار کر دیا اور مشق سخن کرنے لگے اس وقت وحشی صاحب کی عمر تقریباً ۱۶، ۱۷ کی تھی اور اس دور میں جو اشعار انھوں نے موزوں فرمائے ان میں سے چند بطور نمونہ درج کرتا ہوں۔ ناظرین قیاس کر سکتے ہیں کہ جو شخص ۱۱ سال کی عمر میں زبان عربی میں قصیدہ کہہ چکا تھا وہ کس قدر ذہین طباع اور جدت طراز ہوگا۔

کثرت غم سے یہ حالت ہوگئی	بات کرنی بھی قیامت ہوگئی
نہ وہ آرزو ہے نہ حسرت ہے اب	خدا جانے کیا دل کی حالت ہے اب
کیا یہ سچ ہے کہ حشر میں واعظ	آشنا ہوگا آشنا کے ساتھ
تپک ہوتی ہے مرہم سے زیادہ	یہ کس انداز کا زخم جگر ہے
دوا ہو چکی اور دعا ہو چکی	دل مبتلا ہو شفا ہو چکی

کانپور میں صحبتوں کا لطف اٹھا کر وحشی صاحب گورکھپور چلے گئے اور وہاں کچھ مدت رہنے کا اتفاق ہوا۔ مولوی سید سجان اللہ صاحب رئیس اعظم کے دولت کدے پہ قیام رہا۔ موصوف اعلیٰ درجہ کے سخن فہم تھے۔ اسی زمانے میں مولوی احسان اللہ صاحب عباسی وکیل۔ منشی قطب الدین صاحب اور مولوی عبدالرحمن صاحب ادھی صاحب کے ملاقات رہی اور شعر و سخن کا چرچا جاری رہا۔ ۱۹۰۸ء میں چند روز کے لئے پھر کانپور آگئے اور وہاں سے بمبئی تشریف لے گئے۔ بمبئی سے اپنے وطن شاہجہانپور واپس آگئے۔ چونکہ طالب علمی سے اب تک کا زمانہ دیگر اضلاع میں گزرا تھا اس لئے وطن کے اہل سخن حضرت وحشی کے شاعرانہ جوہروں سے ناواقف تھے۔ شاہجہانپور میں شعر و شاعری کا چرچا تھا اُسے دن مشاعرے ہوتے رہتے تھے مگر وحشی صاحب کو شریک ہونے کا موقع نصیب نہیں ہوا مگر اپنی شعر گوئی سے اجاب کی ضرورتیں ضرور رفع کرتے رہتے تھے۔ اکثر شادی کے رقعے، خطوط اور درخواستیں نظم میں لکھیں۔ شعرائے شاہجہانپور کو جب معلوم ہوا کہ آپ بھی شاعر ہیں تو اکثر مشاعروں میں مدعو کئے گئے۔ جہاں آپ نے طرحی غزلیں پڑھ کر داد سخن حاصل کی۔ فرصت

کے اوقات میں انگریزی ادب سے بھی استفادہ کرتے رہے اور اس مدت تک زبان سیکھ لی کہ اس زبان کی شاعری کا لطف محسوس ہونے لگا۔ آپ ہندی نہیں جانتے تھے مگر اس زبان کی شاعری پڑھوا کر سنتے تھے اور ہندی اشعار کا ترجمہ کروا کر لطف اٹھاتے تھے۔ آپ فرماتے تھے کہ ہر زبان کی شاعری جداگانہ انداز رکھتی ہے ان کے خیال میں اردو شاعری سب سے کم درجہ رکھتی ہے تخنیل کی نزاکت اور بلند پروازی میں فارسی کا درجہ سب سے بلند ہے۔ ہندی میں جذبات و کیفیات کی فراوانی ہے انگریزی اور عربی میں سادگی و صداقت ہے۔ جس طرح زبان اردو، ہندی، فارسی، عربی، ترکی اور انگریزی وغیرہ زبانوں سے مرکب ہے اردو شاعری بھی ہندی، فارسی اور عربی تخنیل سے مستفاد ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ کوئی شاعر اور کوئی نثر نگار اس وقت تک صحیح اردو نہ بول سکتا ہے اور نہ لکھ سکتا ہے جب تک وہ عربی فارسی سے بقدر ضرورت واقف نہ ہو۔ حضرت وحشی ۱۹۱۵ء تک بطور شاعر معروف و مقبول ہو چکے تھے اور اپنی عظمت کا سکہ دلوں پر بٹھلا چکے تھے۔ شاہجہانپور سے آپ دہلی تشریف لے گئے اور وہاں عرصہ تک قیام رہا۔ دہلی میں قیام کے دوران آپ ہندوستان کے بیشتر کل ہند سطح کے مشاعروں میں شریک ہوتے رہے۔ شرفارو امراء اور شعراء دہلی حضرت وحشی کے مدح سرا تھے اور احترام کرتے تھے۔ حکیم اجمل خاں صاحب اوقات فرصت میں آپ کو خصوصی طور پر بلواتے اور لطف کلام اٹھاتے تھے۔ اگر کوئی والئی ریاست سخن فہم و سخن داں آپ کا مہمان ہوتا تو وحشی صاحب ضرور طلب کئے جاتے تھے۔ حضرت حسن نظامی مرحوم تو گویا وحشی صاحب کے عاشق تھے۔ ۱۹۱۵ء میں روزنامہ، 'زمانہ' کے مدیر کی حیثیت سے آپ کلکتہ گئے مگر آب و ہوا کی ناموافقیت سے دو ماہ بعد ہی واپسی کے لئے مجبور ہو گئے اور شاہجہانپور ٹھہرتے ہوئے دہلی چلے گئے۔

۱۹۲۰ء میں حضرت خواجہ حسن نظامی۔ بھنیا احسان الحق اور بعض دیگر لائق لوگوں نے ایک اعلان شائع کیا کہ حضرت امیر خسرو کے عرس میں ایک بزم مشاعرہ 'بزم خسروی' کے نام سے منعقد ہوگی۔ بزم خسروی کی خصوصیت یہ ہوگی کہ حضرت امیر خسرو کا فارسی کلام اردو میں بصورت ترجمہ کر کے پڑھا جائے گا۔ ہر شاعر کا کلام سات مشاہیر کے بورڈ میں پیش ہوگا جسے اول نمبر قرار دیا جائے گا اسے 'فرید الشعراء' دوسرے نمبر والے کو 'نظام الشعراء' اور تیسرے نمبر والے کو 'امیر الشعراء' خطاب دیا جائے گا۔ اس اسکیم میں چند روز بعد اتنا اور اضافہ ہوا کہ اردو میں طرحی غزلیں بھی ہوں گی اور وہ بھی بورڈ کے سامنے پیش کی جائیں گی۔ تاریخ متعینہ پر مشاعرہ ہوا جس میں بیرونجات کے شعراء کے علاوہ دہلی کے حضرت سائل۔ آزاد انصاری۔ حضرت قوی۔ حضرت جری۔ حضرت منتظر حضرت وحی کا کورو، وغیرہم۔ علامہ

شہر، امر او شرفاً موجود تھے۔ حضرت وحشی نے اپنی باری پر اپنا کلام پیش کیا اور اس کے بعد ہر شاعر کا کلام برائے انتخاب بورڈ کے روبرو پیش ہوا جس نے فرید الشعرا کا خطاب حضرت وحشی کو دیدیا یہ ایک بڑا اعزاز تھا۔ نمونے کے طور پر طرحی غزل کے چند اشعار بھی پیش ہیں۔

تا چند دل سے دولت پنہاں نکالئے آسان نہیں کہ حسرت مڑگاں نکالئے
 طے کر چکا ہے درد جگر اپنی منزلیں بے سود ہے کہ اب کوئی ارماں نکالئے
 الجھے ہوئے ہیں تار نفس میں جنوں کے ہاتھ فرصت کہاں کہ تار گریباں نکالئے
 مجھے نہ شان عفو و کرم جس کو سوؤ ظن وہ صورت تلافی عصیاں نکالئے

جو لانگہ حیات نہیں درخور جنوں

وحشی اب اور کوئی بیاباں نکالئے

ایک بار خواجہ حسن نظامی کے یہاں بہار کے ایک نامور شاعر مولانا شفق مقيم تھے۔ مولانا شفق کے شاگرد شمس صاحب بھی آتے جاتے تھے۔ خواجہ صاحب نے وحشی صاحب کو ٹیلیفون کیا کہ تانگہ بھیج رہا ہوں دوپہر کا کھانا ساتھ کھائیے۔ وحشی صاحب پہنچے تو دیکھا کہ خواجہ صاحب۔ مولانا شفق۔ جناب شمس اور ایک خوبصورت جوان عورت جو مناسب اعضا اور گداز بدن کی بنا پر ایک ملکہ معلوم ہوتی تھی موجود تھی۔ وحشی صاحب کو اس نظارے سے متاثر دیکھ کر خواجہ صاحب نے فوراً بتا دیا کہ یہ دہلی کی مشہور رقاصہ و مطربہ 'خورشید' ہیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر محفل شعر و سخن گرمائی اور کلام سنا سنا یا گیا۔ حضرت وحشی نے برجستہ ایک قطعہ پیش کیا ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے حاضر ہے وہ ارباب تماشہ جن کی آنکھوں میں بصیرت ہے عجب کیا ہے کہ اس کا شانہ کو چرخ بریں سمجھیں
 جہاں یارب شفق ہو، شمس ہو خورشید تاباں ہو کوئی سمجھائے ہم کو ہم اسے کیوں کر میں سمجھیں
 وہ ایک باکمال شاعر ہونے کے علاوہ بہترین نثر بھی تھے۔ مرحوم نے دہلی سے رسالہ تجلی۔ رسالہ روزگار۔ اخبار فاران روزنامہ اور فاران ہفتہ وار جاری کیا۔ دہلی میں تجلی پریس قائم کیا۔ آپ تقریباً پانچ سو کتابوں کے مصنف اور مترجم تھے۔ چوں کہ فن حکمت حکیم مفتی سلیم اللہ صاحب جو بڑے فاضل اور لائق طبیعت تھے حاصل کیا تھا اس لئے اس علم و فن پر بھی آپ کی تصانیف ہیں۔ پینتالیس سال تصنیف و تالیف میں صرف کر کے ۱۳ مارچ ۱۹۴۲ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے دہلی میں انتقال فرما گئے۔ مرحوم انگریزی۔ اردو۔ فارسی۔ عربی اور ہندی زبانوں میں اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے اور ان زبانوں میں تحریر و تقریر میں ملکہ حاصل کر لیا تھا۔ آپ کی قبر درگاہ خواجہ نظام الدین اولیاء کے پھاٹک کے قریب جانب اتر لائبریری

خواجہ حسن نظامی میں ہے۔ رحلت کے وقت عمر تقریباً باون سال تھی آپ کی اولاد میں سید حسن اختر، سید حسین زاہد اور ایک دختر عطیہ بیگم تھی عطیہ بیگم کا انتقال مرحوم کی حیات میں ہو گیا تھا نواسہ سید محمد احمد موجود ہے سید حسن اختر حیات میں دوسرے صاحبزادے سید حسین زاہد پاکستان ہجرت کر گئے جہاں ان کا انتقال ہو گیا حضرت وحشی کی زندگی کا بیشتر حصہ بیرون وطن گزرا اور ادبی مشاغل پیش نظر رہے۔ راقم الحروف کو مرحوم کے حالات ان کے فرزند سید حسن اختر سے حاصل ہوئے اور کلام بھی دستیاب ہو گیا۔ بطور نمونہ وہی کلام پیش کیا جاتا ہے جو خود صاحب تصنیف نے انتخاب کر کے اپنی سوانح ظلم افکار میں درج کیا ہے۔ مولانا مرحوم کی تصنیف 'ظلم افکار' جو ایک طرح سے سوانحی خاکہ ہے نظروں سے گزرا ہے۔

خندہ زن بے تپ الفت جو دو کرتے ہیں مسکراتی ہے مشیت جو دعا کرتے ہیں

تھیں ہنگامہ جوش تمنا کی خبر کیا ہے مرے پہلو سے تم اٹھتے تو اک محشر بپا ہوتا

وہ آئیں گے سحر کو یہ ائے نامہ بردر دست لیکن مریض غم کو امید سحر کہاں

اک برق تو دیکھی کہ سراپردہ سے چمکی زہنار کسی کا رخ تاباں نہیں دیکھا

اب ائے ہجوم شوق تری کیا صلاح ہے پوچھا ہے اُس نے حال دل بقیہ رار کا
تھی وہ ادا سے خدر ستم اور بھی ستم عالم نہ پوچھئے نگہ شرمسار کا

دل کو خوشی بہت ہے نوید وصال کی اس وقت یاد آئے نہ یارب مآل کی
پھر کوئی مست ناز ہوا رونما خواب پھر انجن ہے گرم ہمارے خیال کی
احساس کچھ ہوا نہ ترے لطف عام کو حالانکہ بن گیا کوئی صورت سوال کی

کانپ اٹھا مرے پہلو میں دل دور اندیش جب نمایاں تری چتون سے محبت دیکھی
ہائے وہ مجھ سے شب وعدہ تصور کے فریب کہ جدھر آنکھ اٹھائی تری صورت دیکھی

شاید اب اس کی بارگہ ناز سے قریب
کیا انتظار مرگ میں بیٹھا ہوں مطمئن
مجھ میں قدم اٹھانے کی طاقت نہیں رہی
گویا اب اور کوئی مصیبت نہیں رہی

شاید غبارِ غم کا یہی اک علاج ہے
کچھ دیر رو لئے تو طبیعت سنبھل گئی

نعش اک خون میں ڈوبی ہوئی آتی ہے نظر
دل غمدیدہ انجام لرز جاتا ہے
ہم جو اندیشہ انجام وفا کرتے ہیں
اب جو دو شخص بہم عہد وفا کرتے ہیں

محمد علی حسین خاں برق

حضرت برق کے والد کا نام محمد فخر الدین خاں تھا۔ آپ اہل افغانہ میں سے تھے اور شرفاد
امرا شہر میں شمار تھا محلہ خواجہ فیروز کے ساکن تھے۔ آپ کے آباؤ اجداد افغانستان سے آکر
آباد ہو گئے تھے۔ نوابین شاہجہا پور نے جاگیریں عطا فرمائیں۔ آپ کو بارہ سال کی عمر سے شامی
کاشوق پیدا ہو گیا۔ پہلے مولوی ستار بخش راقم شاہجہا پوری سے اصلاح لیتے رہے پھر منشی
احسان علی خاں احسان کے شاگرد ہوئے پھر کچھ عرصے بعد رامپور جا کر منشی امیر احمد مینانی
سے استفادہ کیا۔ طبیعت چلبلی اور شوخ پائی تھی۔ نثر بھی اچھی لکھتے تھے۔ آپ کے چار تخلص
تھے شوخ۔ طرار۔ بیقرار اور برق۔ جو تخلص باسانی موزوں ہو جاتا وہی لکھ دیتے مگر زیادہ تر برق پسند
تھا۔ ۱۹۳۶ء میں ایک قاتل کی گولی کا شکار ہوئے جبکہ اپنی خوبصورت، وسیع اور شاندار کوٹھی کے
سائباں میں محو خواب تھے۔ میونسپلٹی کی ممبری کے لئے الکشن لڑنا آپ کا محبوب مشغلہ تھا
اور اس مشغلہ پر کثیر رقم صرف کرتے تھے۔ عمر بھر کنوارے رہے آپ کے دوسرے بھائی
فدا حسین خاں صاحب نے ترک سکونت کر کے ریاست حیدرآباد میں توطن اختیار کر لیا
تھا۔ بوقت رحلت عمر تقریباً ساٹھ سال تھی۔ ذخیرہ کلام کل کا کل تلف ہو گیا۔

چشمِ جاناں سے تصور میں دل زار ملا
آپ فرماتے ہیں عشاق بہت سے دیکھے
خوب دل کھول کے بیمار سے بیمار ملا
یہ تو کہیے کوئی ہم سا بھی وفادار ملا

ہم فقیروں کو نہیں نل ہا سے مطلب پڑبے یار کا جب سایہ دیوار ملا

عالم کو فراموش کیا یاد میں جس کی بھولے سے بھی لیتا نہیں وہ نام ہمارا

پوچھتے کیا ہو ماجراے فراق ہونہ دشمن بھی مبتلاے فراق

ہو گیا ہنگامہ محشر پیا چال یہ ائے ماہ روا چھی نہیں

جل گیا طور ہوئے حضرت موسیٰ بے ہوش تو ہی اے برق بتادے یہ شرکس کا ہے

ان منتوں پہ بھی وہی عادت جفا کی ہے ظالم ترے مزاج میں صد کس بلا کی ہے
غنچے چمن میں دیکھ کے بلبل کو ہنس پڑے اس میں بھی دل لگی کوئی باد صبا کی ہے

حاجی محمد عتیق اللہ خاں - آذر

الحاج عتیق اللہ خاں آذر خلف جناب رفعت اللہ خاں ساکن محلہ تارین ٹکلی کی ولادت ۱۸ جولائی ۱۸۹۹ء کو ہوئی۔ آپ کے جد امجد دریا خاں باڈوزئی تاجک تھے اور نانیہالی خاندان دیوان داد خاں مہندزئی ازبک سے جا ملتی ہے۔ ابتدائی تعلیم حسب رواج قدیم گھر میں ہوئی اردو فارسی سے واقفیت حاصل کر کے شملہ میں مزید اکتساب علم کیا۔ بچپن سے شوق شاعری پیدا ہو گیا تھا۔ شہر کے ممتاز شاعر و استاد وقت حضرت اصغر علی خاں اصغر سے مشورہ سخن کیا۔ نمونہ کلام ذیل میں درج ہے

دفور غم سے سب روئیں گے تجھ کو ڈوبنے والے صدائے نالہ برسوں آئے گی بسہاے سال سے
بٹادے سرحد ادراک سے جوش جنوں مجھ کو لپٹ جاؤں میں شوق قتل میں شمشیر قاتل سے
مرا حال زبوں پہنچا ہے شاید آخری حد تک صدائے آہ آج آتی نہیں سوئے ہوئے دل سے

رحمت سے تیری کم ہیں ابھی تک مرے گناہ پوری ہو یہ کبھی تو مکمل حساب ہو

بے اثر ہے آہ، بلبلس ہم نے یہ مانا مگر زرد کیوں اسے باغباں پھولوں کی رنگت ہوگئی

مولوی سید شرف الدین میاں یاس

مولوی شرف الدین میاں یاس کے والد ماجد سید حافظ نظام الدین میاں ریاست ٹونک میں ملازم تھے اور دادا سید عبدالرزاق کی کسرال بھی ٹونک میں تھی۔ حضرت یاس ٹونک میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد حروف و نحو، فقہ و حدیث کا علم مولوی امام الدین سے حاصل کیا۔ منشی فاضل کا امتحان ۱۹۰۶ء میں پاس کیا اور فارسی کی تکمیل مولوی حکیم سعید احمد ساکن ٹونک سے کی۔ بزمانہ ترک موالات اسلامیہ اسکول اٹاواہ میں فارسی کے مدرس تھے کچھ مدت بعد اٹاواہ سے دہلی کے جامعہ ملیہ چلے گئے اور وہاں پروفیسر ہو گئے۔ آپ کو شعر و شاعری کا شوق بھی تھا اردو میں یاس اور فارسی میں افسحی تلخیص فرماتے تھے۔ آپ کا ایک اردو کا دیوان جس کا نام 'تسخیر یاس' تھا مرتب ہو چکا تھا۔ آپ کی تصانیف سے ایک کتاب فن شعر میں ۱۳۳۲ھ میں یاس عظیم آبادی کے 'چراغ سخن' کے مقابلے میں لکھی گئی جس کا تاریخی نام ترازوئے سخن رکھا۔ آپ حضرت ظہیر دہلوی کے شاگرد تھے۔ شعرا سے بالکمال آپ کے مضمون آفرینی بلند خیالی اور مذاق سلیم کے مداح تھے۔ آپ نہایت پاکیزہ طبیعت، خوش اخلاق اور دیندار بزرگ تھے۔ چونکہ آپ کا اصل وطن شاہجہانپور تھا اس لئے تذکرہ میں آپ کو شامل کیا ورنہ آپ کی تمام عمر شاہجہانپور کے باہر گزری۔ گاہے گاہے وطن بھی تشریف لاتے تھے آپ کے دوران قیام شعر و شاعری کی مجلسیں جگہ جگہ ہوتی رہتی تھیں۔ بیرونی مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے اور خوب خوب داد پاتے تھے۔ مولوی صبیح الدین میاں مولف تاریخ صبیح نے آپ کا کلام جس قدر تاریخ صبیح میں درج کیا ہے وہ حضرت یاس کی قادر الکلامی اور مضمون آفرینی کا آئینہ دار ہے۔ افسوس کہ ایسے شیریں کلام اور باکمال شاعر اپنے وطن سے دور رہے اور اہل وطن ان سے استفادہ نہ کر سکے۔

نمونہ کلام حضرت یاس

یہ خوب جانتا ہوں کہ تو بے وفا نہیں
کیا التفاتِ خاص کی اس میں ادا نہیں
تیری طرح خیال ترا بے وفا نہیں
سو خوبیاں ہیں تجھ میں اگر اک وفا نہیں
اب تک تو یامے غیر پر یہ سر جھکا نہیں

پاس وفائے غیر سے مجھ سے وفائے کی
میں اور شکوہ تیری جفا کا بجائے شکر
دل سے تری جفا کا ہے ہر وقت عذر خواہ
ہیں اک وفا کے ہونے سے مجھ میں ہزار عیب
یوں بھی سہی جو شان غیوری ہو مقتضی

تم نہ کو سو آپ کو ایسی ہنسی اچھی نہیں
صدقے عیش دو جہاں قربانِ عمر جاوداں

کوئی اچھی ہے گھڑی کوئی گھڑی اچھی نہیں
تیرے غم کے سامنے کوئی خوشی اچھی نہیں

کیوں شادماں نہ ہوں کہ نوید وصال ہے
دل محو یار دوست ہے لب صرف ذکر دوست
آپے سے کھو دیا مجھے یہ لطف ہے ترا
کیا دوں فریب آنکھ کو سمجھاؤں دل کو کیا
ہیں شوخیاں وہاں تو یہاں بیقراریاں
بے نقد داغِ عشق سے معمور گنجِ دل
غیرت نے اور سعی طلب کو بڑھا دیا

کہتے ہیں وہ کہ ہجر میں جینا محال ہے
خود رفتگیِ عجب ہے عجب حالِ حال ہے
میں تجھ میں مٹ گیا ہوں یہ میرا کمال ہے
تیری کوئی شبیہ نہ کوئی مثال ہے
جو ان کا حال ہے وہی میرا بھی حال ہے
تیرا فقیر، تیرے کرم سے نہال ہے
ظالم یہ کیوں کیا تیرا ملنا محال ہے

اے یاس آرزوئیں تو سب دے چکیں جواب
اب میں ہوں اور مراد دلِ حسرتِ مآل ہے

فقیر محمد خاں فقیر

آپ کے جد امجد نے شاہجہانپور آباد ہونے کے ابتدائی زمانہ میں آکر سکونت اختیار کی تھی۔ آپ کے والد کا نام غلام محمد خاں تھا قلعہ نیواب بہادر خاں کے جانب شمالی و مشرقی محلہ رنگ محلہ میں مکان تھا۔

صاحب تمول تھے مگر جائیداد و دولت اسراف بجا کی نذر ہو گئی آخری زمانہ زندگی مفلوک الحالی میں گزرا۔ شاعری سے شغف تھا منشی اسمعیل منیر کے شاگرد تھے۔ ایک دیوان اردو طبع ہو چکا تھا۔ آپ کی تصنیف میں دیوان کے علاوہ اندر سبھا اور ایک مثنوی تھی مگر ان میں سے کسی کا پتہ نہیں چلتا نہ دستیاب ہیں آپ نے عمر اچھی پائی تھی بعد عذر رحلت فرمائی۔

نمونہ کلام

غزل

سیح پھولوں کی سچی عیش کی نوبت آئی کیا دو لہن بن کے ترے وصل کی نوبت آئی
ہم بھی آئینہ ہیں تم صاف ہو جب تک ہم سے مہنہ نہ دیکھیں گے اگر دل میں کدورت آئی
روشنی کرتے ہو کیوں وہ تو سدھارے سرشام آگ کمرے میں لگا دو شب فرقت آئی
اے فقیر اس سے لڑی آنکھ خدا خیر کرے
جس کی آنکھوں میں نہ بھولے سے مروت آئی

مولوی حمید الزماں خاں صاحب۔ حمید

مولوی حمید الزماں صاحب استاد نظام دکن مولوی مسیح الزماں خاں کے منجھلے بیٹے تھے جو فی نفسہ ذی اخلاق متحمل اور متین انسان تھے۔ انگریزی میں انٹرنس پاس تھے فارسی میں پوری استعداد اور عربی میں فارغ التحصیل تھے۔ آپ کی عمر کا بیشتر حصہ حیدرآباد دکن میں گزرا۔ نہایت لائق اور قابل انسان ہونے کی سند ۸ صفر المظفر ۱۳۲۵ھ کو ان کے استاد جناب مولوی ابو نعیم میر عبد الکریم صاحب علوی ہزاروی نے جو ایک نہایت مقدس پرہیزگار جید عالم تھے عطا فرمائی تھی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بعد حمد و ثنا کے واضح ہو کہ دینی بھائی مولوی حمید الزماں خاں ابن مولانا یا مفضل مولوی مسیح الزماں خاں صاحب استاد نظام دکن بالقاہرہ نے مجھ سے اکثر کتب متعینہ درس سلسلہ نظامی نہایت تحقیق اور غایت تدقین سے پڑھی ہیں اور وہ جوان صالح ذکی ہیں، صاحب فہم ہیں اور رائے صمیم و عقل سلیم رکھتے ہیں جب وہ علم تفسیر و حدیث و فقہ و اصول و علم معانی و ادب و کلام اور ضروریات فلسفہ سے فارغ ہوئے تو مجھ سے انھوں نے ان علوم کی روایت کی اجازت طلب کی جیسا کہ میں اپنے اساتذہ کرام شیخ

محمد حسن دیوبندی درتیس الفلاسفہ مولانا عبدالحق خیر آبادی و صدر الفضلار فضل حق رامپوری وغیر ہم سے جن کا سلسلہ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی و حضرت شاہ اسماعیل صاحب تک پہنچتا ہے روایت کرتا ہوں اور میں نے ان کو اس بات کا اہل پایا تو میں نے ان کو اجازت دی اور میں ان کو تقویٰ ظاہری و باطنی کی وصیت کرتا ہوں اور اس بات کی ہدایت کرتا ہوں کہ وہ اپنے اساتذہ کو دعاؤں میں نہ بھولیں۔

مولوی حمید الزماں خاں کو آنریبل سی۔ اسٹوارٹ و سن کے سی آئی ای ڈاکٹر جنرل پوسٹ آفس انڈیا نے مولوی صاحب کے خیال سے بعہدہ سپرنٹنڈنٹ محکمہ پوسٹ آفس نامزد کیا تھا۔ مولوی حمید الزماں خاں صاحب کو شعر و شاعری سے بھی دلچسپی تھی اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر موزوں کرتے تھے فارسی کی طرف طبیعت زیادہ مائل تھی۔ ان کے فارسی اور اردو کے کچھ اشعار درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

اللاے بستہ در فتر اک زلف غیرت دلہا	نگر گزہ بجز بر عاشق چہ افتادست مشکہا
نخی یابم نشان لیلی خود و اے بر قسمت	بسے چوں قیس بر دیدم ز حسرت گردم لہا
چہ آفت یا الہی در پس دیوار او بارد	کہ ما صبح و مسابینیم ہر سورقص بسملہا
گئے در دیدہ، می آید گئے در دل کند جائے	بت ما را خداوند انمودی طرفہ منزلہا

حمید از وصل دلدار تو فردا میشود حاصل

چرا در فکر افروزی ذع الدنیاء او ہلہا

کون سی جا تھی جہاں جلوۂ دلدار نہ تھا	پر نہ سو جھا تجھے زاہد کہ تو میخوار نہ تھا
نگہ مست صنم کا یہ رہا ہے عالم	اٹھ گئی آنکھ تو کو سوں کوئی ہشیار نہ تھا
درد تھا ٹھیس تھی سوزش تھی تپس تھی دل میں	شب ہجراں میں فقط ایک ہی غمخوار نہ تھا
حسب پیمان ازل آئے مگر حشر کے دن	غدر تھا یہ کہ سنورتا تھا میں تیار نہ تھا
بار تھا خواب میں عشاق تھے یا امن و اماں	چشم بیمار تھی اور فتنہ بیدار نہ تھا

نردماں آہ رسا کی تھی میسر جو حمید

بام تک اس کے پہنچنا تجھے دشوار نہ تھا

آپ کی تصانیف سے ارمغان حمید۔ فغان حمید۔ سید سہیل۔ نثار زر برپائے پیغمبر اور مصلح الادب ہیں

شہید اشفاق اللہ خاں حسرت وارثی

سرخاک شہید سے برگہائے لالہ می پاشم

شہر شاہجہانپور کے وضع، شریف، نجیب الطرفین اور زمیندار خاندان کے سربراہ جناب شفیق اللہ خاں ساکن محلہ امین زئی کے نامور فرزند اشفاق اللہ خاں ۲۲ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو عدم سے وجود میں آئے۔ ابتدائی تعلیم حسب رواج قدیم گھر میں حاصل کی۔ قرآن کریم، اردو فارسی سے فراغت حاصل کیے دیگر مضامین کی تعلیم کے لئے مشن ہائی اسکول میں داخل ہو گئے۔ اسی ادارہ میں مشہور انقلابی رہنما جناب رام پرشاد بسمل بھی زیر تعلیم تھے۔ ہم خیالی نے رسمی تعلقات کو گہری محبت میں تبدیل کر دیا اور دونوں ایک جان و دو قالب کا نمونہ بن گئے غلامی سے نجات پانے کا خیال ذہن و دل کی گہرائیوں میں اتر کر بیچین کرنے لگا۔ اشفاق اللہ خاں انقلابی گروہ کے سرگرم ممبر بن گئے اور حکومت کے خلاف کارروائیوں میں اہم کردار ادا کرنے لگے۔ کارروائیوں کو عملی شکل دینے کے لئے بعض حالات میں روپیہ کی ضرورت بھی آپڑتی تھی۔ طے کیا گیا کہ حکومت کا خزانہ لوٹ کر ضرورتیں پوری کی جائیں۔ ۹ اگست ۱۹۲۵ء کو کوری اسٹیشن کے قریب ٹرین روک کر خزانہ لوٹ لیا گیا جس میں اشفاق اللہ خاں نے بہت اہم کام انجام دیا۔ اس واقعہ نے حکومت کو بوکھلا دیا اور مجرموں کی زور و شور سے تلاش کی جانے لگی۔ اشفاق اللہ خاں ایک عزیز قریب کی سازش سے دہلی میں گرفتار کر لئے گئے دو سال مقدمہ چلا اور ۱۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کو پھانسی پر لٹکا دیئے گئے۔

اشفاق اللہ خاں کا دل وطن کی محبت سے لبریز تھا اپنے جذبات کی ترجمانی کے لئے شاعری کو ذریعہ اظہار بنایا اور گا ہے گا ہے اشعار موزوں کرنے لگے۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ کس قدر کلام تھا مگر جو اشعار دستیاب ہو سکے وہ قارئین کی دلچسپی کے لئے پیش کر دیئے ہیں۔ ان اشعار سے شہید کی دلی کیفیات کا بخوبی جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ فنی اعتبار سے ان اشعار کو پرکھنے کے بجائے جذبات کو دیکھئے اور داد دیجئے۔

جسے فنا وہ سمجھ رہے ہیں بقا کا ہے راز اسی میں مصنفر
نہیں مٹائے سے مٹ سکیں گے وہ لاکھ ہم کو مٹا رہے ہیں

کہاں گیا کوہ نور میرا۔ کدھر گئی ہائے میری دولت
 وہ سب کاسب لوٹ کر کے الٹا ہم ہی کو ڈاکو بتا رہے ہیں
 خوش حسرت خموش حسرت اگر ہے جذبہ وطن کا دل میں
 سزا کو پہنچیں گے اپنی بے شک جو آج ہم کو پھنسا رہے ہیں
 پھانسی سے قبل جب اشفاق اللہ خاں سے آخری آرزو اور وصیت دریافت کی گئی تو اس وقت بھی آپ نے
 جس آرزو کا اظہار کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس قدر وطن کی محبت سے سرشار تھے اور خاک وطن
 سے کتنا پیار تھا۔

کچھ آرزو نہیں ہے۔ ہے آرزو تو یہ ہے لکھ دے کوئی ذرا سی خاک وطن کفن میں

بزدلوں کو ہی سدا موت سے ڈرتے دیکھا
 گو کہ سو بار انھیں روز ہی مرتے دیکھا
 موت گویا کو ہم نے نہیں ڈرتے دیکھا
 تختہ موت پہ بھی کھیل ہی کرتے دیکھا

موت کو جب ایک بار آنے ہے تو ڈرنا کیا ہے
 ہم سدا کھیل ہی سمجھا کئے ڈرنا کیا ہے

یہاں رہتا ہے مایوس نہ ہو حسرت
 کب تک نہ خبر لیں گے یاران وطن میری

وہ جرم آرزو پہ جس قدر چاہیں سزا دے لیں
 یونہی لکھا تھا قسمت میں چمن پیرائے عالم نے
 مجھے خود خواہش تعزیر ہے ملزم ہوں اقراری
 کہ فصل گل میں گلشن چھوٹ کر ہے قید زنداں کی

جنون حب وطن کا مزہ شباب میں ہے
 وطن ہمیشہ رہے شاد کام اور آزاد
 لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے
 ہمارا کیا ہے اگر ہم رہے رہے نہ رہے

ایک آخری شعر اور ملاحظہ کیجئے۔

تنگ آگر ہم بھی ان کے ظلم سے بیداد سے
 چل دیئے غلہ عدم زندان فیض آباد سے

نواب نیاز الدین خاں نیاز

نواب نیاز الدین خاں کے والد ماجد کا نام نواب امتیاز الدین خاں تھا۔ یہ خاندان نواب غیرت خاں چغتایں نواب بہادر خاں چغتایں شاہجہانپور کی نسل سے براہ راست تعلق رکھتا ہے۔ نواب امتیاز الدین خاں کے والد نے بوجہ قرابت محلہ لکراکلاں میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ نواب نیاز الدین خاں نہایت بااخلاق سنجیدہ اور خوش اطوار تھے۔ علمی و ادبی مذاق رکھتے تھے شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا تو ابوالعجاز منشی احسان علی خاں احسان کے شاگردوں میں شامل ہو گئے۔ آپ نے اپنا دیوان مرتب کر لیا تھا مگر اب اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ یہ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ آپ کی ولادت کب ہوئی اور کس سن میں انتقال ہوا مگر اتنا کہا جاسکتا ہے کہ وہ ۱۹۳۰ء کے بعد اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو سدھارے کثیر الاولاد تھے لیکن اولاد سے آرام نہیں پہنچا۔ آپ نے اپنے استاد احسان صاحب کو تاریخ شاہجہانپور تیار کرنے میں بہت مدد دی تھی اور ڈپٹی مطبع اللہ خاں صاحب کو بھی جو کچھ سرمایہ معلومات آپ کی تحویل میں تھا بغرض تیاری تاریخ شاہجہانپور عنایت کر دیا تھا مگر بد قسمتی سے ہر دو تاریخ مطبع نہ ہو سکیں۔ مولوی صبیح الدین میاں نے تاریخ صبیح لکھنے میں آپ کا تعاون حاصل کیا اور بچا ہوا جس قدر سرمایہ معلومات تھا وہ نواب صاحب نے پیش کر دیا۔

نمونہ کلام نواب نیاز الدین خاں نیاز

بہت مدت سے پیاسا تھا تمگر خون بسمل کا
عبث پانی میں پھرتا ہے کٹورہ ماہ کامل کا
بنایا کوزہ گرنے جب کبھی ساغر مرے رگل کا

ہوا سیراب خنجر ذبح کر کے مجھ کو قاتل کا
پتہ دزدنگہ کا چل نہیں سکتا ہے اے گردوں
وہ مینوش شکستہ دل ہوں ٹکڑے ہو گئے لاکھوں

نہ ہوں تا حشر یارب زخمی تیغ دودم اچھے
تھاری ہر جفا اچھی تمھارے سب ستم اچھے

قلق اچھا تپش اچھی جفا اچھی ستم اچھے
ستائے جاؤ تم مجھ کو کہ میں اس پر بھی راضی ہوں

نیاز خستہ خاطر یہ دعا ہر وقت کرتا ہے
 نہوں تا حشر یارب اس کے داغ سوزِ غم اچھے

رہتا ہے نیازِ نامِ باقی۔ تصنیف بھی عمر جاوداں ہے۔

شیر محمد خاں شفق

شیر محمد خاں شفق خلیف جناب فیض محمد خاں جنوری ۱۹۰۷ء میں شاہجہانپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد مدرسہ بحر العلوم میں کچھ مدت اکتساب علم کیا۔ انگریزی اسکول میں درجہ نو تک تعلیم حاصل کر کے جونا گڑھ چلے گئے جہاں ریاستی فوجی دستے میں دفعتاً رتک پہنچ کر ۱۹۴۶ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ شاہجہانپور میں قیام کیا مگر معاشی حالات نے چین سے بیٹھنے نہ دیا کانپور چلے گئے۔ ایک کارخانے میں ملازمت کر لی۔ ۲۳ جنوری ۱۹۶۵ء میں مرض کینسر میں مبتلا ہو کر لاہی ملک بقا ہوئے۔ زندگی کے آخری ایام انتہائی کرب و اذیت میں گزارے۔ اولاد موجود ہے۔

حضرت شفق کو شعر و شاعری کا شوق ابتدائے عمر سے تھا۔ جونا گڑھ میں حضرت کامل جونا گڑھی اور شاہجہانپور میں حضرت دل۔ حضرت عابد اور حضرت اصغر سے مشورہ سخن لیا۔
 نمونہ کلام:

میرے سجدوں کی اب انتہا ہو گئی بے خودی حیرت نقش پا ہو گئی
 لے لیا بڑھ کے رحمت نے آغوش میں میں نے اتنا کہا تھا خطا ہو گئی

ملتا ہے نگاہوں سے خاموش پیام اکثر مبہم سے اشاروں میں ہوتا ہے کلام اکثر
 میں نے ہی شفق بخشی ہر پھول کو رعنائی میں نے ہی سنوارا ہے گلشن کا نظام اکثر

قطعہ

دور جام شراب دیکھا ہے رقص میں آفتاب دیکھا ہے
 پنی رہے تھے جناب واعظ بھی اک نیا انقلاب دیکھا ہے

محمد اللہ خاں - عشق

باپ کا نام سیف اللہ خاں اور محلہ تارین جلال نگر میں رہتے تھے۔ استعداد علمی معمولی تھی۔ پہلے شیخ کریم بخش فرقت بعدہ منشی احسان علی خاں احسان سے مشورہ سخن لیا۔ خاندانی زمیندار تھے مگر بوجہ نا اتفاقی ہمیشہ پریشانیوں میں مبتلا رہے۔ اپنے والد سے الگ رہ کر زندگی گزارا اور ملمع سازی کے کاروبار سے شکم پُری کرتے تھے مگر مرنے سے قبل یہ کاروبار بھی ختم ہو گیا تو سیتا پور چلے گئے۔ عین جوانی میں مبتلا رہے ہیضہ ہو کر ۴ جولائی ۱۹۱۱ء کو وہیں رحلت فرمائی۔

نمونہ کلام

رگ گئی چل کر گلوئے زار پر ناز تھا تم کو اسی تلوار پر
کچھ تو بولے کچھ تو دلداری کرے تیری خاموشی مرے اظہار پر
کس طرح اچھا نہ ہو گا یہ مریض ہاتھ رکھو تو دل بیمار پر

تو نہ لپٹا مری گردن سے مگر اے قاتل دم آخر ترے خنجر کو محبت آئی

بیخود کیا پہلے تو مجھے ناز و ادا نے پھر چھین لئے ہوش بت ہوش رہا نے

افت یار میں دنیا سے قصا کرتے ہیں آج ہم حق محبت کو ادا کرتے ہیں
نہ سہی خیر طلب۔ کوسنے والے بھی سہی کچھ تو ناصح وہ مرے حق میں کہا کرتے ہیں

تم جس کو سن کے خوش ہو کہوں میں وہ حال کیا تم جس کا دو جواب کروں وہ سوال کیا
مانند زلف یار پریشاں ہے دل مرا آشفہ ہو گا اور یہ آشفہ حال کیا

غرق خوں ہونے کی مرے دل کو بھی حسرت ہوئی ہاتھ میں اس شوخ کے رنگ خا کو دیکھ کر
بار زلفوں کا اٹھایا جب لچک کر یار نے ناز کی شرما گئی ناز و ادا کو دیکھ کر

محمد مقبول حسن خاں شیدا

نٹھو خاں زمیندار نگر یا کے پوتے اور محمد حسن خاں کے بیٹے تھے۔ آبائی مکان محلہ خلیل شہر تھی ہیں تھا۔ فارسی اور عربی مولوی احمد خاں سے جو چھوٹے ولایتی کے نام سے مشہور تھے پڑھی تھی۔ باپ کا انتقال دادا کی زندگی میں ہو جانے سے شرعی متروکہ نہیں ملا لیکن ان کے چچا احمد حسن خاں نے مدد معاش کے طور پر ایک موضع عنایت کر دیا تھا۔ مقبول حسین خاں رئیس زادے تھے طبیعت میں بہان نوازی اور اجاب پرستی بہت تھی خرچ بھی امیرانہ تھا۔ بہت جلد مقروض ہو گئے۔ موضع قرصے میں جاتا رہا چچا نے پھر کچھ زمینداری خرچے کے لئے دیدی وہ بھی قرصے میں چلی گئی زیادہ ایام مصیبت کے نہیں جھیلے تھے کہ اراکتوبر ۱۹ء کو پیام قضا آگیا۔ تحصیل علم کے بعد شاعری کا شوق ہوا یہ زمانہ ۱۸۷۸ء کا تھا شاہجہانپور میں جا بجا مشاعرے ہوتے تھے اور شعر گوئی کا بہت چرچا تھا۔ مرحوم نے شیدا اخلص اختیار کیا اور حضرت احسان کے شاگرد ہو گئے۔ طبیعت رسالتی شعر بامعنی اور صاف کہتے تھے۔ شہر کے مشاعروں میں جانا پسند نہیں تھا۔ ہر پندرہویں اپنے گھر پر مشاعرہ کرتے شہر کے تمام شاعر جمع ہوتے تھے مگر سوائے مشاعرہ مقبول حسن خاں کے یہ عزت کسی اور مشاعرے کو نصیب نہیں ہوتی کہ اس میں لکھنؤ کے منتخب اور نامور اساتذہ بھی شریک ہوئے ہوں۔ نمونہ کلام۔

دل جو سودا زدہ گیسوئے جاناں ہوگا حال مانند صبا میرا پریشاں ہوگا
صدمہ ہجر اٹھانے کی نہیں تاب مجھے تم مرے گھر جو چلے آؤ گے احساں ہوگا

جب میں نے کہا عشق کا صدمہ نہیں اچھا بولے بہت اچھا نہیں اچھا نہیں اچھا
وہ وصل کا طالب ہے زمانے سے برا ہے سچ کہتے ہو سب اچھے ہیں شیدا نہیں اچھا

دیوانہ کر گئی جو کسی کی نظر مجھے ملتی نہیں تلاش سے اپنی خبر مجھے

سر بزم وہ پھیر لیتے ہیں آنکھیں نہیں ان کو شیدا مروت کسی کی

منشی محمد آل نبی خاں - ارمان

منشی محمد آل نبی ارمان کے اجداد کا وطن بریلی تھا دادا قاسم علی صاحب ۱۸۵۶ء کے بعد شاہجہانپور وارد ہوئے اور توطن اختیار کر لیا۔ آپ کے والد منشی احسان علی خاں۔ احسان شاہجہانپور میں پیدا ہوئے اور پرورش پائی۔ منشی احسان جلال لکھنوی کے شاگرد تھے۔ شاہجہانپور اور بیرون شاہجہانپور میں احسان صاحب کے کثیر شاگرد تھے۔ منشی آل نبی ارمان نے اپنے والد سے اکتساب علم کیا اور مدارس میں بھی تعلیم پائی۔ شاعری کا شوق ورثہ میں ملا تھا۔ والد ہی سے مشورہ سخن فرماتے تھے۔ نمونہ کلام جو ۱۸۹۶ء کے گلہ سہ 'ارمغان' سے نقل کیا گیا ہے۔

موردِ رنج و بلا ہر دم رہے عاشقی میں خاک اچھتے ہم رہے
ہم تری الفت میں ہیں ثابت قدم اشک کی مانند گرجم رہے
تنگنہ میں اب نہیں ہے وہ ہجوم، کیا تمہارے مرنے والے کم رہے
چل رہی ہے مئے چمن میں لے فلک بارش ابرسیہ پیہم رہے
دل میں رہنے دیجئے ارمان کو
کیا ضرورت ہے عدو کا غم ہے

منشی نیاز حسن خاں صاحب بیدل

منشی نیاز حسن خاں صاحب بیدل شاہجہانپوری حضرت احسان علی خاں صاحب احسان اڈیٹر ارمغان کے شاگرد تھے۔ یہ پرچہ انیسویں صدی کے اواخر میں شاہجہانپور سے نکلا کرتا تھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت بیدل یہاں کے قدیم باشندہ تھے۔ باقی حالات کا علم نہیں ہے۔ نمونہ کلام تحریر کیا جاتا ہے۔

فرقت میں غم گسار حسینوں کا غم ہوا باعث یہ تھا جو درد مرے دل کا کم ہوا
ساقی بغیر وہ مرے دل کو الم ہوا آخر شراب ناب کا پینا قسم ہوا
قاصد سے پوچھتے ہیں وہ شوق وصال پر کس طرح اس سے خط میں یہ مضمون رقم ہوا

پھرتے ہی پھرتے گر پڑے سجد کے واسطے
 بیتاب کر کے چھوڑ گئے قید کی نگاہ
 چھ کو نہ آئی آگئی ناحق رقیب کو
 چکر تھارے قصر کا طوف حرم ہوا
 آنکھیں پھرا لیں یار نے یہ کیا ستم ہوا
 اس کا مجھے الم ہے کہ تم کو الم ہوا
 حوریں ہی حوریں دیکھ رہا ہوں میں ہر طرف
 بیدل جہان ہی مجھے باغ ارم ہوا

لالہ منوں لالہ - روشن

لالہ منوں لالہ روشن صاحب شاہجہاںپور کے قدیم باشندہ تھے۔ آپ کا شمار مشرق اور روس کے شہر میں تھا اور دو فارسی کی استعداد اچھی تھی۔ حضرت احسان علی خاں صاحب احسان شاہجہاںپوری کے شاگرد تھے۔ نمونہ کلام رسالہ 'جلوہ یار' بابت ماہ دسمبر ۱۹۰۹ء سے نقل کیا جاتا ہے جلوہ یار میرٹھ سے شائع ہوتا تھا اور اس کے مالک و مہتمم جناب شریف خاں آزاد تھے۔

خانہ دل مرا متارھا اکثر بن کر
 کار فرمائے نگہ ناوک و خنجر بن کر
 لذت وصل ہوئی خاک کو حاصل پس مرگ
 دل لیا دین لیا جان لی ایمان لیا
 ہر گھڑی دل کی تڑپ رکھتی ہے بچپن ہمیں
 سخت جانی کو مری آپ بڑا کہتے ہیں
 خون ناحق کی شہادت یہی دے گا دم قتل
 کیا غضب ہے کہ جوانی میں بنا تو سفاک
 ہم کو اتنا تو بتائے فلک خانہ خراب
 یوں نہ بگڑا کرے اللہ کوئی گھر بن کر
 قتل عالم کو کریں گے وہ ستمگر بن کر
 بوسے لیتا ہوں لب یار کے ساغر بن کر
 خوب لوٹا ہے مجھے آپ نے دلبر بن کر
 کس مصیبت میں پھنسنے عاشق مضطر بن کر
 تیز خنجر کو کرے گی یہی پتھر بن کر
 رہ گیا خون مرا تیغ میں جو ہر بن کر
 کاٹ کرنے لگی ابرو تری خنجر بن کر
 کام عاشق کے بگڑ جاتے ہیں کیوں کر بن کر

کیا کریں کس سے کہیں دل کی مصیبت روشن
 خوب بدنام ہوئے عاشق مضطر بن کر

منشی منٹی لال - درس

منشی منٹی لال صاحب درس رئیس شہر اور ایک بڑے ٹھیکیدار تھے۔ شہر شاہجہانپور کے قدیمی باشندہ تھے اور آپ کا شمار معززین میں ہوتا تھا۔ اردو فارسی کے علاوہ ہندی۔ سنسکرت اور زبان انگریزی سے بھی بقدر ضرورت واقف تھے۔ ادائل عمری سے شعر و شاعری کا طبیعت میں مذاق تھا ابوالعجاز منشی احسان علی خاں احسان کے تلامذہ میں شامل تھے۔ آپ کا کلام بطور نمونہ 'جلوہ یار' میرٹھ بابت ماہ فروری ۱۹۱۷ء سے منقول ہے۔

چمپا میں موتے میں جوہی میں یا من میں	جلوہ ہے اس کا روشن دنیا کی انجمن میں
انکار کرنے زاہد جام شراب پی لے	چلتا ہے دور وحدت ساقی کی انجمن میں
غافل نہ آتا سمجھے کہتا ہے کون انا الحق	گویا زباں ہے کس کی منصور کے دہن میں
سینے میں میرے دل نے سوچ و تاب کھائے	بل پڑ گئے جو اس کے گیسو سے پرشکن میں
دونوں سمجھ رہے ہیں جب ایک ذات تیری	جھگڑا پڑا ہوا ہے کیوں شیخ و برہمن میں
فرش زمیں پہ تانا گردوں کا شاہیانہ	تجھ سا نہیں ہے کوئی بے مثل اپنے فن میں

کب اس کی قدرتوں میں دم مارنے کی جا ہے
اے درس تو زباں کو خاموش کر دہن میں

پروفیسر عبدالسمیع خاں نکہت

شاہجہانپور کی مایہ ناز علمی و ادبی شخصیت پروفیسر عبدالسمیع خاں نکہت ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے والد محترم کا نام الحاج مولوی عبدالقادر خاں تھا جو ایک عرصے تک مدرسہ عربیہ عین العلم کے مہتمم رہے۔ مورث اعلیٰ الحاج سید محمد وحدت خاں متانی، سادات اقا غنہ کے ممتاز بزرگ خواجہ سید محمد متان سے نلامر بوط تھے۔ متانی قبیلے کے افراد بانی شہر شاہجہانپور نواب بہادر خاں چغتاکے ہمراہ شاہجہانپور آئے اور پہلی سکونت اختیار کی۔ مغلوں کی سلطنت نے خوانین کو محبوب سمجھا اس لئے الحاج سید محمد وحدت کی نسلیں بھی خان سے ملقب ہوئیں۔

پروفیسر عبدالسمیع خاں نکہت کی ابتدائی تعلیم مدرسہ عربیہ عین العلم میں ہوئی۔ یہیں سے آپ نے ۱۷-۱۸ سال کی عمر میں درس نظامی کی تکمیل کی۔ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹۵۳ء میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۴۶ء تک شعبہ لسانیات شرقی و اسلامی کلچر انجمن اسلام بمبئی کے صدر رہے۔ خرابی صحت کی بنا پر بمبئی کو خیرباد کہا اور ۱۹۴۷ء میں جی ایف کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۵ء سے جی ایف کالج کے صدر شعبہ فارسی و اردو کے عہدے پر فائز ہوئے اور ۱۹۶۷ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ۲ اپریل ۱۹۸۳ء کو اس عالم فانی سے علی گڑھ میں رحلت فرمائی اور شاہجہانپور میں سپرد خاک کئے گئے۔ ان کی ساری زندگی علمی و ادبی شغف میں گزری۔ انھیں اردو، عربی، فارسی اور انگریزی پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ شاعری کے علاوہ اسلامیات پر متعدد تحقیقی کتابیں لکھیں جن میں قرآن کی تفسیر بصائر القرآن، ابن خلدون کی عظمت اور معراج ناما، خاص طور پر قابل ذکر ہیں ان کی تصانیف کی تعداد تقریباً ۲۸ ہے۔ فارسی کلام "چمنستان فارسی" کے نام سے شائع ہوا۔ اردو اشعار و قطعات "خضر حیات" کے نام سے منظر عام پر آئے مرحوم کا کلام یا مقصد شاعری کی مثال ہے جو زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تنقیدی نقطہ نگاہ کا حامل ہے۔ اس میں عارفانہ، فقیہانہ، حکیمانہ اور مصلحانہ طنز کا انداز ملتا ہے۔ اشعار زیادہ تر قطعات کی شکل میں ہیں۔ ڈاکٹر قمر رئیس، مرحوم عصمت اللہ خاں (کراچی) اور متعدد دوسرے ادیبوں کو ان کی شاگردی کا شرف حاصل رہا ہے۔

نمونہ کلام از خضر حیات

بزم پسند نوجوانوں کے لئے

دنیا کی ظلمتوں میں برق و شرار بن جا

ویرانہ و چمن میں ابر بہار بن جا

یہ سادہ لوح فطرت پیغام دے رہی ہے

رنگینیوں سے اپنی نقش و نگار بن جا

وقت کی نیرنگیاں سمجھنے کے لئے

وقت کی رفتار ہے شمیر سے بھی تیز تر

دور ماضی پر جو سوچا، دور مستقبل گیا

پتیاں شیرازہ گل کی ادھر برہم ہوئیں
اس طرف اک لالہ زار حسن و مستی کھل گیا

اہل شاہجہاں پور کے مسلم طبقے کے لئے

آج کا شاہجہاں پور ہے واللہ عجیب
شیخ و سید ہوں کہ افغان کی نسلوں کے نقیب
استیاز حق و باطل سے کہاں تک اعراض
اب تو احساس کی ٹمٹیں بھی ہیں بجھنے کے قریب

کج رفتار زمانہ سمجھنے کے لئے۔

ہر گوشہ چمن ہمہ تن شور و شر ہے آج
ہر رشتہ امید قریب نظر ہے آج
اے منزل حیات کے رہو سنبھل کے چل
ہر کام رہ گزار مہبت پر خط ہے آج

سنگ دل محبوبہ

کسی کے خرمین امید پر بجلی گر ادینا
کسی بیکس کی دنیا کو بنا کر یوں مٹا دینا
کسی بیکس کو تڑپانا و فاداری کے پردے میں
دل پر شوق کو وہ درہ کے جھوٹا سرا دینا
گل ارماں بن کر نامراد آرزو رکھنا
بہار جانفرا میں زہر کے ساغر پلا دینا
کبھی جذبات رنگیں سے سرور زندگی بننا
کبھی بڑھتی ہوئی پنکیں محبت کی گھٹا دینا

بتاؤ تو کہ یہ انداز تم نے کس سے سیکھے ہیں

مسیحا بن کے بیماروں کو پیغام قضا دینا!

حضرت مولانا ابوالوفا عارف

حضرت مولانا ابوالوفا عارف ابن مولوی حکیم محمد حسین صاحب ۱۹۱۰ء میں اپنے آبائی وطن قصبہ لہر پور ضلع سیتاپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حسب رواج گھر میں حاصل کر کے مقامی مدرسہ میں داخل ہوئے اور کچھ مدت بعد دارالعلوم دیوبند جا کر اکتساب علم کیا۔ آپ نے بعد فراغت تعلیم قصبہ لہر پور کی سکونت ترک کر کے شاہجہانپور میں توطن اختیار کر لیا اور اسی شہر کے مستقل شہری بن گئے اور یہیں اپنے ۶ فروری ۱۹۸۰ء کو رحلت فرمائی۔ حضرت مولانا ابوالوفا فاضل علوم دین تھے خاص طور پر حضور اکرمؐ کی سیرت پاک کے ہر گوشہ پر گہری نظر تھی۔ آپ حضورؐ کی زندگی کے جس پہلو پر تقریر فرماتے سیر حاصل تقریر فرماتے برصغیر ہندوپاک میں آپ سے بہتر سیرت نبوی اس قدر گہرائی سے جاننے والے علمائے دین کم ہیں۔ آپ عاشق رسول تھے اور اسی عشق رسول نے آپ کو نعت گوئی کی طرف مائل کیا۔ آپ نے نعت گوئی میں اہم مقام حاصل کر لیا تھا۔ گاہے گاہے غزل بھی موزوں فرماتے تھے مگر غزل میں بھی ایک ایک شعر نعت کا رنگ اختیار کر لیتا تھا۔ حضرت مولانا کی تصنیف میں علم دین پر بہت سی کتابیں۔ 'بادہ عرفاں' آپ کی نعتوں کا انتخاب ہے جس میں چند غزلیں بھی شامل ہیں۔ اس انتخاب کو جناب محمد احمد موآئی اور جناب شمس الضحیٰ صدیقی خلیلی فیض آبادی نے ترتیب دیا ہے۔ اگر یہ انتخاب کلام ترتیب نہ دیا جاتا تو صاحبان ذوق ابوالبیان حضرت مولانا ابوالوفا عارف کی ادبی زندگی اور شاعرانہ جوہروں اور صلاحیتوں سے بے خبر رہتے۔ نعت گوئی میں جس قدر بلند آپ کامرتبہ ہے غزل گوئی میں بھی اسی قدر بلند ہے بطور نمونہ آپ کا کلام درج ذیل کیا جاتا ہے تاکہ قارئین اس عالم دین کی شاعرانہ قوتوں کا اندازہ کر سکیں

قطعہ

جہاں بینی بھی آتی ہے جہاں بانی بھی آتی ہے
ہر اسان ہونے والے پست ہمت اور ہی ہوں گے
ہمیں ان سنگ پاروں پر گل افشانی بھی آتی ہے
جواں ہمت ہیں ہم کو خندہ پیشانی بھی آتی ہے

قطعہ

یہ کیا جانیں نواہکے نئے و بربط کے مستانے
تہی دستوں کی ہستی میں سکوں دل کے مسائل ہیں
کہ تلواروں کی جھنکاروں پہ سردھنتے ہیں دیوانے
بسادیے تھے جواڑھی ہوتی روجوں کے ویرلے

ہم نے سینچا ہے اپنے خوں سے چمن نیت باغباں درست نہیں
پتہ پتہ سے آشکارا ہے ورنہ گلشن پہ حق ہمارا ہے

سازدل پہ نعمتِ نعتِ پیمبر گائے جا
عشق کے آتش کدے کو اور بھی گرمائے جا
تجھ کو گزرتی ہے ڈالی بارگاہِ نور میں
لوگوں نے ناسفہ چشمِ خونچکاں برسائے جا
ہجر کی تاریک راتیں اس پہ غم کی گھٹا
اپنی کرنوں سے اسے ماہِ مہین چمکائے جا
جانے والے جاچکے طیبہ کو ہم دیکھا کئے
انے خوشا ذوق طلب تڑپائے جا تڑپائے جا
وائے ناکامی الجھ کر رہ گئے تار حیات
سبز گنبد کے مکین سلجھائے جا سلجھائے جا
تیرادل اور ان کا غم یہ بھی تو ہے ان کا کرم
ہو مبارک تجھ کو عارف شوق سے غم کھائے جا

غزل

جنہیں ازل سے محبت کی روشنی نہ ملی
پہنچ کے چاند پہ بھی ان کو چاندنی نہ ملی
وہ بد نصیب جو محروم سوزِ عشق رہا
خدا گواہ اسے حق سے آگہی نہ ملی
جو راہِ عشق میں جان دے نہ سکے
فریبِ زلیست ملا ان کو زندگی نہ ملی
جنوں کو چھوڑ خرد کی رہبری میں چلے
بھٹکتے ہی رہے منزل کی راہ بھی نہ ملی
یہ فصلِ گل یہ چمن یہ خزاں بد و خوش بہار
کوئی کلی بھی چمن کی مجھے کھلی نہ ملی
الجھ کے رہ گئے دیر و حرم میں وہ جن کو
طریقِ عشق میں عارف کی رہبری نہ ملی

ابو ابیان حضرت مولانا ابوالوفا عارف علمائے دیوبند میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے اور مولانا انور شاہ کشمیری کے تلامذہ ارشد میں شمار ہوتے تھے۔ آپ ایک بلند رتبہ عالم دین۔ مجاہد آزادی اور جادو بیان خطیب تھے۔ ایک وضع دار۔ صاحبِ اخلاق اور مرخان مرنج انسان تھے۔ آپ کو تحریر و تقریر میں دسترس حاصل تھی۔ حضرت ابوالوفا عارف کو ممکن ہے لوگ بحیثیت نعت گو اور غزل گو بھلا دیں مگر ان کی مذہبی، تعلیمی اور سیاسی خدمات کو فراموش کر دینا آسان نہیں۔ افسوس کہ ان کی موجودہ نسل میں کوئی بھی ان خوبیوں کا حامل نہیں ہے۔ شاہِ بھانپور ہمیشہ سے علما و فضلا کا مرکز رہا لیکن اب وہ عالم ہے کہ کسی عالم و فاضل کی صورت بھی نظر نہیں آتی۔ جو دو

ایک علماء حیات ہیں ان کے رخصت ہونے کے بعد ہر طرف تاریکی نظر آئے گی۔ جائے عبرت ہے

حضرت علامہ اختر علی تلہری

حضرت علامہ کے اجداد دور مغلیہ میں گاسناڈ اسنا سے ہجرت کر کے تلہری آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ آپ کے اجداد کو جو جاگیریں سلاطین مغلیہ نے عطا کی تھیں وہ باغیوں کی اعانت کی پاداش میں ۱۸۵۶ء کے زمانہ غدر میں ضبط کر لی گئیں تھیں۔ علامہ تلہری کے والد ماجد کا نام سید اکبر علی تھا جو ریاست رام نگر کے منبر تھے۔ سید اکبر علی نے دو شادیاں کی تھیں۔ دونوں ازواج قصبہ شاہ آباد ضلع ہردوئی کی تھیں۔ زوجہ اول سے تین اولادیں تو لد ہوئیں۔ علامہ سید اختر علی کی ولادت ۲۱ اپریل ۱۹۰۱ء کو قصبہ تلہری ہوئی۔ سید اکبر علی کا انتقال حضرت اختر علی کی اوائل عمری میں ہو گیا اور والدہ بھی بچپن میں چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ والدین کے انتقال کے بعد سید اختر علی کی پرورش ان کی پھوپھی خورشید بیگم نے کی۔ حضرت علامہ جب سن شعور کو پہنچے تو ان کے عم حقیقی سید اصغر علی ان کو اپنے ساتھ لے گئے۔ سید اصغر علی شاعر تھے اور اصغر تخلص فرماتے تھے۔ سید اصغر علی اپنے بھتیجے کو مجتہد بنانا چاہتے تھے اس لئے ابتدائی تعلیم حسب رواج عربی فارسی سے ہوئی اور ان کا داخلہ مدرسہ اسلامیہ عین العلم میں کرا دیا گیا۔ اساتذہ میں مولوی عبدالغنی سیال کوٹی اور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ تھے۔ بعد ان کا داخلہ مدرسہ عالیہ رام پور میں کرا دیا گیا وہاں مولانا فضل حق اور مولانا ظہور الحسن ظہور الملک سے اکتساب علم کیا۔ رام پور سے فراغت کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے عربی فارسی کی اعلیٰ اسناد حاصل کیں۔ آپ نے مولوی فاضل کا امتحان ۱۹۱۶ء میں پاس کیا تھا۔ منشی فاضل ۱۹۱۸ء میں پاس کیا۔ اسی کے ساتھ ہائی اسکول اور انٹر میڈیٹ کے امتحانات بھی پاس کر لئے۔ آپ ۱۹۱۹ء میں عربی فارسی کے استاد ہو کر گورنمنٹ ہائی اسکول للٹ پور تشریف لے گئے۔ ۱۹۲۰ء میں للٹ پور سے حمیر پور تبادلہ ہو گیا۔ چار سال بعد ۱۹۲۴ء میں جوہلی کالج لکھنؤ کے لئے تبادلہ کر دیا گیا جہاں اٹھارہ سال تک مسلسل طلباء کو درس دیتے رہے جوہلی کالج سے ۱۹۳۲ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول شاہجہانپور بھیج دیئے گئے۔ ۱۹۳۶ء میں کلکتہ وڈسٹرکٹ مجسٹریٹ شاہجہانپور نے آپ کو تدریسی خدمات کے صلہ میں ایوارڈ عطا کیا۔ شاہجہانپور گورنمنٹ ہائی اسکول سے آپ ۱۹۵۶ء میں ریٹائر ہو گئے۔

سکدوشی کے فوراً بعد ہی یو۔ پی کے وزیر اعلیٰ شری سیمور ناند کے زمانے میں جبکہ تاریخ آزادی ہند لکھی جا رہی تھی آپ کا تقرر بحیثیت پروفیسر ریسرچ اسسٹنٹ ہو گیا اور آپ مع اہل و عیال لکھنؤ منتقل ہو گئے۔ عارضہ چشم میں مبتلا ہو گئے اور مجبوراً تفویض کردہ خدمات سے دستبردار ہو کر لکھنؤ ہی میں مقیم رہے۔

حضرت علامہ تلہری نے دو شادیاں کی تھیں۔ زوجہ اول پھوپھی زاد بہن تھیں جن کے لطن سے تین اولادیں ہوئیں جن میں سے دو کا انتقال ہو گیا ایک دختر حیات ہیں۔ دوسری زوجہ امجد علی صاحب داروغہ کی دختر سے ہوئی جن کے لطن سے پانچ اولادیں تولد ہوئیں۔ تین اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ دو حیات ہیں۔ یہ دونوں برسر کار ہیں ایک فرزند ڈاکٹر سید آفتاب اختر صدر شعبہ اردو فارسی گاندھی فیض عام کالج شاہجہانپور ہیں اور دوسرے فرزند سہیل اختر میڈیکل سہیلتھ لکھنؤ میں ملازم ہیں۔

حضرت علامہ سدا نزلے کا شکر رہے ساتھ ہی کثرت کار کی وجہ سے دل و دماغ بھی ضعیف ہوتا گیا۔ ۱۹۶۷ء میں آپ پر پہلا قلبی دورہ پڑا جس کے بعد ایک ہاتھ اور ایک پیر سے مفلوج ہو گئے تھے۔ دوسرے سال ۱۹۶۷ء میں پھر قلبی دورہ پڑا جو مہلک ثابت ہوا اور باوجود ہزار سنی و کوشش جانبر نہ ہو سکے ۲۱ اپریل ۱۹۶۷ء کو صبح پانچ بج کر چالیس منٹ پر روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی حسب وصیت نعش وطن لائی گئی اور اپنے آبائی قبرستان ہمند گڑھی میں سپرد خاک کر دی گئی نماز جنازہ سنی و شیعہ دونوں طریقوں سے الگ الگ ادا کی گئی آپ کی میت کے ساتھ سوگواروں کی کثیر تعداد تھی۔ حضرت مولانا علامہ اختر تلہری کے تلامذہ میں جناب حیات اللہ انصاری۔ جناب عبادت بریلوی۔ جناب وقار عظیم۔ پروفیسر نور الحسن سابق وزیر تعلیم حکومت ہند۔ حضرت علی جواد زیدی۔ جناب خوشید حسن سابق ایڈیٹر نیا ڈور۔ ڈاکٹر قمر رئیس پروفیسر دہلی یونیورسٹی جناب حسن ظہیر وغیرہم علاوہ دیگر تلامذہ کے ہیں۔ حضرت مولانا کے مخصوص اجاب میں مولانا حامد حسین رام پور پروفیسر عبد السمیع خاں نکہت مرحوم شاہجہانپوری، سید علی عباس حسینی مرحوم۔ پروفیسر مسعود حسن ادیب مرحوم حکیم صاحب عالم۔ خواجہ اطہر حسین۔ سید علی حیدر کاظمی۔ جناب عندلیب شادانی حضرت اسعد شاہجہانپوری مرحوم حضرت دل شاہجہانپوری مرحوم۔ جناب عرش رام پوری مرحوم۔ جناب عبدالماجد دریا آبادی مرحوم۔ حضرت جوش ملیح آبادی مرحوم۔ جناب پروفیسر احتشام حسین مرحوم۔ خان بہادر فضل الرحمن خاں مرحوم شامل تھے۔ حضرت مولانا نے اپنی حیات میں بہت کچھ لکھا تھا تصانیف میں ابتداء سے عظیم شہادت عظمیٰ مذہبی تصورات۔ علوی

تصویرات۔ مولانا مودودی کا اسلامی نظریہ سیاست شعر و ادب۔ تنقیدی شعور۔ مقالات تلہری۔ رسول کی پاکدامنی خاص اہمیت کی حامل ہیں اس کے علاوہ محاسبے کے نام سے قومی آواز میں ایک سلسلہ جاری کیا تھا جس میں ادبی مباحث ہوا کرتے تھے لوگ مولانا کو ترقی پسند ادب کے خلاف سمجھتے تھے۔ پروفیسر ڈاکٹر قمر رئیس نے ایک بار مولانا کا انٹرویو لیا جس میں مولانا کے بارے میں قمر رئیس لکھتے ہیں "ان کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ وہ ترقی پسندی کے مخالف تھے لیکن یہ صحیح نہیں۔ وہ قدامت پسندی سے کوسوں دور تھے ادب، مذہب اور زندگی کے عام مسائل پر ایک واضح روشن اور ترقی پسند نقطہ نگاہ رکھتے تھے، ڈاکٹر قمر رئیس مزید لکھتے ہیں کہ مولانا کی شخصیت اور طبیعت میں عجیب سیما بی کیفیت تھی ہر گھڑی بیچین سے رہتے تھے ایک مفکرانہ نگاشتگی اور اور محویت ان پر طاری رہتی تھی۔"

علامہ اختر علی تلہری کے لاتعداد مضامین ملک کے بہت سے رسائل و جرائد میں بکھرے پڑے ہیں۔ بالتخصیص ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم پر مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا اور ان کے فلسفہ پر اہم مقالات قلمبند کئے تھے اس سے ان کے فکر کی گہرائی اور وسعت علمی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد مولانا کو ان کی زندگی نے پورے جوہر دکھانے کا موقع نہیں دیا اور نہ جس مرتبے کے وہ نکتہ رس ادیب و ماہر لغات تھے ہماری زبان کو ان کی ذات سے بہت فائدہ پہنچا۔ نثر نگاری کے علاوہ علامہ اختر علی تلہری کو شعر موزوں کرنے کا شوق بھی تھا۔ گاہے گاہے شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ زندگی میں جس قدر بھی کیا اگر ترتیب دے لیا جائے تو ایک دیوان تیار ہو سکتا ہے مولانا صاحب کے اشعار دیکھ کر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ شاعری کی طرف توجہ خاص مبذول فرماتے تو ہندو پاک کے صف اول کے اساتذہ میں شمار ہوتا۔ اشعار جو دستیاب ہو سکے بطور نمونہ تحریر کر دیئے ہیں۔

نمونہ کلام علامہ اختر تلہری

غزل

اب تو ہو شاد اے دل ناشاد	ضبط غم کی وہ دیر ہے ہیں داد
وہ نشیمن بھی ہو گیا برباد	جس کی خاطر ہمیں چمن تھا عزیز
چوم لے پہلے تیشہ فرباد	عشق کا نام پھر زباں پر لا
یوں نظر آ رہا ہوں میں آزاد	ہر نفس قید نو ہے میرے لئے

اخترِ نوحہ گر خبر ہے تجھے
کوئی سنتا نہیں یہاں فریاد

تو نہیں ہے تو بہار چمنستاں ہی سہی
میرے تاریک جہاں کو تو سنو نہ کیا
اہل دل کے لئے یہ بھی ہے مداوائے الم
دل تو گریاں ہے تباہی جہاں پر اپنا
میرے محبوب ترے حسن کا عنوان ہی سہی
آپ دنیا کے لئے نیتِ تاباں ہی سہی
مرہم زخم نہیں ہے تو نمکداں ہی سہی
یوں ترے سامنے اے دوستِ خنداں ہی سہی
یہ مرے ذہن کی شوریدہ مزاجی اختر
اپنے ہی رنگ میں رنگتا ہے وہ یزداں ہی سہی

جس کی طینت میں خمیر درد و غم شامل نہیں
بیگنا ہوں کا لہو ہے ان کے چہرے کی بہار
تو نہیں ہے محرم سوز و گداز اصل عشق
سحر و زنا میں الجھا ہوا ہے تیرا ذوق
سنگ خارا ہو مگر پہلو میں اس کے دل نہیں
یہ جمال لالہ و گل دید کے قابل نہیں
زندگی کا بوا لہوس تیری کوئی حاصل نہیں
تو ابھی انسانیت کے رنگ میں کامل نہیں
تجھ کو آیا ہی نہیں موجوں سے آویزش کا کھیل
تو ابھی اخترِ حریمِ عشرتِ حاصل نہیں
ذوق کی خواہی

قطعات

ہے تیرا ذوق ہی کچھ خام ورنہ اے ناداں
نہیں ضیا تجھے حاصل تو ہے قصورِ نظر
نہیں ہے شوقِ طلب کی فسردگی کا علاج
ہے تیرے بخت کا اک یہ بھی غمِ معصوم
بہشت گوش و نظر کا کہیں نہیں ساماں
ہیں مہر و مہ تو اسی طرح چرخ پر تاباں
بھری بہار کے دن اور تو تہی دا من
زمانہ زمزمہ بر لب ہے اور تو نالاں

حضرت صدیق حسن اسعد

حضرت اسعد کے دادا امیر امام بخش صاحب وائی اودھ نواب واجد علی شاہ کے دور میں تلنگوں کی فوج میں دفعتاً تھے۔ ۱۸۵۶ء کی جنگ آزادی میں زخمی ہوئے اور صحت پانے کے بعد شاہجہاںپور کا رخ کیا۔ یہاں قلعہ نواب بہادر خاں بانی شاہجہاںپور کے قرب میں بجانب شمال محلہ بکسریاں میں قیام کیا اور پھر مستقلاً سکونت اختیار کر لی۔ حضرت اسعد کے والد ماجد محمد ولی صاحب ریاست اندور میں صوبہ دار کے عہدے پر فوج میں ملازم تھے۔ اسعد صاحب شاہجہاںپور میں پیدا ہوئے اور یہیں پرورش پائی و پروان چڑھے۔ حسب رواج قدیم ابتدائی تعلیم گھر ہی میں پائی پھر مدارس علوم مشرقیہ میں داخلہ لے کر فارسی کی تکمیل کی نیز عربی کی تعلیم بقدر ضرورت حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل اور ایس۔ ایل۔ سی کے امتحانات پاس کئے۔ شعر و شاعری کا شوق تعلیم کے دوران ہی پیدا ہو چکا تھا۔ پندرہ سال کی عمر سے شعر کہنے لگے تھے۔ ایک سال بعد داغ کے شاگرد رشید اور شاہجہاںپور کے مشہور شاعر و استاد وقت نواب ناظم علی خاں ہجر سے مشورہ سخن کے لئے ان کے تلامذہ میں شامل ہو گئے لیکن بد نصیبی سے حضرت ہجر ۱۹۱۳ء میں بمبئی کے دوران قیام رحلت فرما گئے اس طرح حضرت اسعد کو جناب ہجر سے استفادے کا زیادہ موقع نصیب نہ ہو سکا۔ جناب ہجر کے انتقال کے بعد آپ نے کسی سے مشورہ سخن نہیں کیا چوں کہ اپنے وجدان سلیم پر بھروسہ تھا رفتہ رفتہ مشق سخن سے فن میں نچنگی پیدا ہو گئی۔ ۱۹۱۶ء میں کچھری کلکٹری میں ملازم ہو گئے اور مدت ملازمت پوری کر کے ۱۹۴۶ء میں پنشن پا کر علم و ادب میں مشغول رہنے لگے۔ ۱۹۳۶ء میں تقسیم ہند کا واقعہ پیش آیا۔ آپ کے صاحبزادے مجسم حنیف احمد سعیدی ہجرت کر گئے۔ ۱۹۴۸ء میں آپ بھی ان سے کراچی میں جا ملے۔ کراچی میں آپ بزم غالب کی شعری ادبی کارروائیوں میں بحیثیت صدر بزم نہایت انہماک سے شامل رہے۔ شعر و شاعری کا شغل جاری رہا۔ آپ کے بہت سے شاگرد پاکستان پہنچ چکے تھے جو آپ سے استفادہ کرتے تھے اور شاہجہاںپور کے تلامذہ خاص طور پر غیر مسلم بذریعہ مراسلت مشورہ سخن کرتے رہے۔ آپ کے شاگردوں کی کثیر تعداد تھی۔ اسعد صاحب متین، سنجیدہ اور نہایت خوددار انسان تھے، خلوص و محبت کے زندہ پیکر تھے۔ آپ میں بہت سی خوبیاں تھیں جن کا احاطہ کرنا اس مختصر خاکے میں دشوار ہے۔ آپ شہرت و ناموری سے ہمیشہ دور رہے نام و نمونہ سے بے نیاز تھے۔ رسائل و اخبارات میں کلام کی اشاعت کو اپنی خودداری کے خلاف سمجھتے تھے۔ مقامی

مشاعروں اور مخصوص نشستوں کی بات الگ ہے بیرون شہر مشاعروں میں شاید ہی کبھی شریک ہوئے ہوں یہی سبب تھا کہ آپ زندگی بھر غیر معروف رہے جس کی انھیں بالکل پرواہ نہیں ہوئی۔ ایک صاحب انا اپنی شہرت کے وسیلے تلاش کرے یہ انھیں منظور نہ تھا ورنہ وہ اس مرتبے کے شاعر تھے کہ دنیا کے شعروادب ان کو سر آنکھوں پر بٹھاتی۔ جو صاحبان فکر و فن آپ کے مرتبہ شاعری سے واقف تھے آپ کا انتہائی ادب و احترام کرتے تھے۔ شاہجہانپور میں آپ کی نشستگاہ صبح و شام تلامذہ اور ارباب ذوق سے بھری رہا کرتی تھی جہاں متانت اور تہذیبی اقدار کا خصوصی خیال رکھا جاتا تھا۔ حضرت اسعد، اعتبار الملک حضرت دل جناب اصغر علی خاں اصغر، محمد جمیل احمد خاں کوکب، جناب عبدالسمیع خاں نکہت وغیرہم کے ہم عصر تھے۔ حضرت اسعد کا کلام مذاق تازہ اور فکر کہن کا حسین امتزاج ہے۔ آپ کا انتخاب کلام وجدان سلیم کے نام سے ان کی حیات ہی میں ۱۹۶۲ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آکر اہل فن سے خراج داد و وصول کر چکا تھا۔ حضرت اسعد نے تقریباً ہر صنف شاعری میں طبع آزمائی کی تھی جس میں غزل، نظم، نعت، منقبت، سلام، قصیدہ، نوحہ و وفات، تاریخ، تنہیں، مثلث، مخمس، مسدس سب ہی ان کے کلام میں موجود ہے۔ حضرت اسعد کے صاحبزادے الحاج حنیف احمد اسعدی کا پاکستان کے صاحب طرز نعت گو یوں میں ممتاز مقام ہے۔ افسوس کہ منشی صدیق حسن اسعد شاہجہانپوری بتاریخ ۱۹۶۹ء میں کراچی میں رحلت فرما گئے۔

نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیں۔

نقاب الٹی تو عارض اک تراشہ ماہ کامل کا	نظر پلٹی تو دل جیسے چراغ کشتہ محفل کا
رواں اس بحر میں ہے اب سفینہ حسرت دل کا	جہاں ساحل سے درگزرے تصور گم ہے ساحل کا
حریم حسن میں ہے سامنا صد گونہ مشکل کا	نظارہ لغزش آنکھوں کی محبت ساخہ دل کا
ستارے بھی مکمل سن نہ پائے ماجرا دل کا	اکیلا ہوں کوئی سا تھی نہیں ہے میری منزل کا
مجھے تو رزمگاہ زندگی میں دیکھنا یہ ہے	کہاں تک حد محرومی، کہاں تک جوصلہ دل کا
مبارک جذبہ منصور و عزم کو بہکن بسکین	بچا کر داغ رسوائی سے گوشہ دامن دل کا
مجھے ڈر ہے نگاہ ناخدا دھوکا نہ کھا جائے	کہیں پر ہوج طوقاں روپ بھرتی ہے ساحل کا

بدشواری قدم اٹھتا ہے راہ عشق میں اسعد

چلو کچھ شمع سے پوچھیں طریقہ قطع منزل کا

بجو معتبر سے آسماں کر دی زمیں میں نے
 وہ کافر خود شکست نخوت و تمکین پر حیران ہے
 بھری محفل میں کون ان شوخیوں کی تاب لائے گا
 بہت آگے مقام خیر و شر سے ہے مری منزل
 چمک اٹھیں وہ آنکھیں میرے اظہار محبت پر
 حرم کے قافلے کا وہ تھکا ماندہ سا سفر ہوں
 ادھر اترے مہ و انجم ادھر رکھی جبیں میں نے
 کہ ٹھکرایا تھا دل سا شیشہ نازک ترس میں نے
 اٹھایا میں اور ان آنکھوں پہ کھدی آستیں میں نے
 معطل کروئے اپنے کراٹا کا تبیں میں نے
 اچھالی دل کے شیشے سے شراب تہہ نشیں میں نے
 جلائی ہے ہر اک منزل پر شمع اولیں میں نے

قرینے چاہئے میر چمن کے واسطے اسعد
 چنے ہیں پھول کانٹوں سے بچا کر آستیں میں نے

رنج و خوشی کے کچھ خار و کچھ گل دامن میں اپنے دُنیا لئے ہے
 آسودگی اک جنت لئے ہے شوریدگی اک صحرا لئے ہے
 لے ماہ تاباں تیری شعاعیں جیسے کہ میرے تار گر سیاں
 میں بھی کسی کا سودا لئے ہوں تو بھی کسی کا سودا لئے ہے
 سینے میں آہیں کب تک مقید سینے سے ابھریں کچھ کارگر ہوں
 ساحل سے باہر جائیں تو جانوں دریا کہ جو ہیں دریا لئے ہے
 زاہد کی دُنیا حسرت کی دُنیا کیا کیا تصور باندھے ہیں دل نے
 حوروں کی اک صف حد نظر تک ساغر لئے ہے مینا لئے ہے
 اس خاکداں میں جو کوئی آیا ارمان و حرماں ہی ہیں گزارِ ری
 اک یاد عیش ماضی میں گم ہے اک کچھ امید فردا لئے ہے
 صوفی کو دیکھا میکش کو دیکھا، شاعر کو دیکھا بت گرو دیکھا
 اک اور دُنیا کاندھوں پہ اپنے دل ماورائے دُنیا لئے ہے
 زنداں کو اسعد خونباریوں سے رشک گلستاں کرنا پڑے گا
 تحصیل کب سے دامن میں اپنے اک لالہ زار صحرا لئے ہے

حافظ سید مختار احمد میاں - مختار

حافظ سید مختار احمد میاں مختار سید علی صاحب کے خلف اکبر اور شیخ امیر علی ڈپٹی کلکٹر مرحوم رئیس چمکنی گاڑی پورہ کے نواسے اور منشی شیخ رفعت علی رفعت کے حقیقی بھانجے تھے۔ سید مختار میاں تارین ٹکلی کے رہنے والے تھے۔ ابتدا میں حافظ فضل احمد فضل سے قرآن مجید حفظ کیا۔ بعدہ معمولاً فارسی پڑھی۔ اس زمانے میں شیخ کریم بخش فرقت اور شیخ بہادر علی قاری زندہ تھے شاہجہانپور میں ان دو حضرات کی وجہ سے شعر و شاعری کا چرچا زیادہ رہتا تھا سید مختار میاں بھی جلسوں میں جانے اور فضل احمد فضل کی شاگردی سے غزلیں پڑھنے لگے۔ ذہانت اور طباعی کا جوش ہوا سخن فہمی نے ترقی کی جدت اور مضمون آفرینی بڑھنے لگی بلا تکلف شعر موزوں کرنے لگے۔ مشاعروں میں شریک ہوتے اور داد سخن پاتے رہتے مختار میاں نے فضل احمد فضل کے علاوہ حضرت امیر مینائی کی شاگردی بھی اختیار کر لی۔ ۱۹۰۲ء میں ایک اخبار ایڈورڈ گزٹ شاہجہانپور سے جاری کیا جس کی تمام تر ذمہ داریاں خود انجام دیتے تھے۔ تین چار سال اخبار جاری رہا جس سے نثر نویسی میں مہارت پیدا ہو گئی۔ مختار میاں نے اسی دور میں ایک واسوخت کی بنیاد ڈالی جو اپنی طرز کی تھی۔ شاہجہانپور سے ایک رسالہ مرقع، نامی نکلتا تھا جس میں یہ واسوخت قسط وار چھپی رہی۔ آپ شاہجہانپور کے خوش گو شعراء میں شمار ہوتے تھے۔ جماعت احمدیہ میں داخل ہو کر شعر و شاعری قریب قریب ختم کر دی تھی صرف تلامذہ کی رہنمائی فرماتے تھے آپ کے والد سید علی بھی میرزا غلام احمد قادیانی سے بیعت تھے۔ حضرت مختار کا زیادہ وقت کتب بینی میں اور مخالفین جماعت کے اعتراضات کی تردید میں گزرتا تھا۔ بعد تقسیم ہند پاکستان ہجرت کر گئے تھے اور وہیں واصل بحق ہوئے۔ آپ کے مشہور شاگردوں میں حکیم حبیب الرحمن خاں حبیب اور پیارے میاں رشید تھے۔

نمونہ کلام

باتوں میں جو شوخی ہے تو آنکھوں میں حیا بھی
وہ شوخ یہ بے ساختہ بولا کبھی تھا بھی
لیکن ہمیں اس درد میں حاصل ہے مزا بھی
کیا کہتی ہے مخلوق تمہیں تم نے سنا بھی

دلکش بھی ہے ان کی یہ ادا ہوش ربا بھی
میں نے جو کہا آج نہیں دل کا پتا بھی
گو ہم ہیں محبت کی بدولت ہمہ تن درد
مختار خدا کے لئے اس بت کو نہ چاہو

داغ عشق رخ دلدار جو چمکا دل میں
سن کے افسردگی دل کی شکایت یہ کہا
ہم یہ سمجھے اتر آیا کوئی تارا دل میں
آپ رکھ لیجئے آگ کا شعلہ دل میں
دیکھو آئیں گے کسی روز جو آیا دل میں

یوں چاہنے والے ترے ایجان بہت ہیں
جب تک انھیں دیکھنا تھا سمجھتے تھے ہم کو
کچھ ہم تری الفت میں پریشاں بہت ہیں
اب حضرت ناصح بھی پریشاں بہت ہیں

دیکھا ہے جب سے زنگ تری جلوہ گاہ کا
بولے وہ ناز سے مجھے دیکھا جو اشکبار
عالم بدل گیا ہے ہمارے نگاہ کا
اے شخص کیوں تو نام ڈبوتا ہے چاہ کا

ہوئے ہم خاک جن کی دوستی میں
نہیں ہوتا ہے یہ حسن آدمی میں
وہ رکھتے ہیں کدورت ہم سے جی میں
رہے گی حسرت تک حسرت یہ جی میں
اگر دیکھا تو ہم نے آپ ہی میں
نہ ملتے ہائے ہم اس بت سے مختار

جو چال دل کو پیس نہ ڈالے وہ چال کیا
گردوں سے بھی بلند سرافتخار ہے
آنکھوں ہی میں جو گھرنے کمرے وہ چال کیا
اترا رہے ہیں آج ترے پائمال کیا

بابو طفیل احمد نامی

بابو طفیل احمد صاحب کے والد کا نام محمد ولی تھا جو ریاست اندور میں فوج میں دفعدار تھے۔
نامی صاحب کی ولادت شاہجہانپور میں ہوئی اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ آپ کا پیشہ ملازمت تھا۔
تقسیم ہند کے بعد پاکستان ہجرت کر گئے۔ شعر و شاعری کا شوق تھا اپنے بڑے بھائی جناب
صدیق حسن اسعد شاہجہانپوری سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ نمونہ کلام سے مشق سخن کا اندازہ کیا جاسکتا
ہے۔

وہ بھی کیا دن تھے کہ دنیا سے سروکار نہ تھا
جس کو بیکار سمجھتے تھے وہ بے کار نہ تھا
رشک کیا کیا اسے آیا جو گنہگار نہ تھا
کبھی دامن میں کسی کے گل بے خار نہ تھا

خوگر عیش نہ تھا غم سے خبردار نہ تھا
دے کے دل ہو گئی آخر کو حقیقت معلوم
بڑھ کے رحمت نے لیا عرصہ محشر میں مجھے
عیش بے شانہ رنج نہیں اے نامی

حساب دوستاں در دل بہت مشکل سمجھتے ہیں
اسی صید رسید کو ہم اپنا دل سمجھتے ہیں
اسے ہم جذبہ بے اختیار دل سمجھتے ہیں
اسے آئینہ بے مہری قاتل سمجھتے ہیں
تری قسمت کو اے دل رشک کے قابل سمجھتے ہیں
مجھی کو عقل کے دشمن عدوے دل سمجھتے ہیں

ہمیں کہنا پڑے گا ہم تمہیں قاتل سمجھتے ہیں
جسے دم بھرنے دیں فرصت تری نظر میں ترے ناوک
بہت دشوار ہے ترک محبت ناصح ناداں
نہ دیکھا اک نظر ایسی بھی خنجر کی صفائی کیا
وہ چشم نازنین زحمت اٹھائے تیر و پیکاں کی
محبت کی یہ قدر و منزلت اب رہ گئی نامی

وہ بہر فاقہ آئیں گے کیوں گور غریباں پر
مجھے کیوں یاس ہو آخر شکست عہد و پیمان پر
انہیں قابو ہے دامن پر مجھے اپنے گریباں پر
نمک پاشی بھی وہ کرتے نہیں اب زخم پنہاں پر

نہ آیا زندگی میں رسم جب حال پریشاں پر
یہ اس ظالم نے تجہ دید محبت کی بنا ڈالی
مے جوش جنوں کو دیکھ کر دامن بچاتے ہیں
امید چارہ فرمائی تو ابے ہمدم بڑی شے ہے

جگہ شوق ہے گریباں چاک جیب آستین پر زے
شباب آیا ہے اے نامی جنوں فتنہ ساماں پر

محفوظ علی - محفوظ

محفوظ علی صاحب محفوظ خلف منشی مصطفیٰ علی بن مولوی حاجی قاسم علی قادری ساکن محلہ محمد زئی
کی ولادت ۱۹۰۳ء میں ہوئی۔ حسب رواج قدیم اردو۔ فارسی اور عربی کی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ اسکول
میں انگریزی پڑھی۔ مختلف دفتروں میں بطور اسٹینوٹائپسٹ ملازم رہے۔ ایک حادثہ کا شکار ہو کر

معذور ہو گئے اب پنشن پار ہے ہیں۔ شعر و شاعری کا شوق اوائل عمر سے ہے۔ سوائے مرثیہ کے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ سید ارشاد حسین عرف پیارے میاں رشید کے حلقہ تلامذہ میں داخل تھے۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

وصال یار سے تقدیر آشنا نہ کرے جو داغ بھر کا دینے کو ہو وفانہ کرے
نظارہ رُخ گل جنت نگاہ سہی خزاں نصیب مگر یہ معاملہ نہ کرے

یاس کو آس نہ ہوتا ہے مگر کر دیکھیں شوق دیدار کے پھر چلتے ہوئے پر دیکھیں
دل میں ناسوختہ پروانوں کی خاطر محفوظ او پھر شمع تمنا کو جلا کر دیکھیں

عمل سے ہے زندگی عبارت عمل ہے انسانیت کا جوہر جمود ہو جس میں ہے وہ پتھر سنوارے کتنا ہی درست آذر
عمل ہی ملبوس روح ہو گا قبا عناصر کی جب نہ ہوگی بھلائیاں برگ گل بنیں گی برائیاں ہوں گی خار و اخلگر

جو سکر کے زراسر جھکا دیا تو نے کلی کلی کو چمن میں کھلا دیا تو نے
دبی دبی سی ہنسی میں وہ دلنواز کھنک کہ جیسے شیشے سے ساغر لڑا دیا تو نے
اداس شام کے رُخ پر فروغ عارض سے شفق کا غازہ گلگوں لگا دیا تو نے

محمد جمیل احمد خاں کوکب

حضرت کوکب کے والد ماجد کا نام محمد طفیل احمد خاں تھا۔ آپ ۲۹ شعبان ۱۳۳۱ھ مطابق ۲۰ نومبر ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم گھر ہی پر حاصل کی۔ مدارس علوم مشرقیہ میں فارسی اور عربی پڑھی مگر زبان انگریزی کے سنیافتہ نہ تھے تاہم اس میں از خود اس قدر استعداد پیدا کر لی تھی کہ شہرہ آفاق ناول نگار امریکی خاتون 'پرل بک' کے مشہور ناول 'ڈرگن سید' کا ترجمہ نہایت دلکش زبان میں کیا تھا اور جس پر اصل ہونے کا دھوکا ہوتا ہے۔ آپ میونسپل بورڈ شاہ جہاں پور میں پیش کار تھے اور اسی عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ طبیعت سنجیدہ تھی اور وہ نہایت خود دار انسان تھے۔ اوائل عمری سے

شعر و شاعری کا شوق تھا۔ علامہ سید مختار احمد میاں مختار تلمیذ حضرت امیر مینائی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ اپنے غزلوں کے علاوہ مختلف موضوعات پر نیز بچوں کے لئے بڑی کامیاب نظمیں لکھیں۔ ہندوستان کا شاید ہی کوئی موقر جریدہ ہو جس میں آپ کا کلام شائع نہ ہوا ہو۔ آپ کا کلام ریڈیو سے بھی نشر ہوتا رہا۔ شاہجہانپور میں ہی نہیں بیرونجات میں آپ کے کثیر شاگرد ہیں۔ حضرت کوکب نے بتایا کہ ۱۹ء کو سفر آخرت کیا۔ دنیائے ادب میں ان کی کمی مدت تک محسوس کی جائے گی۔ حضرت کوکب کیسے شاعر تھے اس سلسلے میں ملک کے چوٹی کے فنکاروں اور ادیبوں کی رائے ہی کافی ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے حضرت کوکب کے کلام میں بارہ خوبیاں پائی ہیں۔ غزل کے مسئلہ تنوعات کو برقرار رکھتے ہوئے مضامین کی ہم آہنگی۔ تغزل کی شائستگی اور پاکیزگی۔ اسلوب بیان کی دلکشی و موثر گد اخستگی و طرفگی۔ احترام حسن کے ساتھ ساتھ خود داری عشق۔ نشاط غم اور واہانہ درد مندی، صحت زبان و پختگی فن۔ بدائع و صنایع کی ندرت اور بے ساختگی، چونکا دینے والے قوافی کا استعمال، ایک ردیف سے متعدد معنی کا اظہار، معمولی الفاظ سے غیر معمولی استفادہ مقطعوں کی اہمیت جن میں تخلص محض پہچان کے لئے نہیں استعمال کیا گیا بلکہ اس سے ان کی شخصیت خود احتسابی یا مطمح نظر کا کوئی نہ کوئی پہلو اُجاگر ہوتا ہے۔ استاد ڈاکٹر سید احتشام حسین رضوی مرحوم کا حضرت کوکب کی شاعری پر تجزیہ ڈاکٹر زور کی بیان کردہ خصوصیات کی تائید کرتا ہے۔ احتشام صاحب فرماتے ہیں کہ کوکب شاہجہانپوری کی غزلوں میں پختگی کے ساتھ تاثیر کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اشعار تازگی کا احساس دلاتے ہیں اور سدا بہار ہونے کا یقین پیدا کرتے ہیں۔ کوکب شاہجہانپوری نے اپنی نظم گوئی کو وطنی، قومی، سیاسی اور عاشقانہ مسائل کے ان مجموعی پہلوؤں کا ترجمان بنایا ہے جس سے ہندوستان کے شاعر اجتماعی اور انفرادی طور پر متاثر ہوتے رہے ہیں انھوں نے اپنی عام نظموں میں زبان و بیان کی مشکل پسندی اور شاعرانہ اہتمام سے گریز نہیں کیا ہے لیکن بچوں کے لئے لکھتے ہوئے ان کی نفسیات اور شعور کی سطح کے پیش نظر نظر آسان اور سادہ زبان اختیار کی ہے یہ بات بھی قدرت بیان ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ آفتاب احمد صاحب جو ہر بدایونی کی رائے میں کوکب صاحب ایک پختہ مشق قادر ال کلام شاعر (تھے) اور فارسی و عربی میں کافی دستگاہ رکھنے کے ساتھ وہ قواعد فن اور عروض پر بھی کامل عبور رکھتے (تھے) برادر ام اشرف علی خاں ایم۔ اے شاہجہانپوری رٹائرڈ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ و حال سکرپٹری جامعہ اردو علی گڑھ رقم طراز ہیں کہ کوکب صاحب کے اشعار میں گہری تاثیر ہر شعر واقعیت و حقیقت پرست صالح دماغ اور زخم خوردہ و خوددار دل کی مشترک زہرہ گداز کیفیتوں کا کرسرہ معلوم ہوتا ہے اور

مردم فراق گورکھپوری نے فرمایا تھا کہ جناب کوکب شاہجہاںپوری ایک پختہ کار شاعر ہیں ان کا کلام ایک حساس دماغ ایک پر بدت طبیعت اور ایک درد مند دل کی نشان دہی کرتا ہے ہندوپاک میں ایسے پاک دست شاعر بہت تھوڑی تعداد میں ملیں گے۔ اساذی جناب نورالحسن ہاشمی سابق صدر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کی نظر میں حضرت کوکب ایک کہنہ مشوق شاعر (تھے) ان کا شمار ان شعرا میں کیا جاسکتا ہے جو شعر کی فنی خوبیوں سے بخوبی واقف ہوتے ہیں ان کو بحور و اوزان پر بھی دسترس حاصل تھی۔ یہ تھے حضرت کوکب شاہجہاںپوری۔

نمونہ کلام۔

غزل

ہر جگہ ہر دم حضوری کا مزہ پاتا ہوں میں
ایک دم کو بھی اگر کچھ آپ میں آتا ہوں میں
ہائے وہ یک لحظہ منظر، اُف وہ اک رقص شرر
درد بن بن کراٹھا کرتی ہے دل میں جس کی یاد
اللہ اللہ عشق کی یہ سادگی بے چارگی
کس کی حسرت سے مری ناکامیاں ہیں ہمکنار

وہ مرے ہمراہ رہتے ہیں جہاں جاتا ہوں میں
اپنا عالم دیکھ کر پھر نحو ہو جاتا ہوں میں
جب شکل آرزو خود سامنے آتا ہوں میں
نام لے لے کر اسی کا دل کو بہلاتا ہوں میں
آپ ہوتا ہوں خفا اور آپ من جاتا ہوں میں
کس کی مرضی ہے کہ ہر راحت کو ٹھکراتا ہوں میں

ہمنفس ہے کون اے کوکب یہ ہے کس کا جمال

اک فصنائے حسن میں اڑتا چلا جاتا ہوں میں

غزل

یہ ڈھنگ چاہئے روداد غم سنانے کا
نشاط غم ہی تو اس زندگی کا حاصل ہے
مرا ہو ہے نگار حیات کی مہندی
قفس میں جلوہ گل کا بھی اہتمام سہی
مری نظر میں ہے ایک ایک اسیر کی زنجیر

کہ سرگزشت میں انداز ہو فسانے کا
اگر ہو دل میں سلیقہ یہ نطف پانے کا
مجھے دماغ کہاں اشک خوں بہانے کا
مگر وہ عالم آزاد آشیانے کا
مجھے ملا ہے ام سارے قید خانے کا

سمند عمر تو کچھ سست رونہ تھا کوکب

کہ برق غم نے کیا کام تازیانے کا

متفرق اشعار:-

بے تاب کر دیا نگہ دل گداز نے
کو کتب کہاں سے لاؤں تھمٹل کا حوصلہ
عجیب طرح گزرتی ہے زندگی میری
میں بھی محروم نہیں میکدہ ہستی میں
دل سی نازک چیز اور دنیا کی سنگین سختیاں
مسکراتے ہوئے آنسو مسترغم آہیں
ہائے کیا پھول ہے وہ گل اندام
دیکھ کر ان کے ضبط کا عالم

آنسو نکل پڑے انھیں غم خوار دیکھ کر
وہ دل دہی کریں مجھے ناچار دیکھ کر
نہ اضطراب کا عالم نہ رنگ صبر و قرار
حسرت و درد سے معمور ہے غم خانہ دل
آچکے ہیں تنگ اپنے جوہر قابل سے ہم
میری دنیا بھی ہے طرفہ تری دنیا کی قسم
یا سمن کی مہک گلاب کا رنگ
اڑ گیا مسکے اضطراب کا رنگ

مولوی انوار احمد انوار

انوار احمد نام انوار تخلص والد ماجد کا نام مولوی محمد سلامت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ساکن
محلہ سنزئی شاہجہانپور پیدائش ۱۹۰۴ء۔ تعلیم عربی۔ فارسی۔ اردو اور بقدر ضرورت انگریزی۔ منشی۔ منشی
کامل۔ مولوی وغیرہ امتحانات الہ آباد یونیورسٹی سے پاس کئے۔ اکتساب علم حضرت مولانا حافظ
نعمت اللہ۔ حضرت مولانا سید سلطان حسن میاں۔ حضرت مولانا عبداللہ خاں۔ حضرت مولانا
ظہور احمد فاضل دیوبند اور حضرت مولانا سخاوت اللہ خاں سے کیا۔ مولانا انوار احمد صاحب کا
سلسلہ نسب حضرت شیخ جمال یمنی رحمۃ اللہ علیہ سے وابستہ ہے۔ شاعری کا آغاز ۱۹۳۵ء
سے ہوا۔ شہر کے مشہور و معروف قادر الکلام استاد حضرت مولانا محمد صدیق حسن اسعد شاہجہانپوری
سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ مشورہ سخن کا سلسلہ ۱۹۶۲ء تک جاری رہا۔ صنف شاعری میں غزل
سے خاص نسبت ہے یوں دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ابتدائی شاعری کا سرمایہ
ایک حادثہ میں جل کر رکھ ہو گیا۔ آپ کی زندگی درس و تدریس میں گزری۔ آج بھی شینہ مدراہیبیہ
کے ہتتم کی حیثیت سے دینی و علمی خدمات میں مصروف رہتے ہیں۔ حضرت مولانا کفایت اللہ
مفتی اعظم ہند آپ کے غم حقیقی تھے۔ اہل علم و ادب آپ کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے ہیں

حضرت مولانا انوار صاحب نہایت منکسر المزاج۔ مرنجاں فرنج اور نیک سیرت انسان ہیں۔ آپ کے حلقہ تلامذہ میں آپ کے دو صاحبزادے جناب اثر شاہ بھہانپوری اور واصف شاہ بھہانپوری بھی ہیں۔ دونوں صاحبزادے علمی اور ادبی دنیا میں معروف ہیں۔ بطور نمونہ چند غزلیں قارئین کے پیش نظر ہیں۔

جبین عجز و نیاز سے ہم وہ آج سجدے ادا کریں گے
 نظر جھکا کر کہے گا کوئی ہم اپنے وعدے وفا کریں گے
 مزہ تو جب ہے کہ چارہ ساز و تھیں بھی ہو چارہ گر کی حاجت
 اگر یہی درد کا ہے عالم تھیں بھی درد آشنا کریں گے
 زمیں کو لرزہ فلک کو جنبش نظام برہم نہ جانے کیا ہو
 شکستہ دل جب سکوت شب میں تڑپ تڑپ کر دُعا کریں گے
 کبھی نشیمن پہ برق چمکی کبھی بلائیں کبھی حوادث
 چمن میں ہے بود و باش جب تک یونہی یہ فتنے اٹھا کریں گے
 ابھی تو رعبِ جمال سے ہم زباں بریدہ سے ہو رہے ہیں
 دیا سہارا جو ہمتوں نے تو ان سے کچھ التجا کریں گے
 حرم مکاں ہے حرم سے مطلب تمہاری منزل تو لامکاں ہے
 جدھر کو دیکھیں گے رُخ تمہارا ادھر ہی سجدہ ادا کریں گے
 عجب ہے انوار اپنا عالم کہ ہوش رخصت تو اس ہیں گم
 ابھی تو جلوے حجاب میں ہیں حجاب اٹھے گا تو کیا کریں گے

تصور ہلے رنگیں میں ہم ایسے کھو گئے دل سے
 سفینہ زندگی کا ہے فنا کے تیز دھارے ہیں
 جو ہر دم موج طوفاں خیز کے دامن میں رہتی تھی
 بایں انداز جی بے چین ہوتا ہے دم رخصت
 ازل سے ایک خرمن بلیوں کا دل میں پنہاں تھا
 کہ اکثر بڑھ گئے جوش طلب میں حد منزل سے
 عیاں ہوتا رہا شب بھر گداز شمعِ حُفصل سے
 وہ کشتی ڈوبتی ہے اب گلے مل کے ساحل سے
 بچھڑ جاتی ہیں موجیں جس طرح ٹکرا کے ساحل سے
 جلا کر رکھ دیا ہر ماسوا کو سوزش دل سے
 و فوراً یاس میں انوار گزری زندگی اپنی
 ازل سے حسن کی فطرت کو استغنا رہا دل سے

بابو جگدیش سہائے سکسینہ

بابو جگدیش سہائے کے والد کا نام بابو ہری ہر سہائے پیشہ ملازمت تھا۔ اصلی وطن فرخ آباد تھا۔ آپ کے دادا بسلسلہ ملازمت شاہجہانپور آئے اور توطن اختیار کر لیا۔ بابو جگدیش سہائے سہ مارچ ۱۹۰۴ء میں یہیں پیدا ہوئے۔ بزمانہ بچپن گھر پر ہی ایک مولوی سے اردو و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ گورنمنٹ ہائی اسکول سے ۱۹۲۶ء میں ایس۔ ایل۔ سی کی سند حاصل کی۔ انٹر میڈیٹ کے لئے کرچیپن کالج لکھنؤ میں داخلہ لیا مگر طبیعت نہ لگی الہ آباد جا کر کایستھ پاٹھ شالے سے انٹر میڈیٹ کا امتحان پاس کیا اور الہ آباد یونیورسٹی سے ۱۹۲۶ء میں بی۔ اے، ۱۹۲۸ء میں ایل۔ ایل۔ بی کے امتحانات پاس کئے۔ شعر و شاعری کا شوق بزمانہ اسکول پیدا ہوا اور الہ آباد یونیورسٹی میں پروان چڑھا کایستھ پاٹھ شالہ میں آپ کے فارسی کے استاد منشی کنیش لال ماتھر بی (ایم۔ اے) اور فارسی (ایم۔ اے) تھے۔ ان کو فارسی میں فضیلت حاصل تھی۔ منشی کنیش لال ماتھر نے بابو جگدیش سہائے کا رجحان غزل کے بجائے نظم کی جانب زیادہ دیکھ کر مشورہ دیا کہ وہ نظم کہنے کی مشق کریں اور یہی ان کے لئے کھلا ہوا میدان ہے۔ بابو جی نے نظم کی طرف توجہ خاص دینے سے قبل سرور جہاں آبادی، چلبست لکھنوی اور علامہ اقبال کے اردو فارسی کلام کا بغور مطالعہ کیا اور اپنی دو ایک نظمیں منشی دیانرا سن نغم اڈیٹر زمانہ، کانپور کو بھیجیں جنہوں نے پسند کر کے شائع کر دیں۔ الہ آباد سے بعد تکمیل تقسیم آپ شاہجہانپور آگئے اور وکالت شروع کر دی شاہجہانپور میں شعر و شاعری کا زور تھا یہاں کے شعرا نے آپ کی ہمت افزائی فرمائی۔ آپ یہاں کے آئے دن کے جلسوں میں بپابندی شریک ہوتے رہے جس سے آپ کو مشق کا موقع ملا اور کلام میں نکھار پیدا ہو گیا مشاعروں میں جگدیش نے آپ ہمیشہ نظمیں پیش کرتے تھے۔ آپ کی نظمیں ملک کے بہت سے جرائد و رسالوں میں شائع ہوتی رہیں۔ آپ کا فارسی کلام بھی بہت ہے۔ ۱۹۸۲ء کے اواخر میں آپ رحلت فرما گئے۔ رحلت سے قبل حضرت حافظ رحمت اللہ علیہ کے رنگ میں غزلیں موزوں فرما رہے تھے۔ نظموں کا ایک مجموعہ طبع ہو چکا تھا جس پر اتر پردیش اردو اکاڈمی نے گرانقدر انعام سے نوازا تھا۔ آپ کو اس بات کا انتہائی صدمہ تھا کہ ان کے بچے اردو فارسی جیسی بیش بہا، خوبصورت اور مہذب زبان سے نابلد ہیں اور ان میں سے کوئی بھی اردو داں نہیں ہے۔ بابو جگدیش سہائے نہایت سادہ مزاج۔ سادہ دل خوش مزاج، منکسر، خوش اخلاق انسان تھے۔ جس سے ملتے جھکتے

ملتے۔ کسر نفسی کا یہ عالم تھا کہ ہمیشہ خود کو بے علم سمجھا۔ وکالت کے پیشے میں کامیاب تھے آخری عمر میں رٹائر ہونے کے باوجود کچھری محض اس لئے آتے تھے کہ اپنے شاگردوں اور نوآموز و کلار کو قانونی امانت دیتے رہیں اور مشوروں سے نوازتے رہیں۔ بابو جگدیش سہائے نہایت قابل احترام ہستی تھے۔ جس قدر وکلار ان کی عزت کرتے تھے اس سے کہیں زیادہ اصحاب فکر و فن اور شاعر و ادیب احترام کرتے تھے۔ بابو جگدیش سہائے کی موت سے دنیا کے شعر و شاعری میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کو پر نہیں کیا جاسکتا۔ بطور نمونہ آپ کی چند غزلیں اور نظمیں درج کی جاتی ہیں جس سے ان کی قادر الکلامی ظاہر ہوتی ہے۔

جناب جگدیش سہائے کے انتخاب کلام "آب و رنگ" کا پیش لفظ حضرت عرش بلبیانی نے تحریر فرمایا ہے لکھتے ہیں "بابو جگدیش سہائے سکسینہ نظم نگار شاعر ہیں اور وہ بھی فطرت پر آپ کی نظمیں شاہ کار ہیں۔ آپ کا اشہب قلم دوسرے میدان میں بھی یکے تازی کرتا ہے۔ آپ نے سماجی، اصلاحی اور ملکی نظمیں بھی کہی ہیں۔ غزلیں کم کہی ہیں لیکن اس خیال سے کہ پرانے لوگ اس شاعر کو جو غزل نہ کہنے ٹکسال باہر، قرار دیتے تھے آپ نے غزل میں بھی جو ہر دکھایا ہے ان غزلوں میں بھی آپ کو جگہ جگہ انسان دوستی اور اخوت پر مشتمل مضامین شعر اکثر ملیں گے۔"

نمونہ کلام

گل پتر مردہ

جوانی گل و عشق ہزار کے دن تھے	تجلیاں تھیں سحر کی بہار کے دن تھے
چمن لطافت و خوبی میں رشک جنت تھا	نظر نواز تماشا نے بزم قدرت تھا
شباب و حسن کی تھی جلوہ گتری ہر سو	سرور بخش تھی موج نسیم عنبر بو
ترانہ ہائے عنادل نشاط آور تھے	مئے بہار سے رنگیں گلوں کے دامن تھے
مئے تھا ہاتھ میں گلبن ہزار جام نشاط	روش روش پہ چمن کی تھا اہتمام نشاط
کہ بے خبر تھے مال بہار ہستی سے	نہال جھوم رہے تھے و فور مستی سے

(۲)

نگاہ شوق تھی مثل نسیم آوارہ	میں اک روش پہ چمن کی تھا محو نظارہ
توزیر سایہ گلبن ٹھٹھک گیا جا کر	چلا جو دوسری جانب خوشی سے اترا کر
جفائے چرخ کے ہاتھوں ملول و رنجیدہ	پڑا ہوا تھا وہاں اک گل خزاں دیدہ

کہا یہ جذبہ عشرت نے قلب سوزاں سے
نشاط سیرچمن کو یہ خوں رلاتا ہے
فسردہ دل بھی کہیں انجن کے قابل ہے
کہ دور پھسکیئے اس پھول کو گلستاں سے
کہ فصل گل میں خزاں کا سماں دکھاتا ہے
جو ہنس رہا ہے وہی گل چمن کے قابل ہے

(۳)

اٹھایا پھول کو میں نے جو بادل رنجور
زباں حال سے کچھ کہہ رہا ہوں کہنے دے
میں بے رنجی کا گلہ کیا کروں عناد دل سے
کبھی نسیم ادھر کو جو آنکلتی ہے
ترے سلوک نے دل کی غلش فزوں کر دی
وہی رموز بہار و خزاں سمجھتے ہیں
بہار میں جو خزاں کا سماں دکھاتا ہوں
یہ کہہ رہا ہوں کہ فانی بہار عالم ہے
یہی خیال کہ فصل بہار گزراں ہے
اگر خزاں کا نہ اس باغ میں گزر ہوتا
گراں بہا ہے مری خاک رازداں کے لئے

لبوں سے اس کے یہ آئی صدا کہ او مغرور
پڑا ہوا مجھے خاک چمن پہ رہنے دے
کہ شاخ گل نے بھی مجھ کو بھلا دیا دل سے
تو میری خاک سے دامن بچا کے چلتی ہے
کہ شاعروں سے تھی مجھ کو امید ہمدردی
کہ داغ دل کو گل بوستاں سمجھتے ہیں
نظر فریبی، سرو و سمن بڑھاتا ہوں
اٹھو اٹھو کہ یہاں فرصت نظر کم ہے
جہاں میں قدر فزائے گل و گلستاں ہے
تو حسن گل بھی نہ دامن کشن نظر ہوتا
بنے گی غازہ یہ رخسار بوستاں کے لئے

اب ایک مشاہدے اور احساس سے بھر پور نظم "چاندنی رات" ملاحظہ فرمائیے۔

چاندنی رات ہے چلتی ہے دبے پاؤں ہوا
چومتی یوں ہے درختوں کو، نہیں شور ذرا
راگنی ایسی خموشی ہی میں دیتی ہے مزا

ساز الفت پہ کوئی نغمہ دلکش گاؤ

وہ دلاؤینہ ترانہ جو کنار جمن
بالسری لے کے کہنیا نے کبھی گایا تھا
جس کی ہر تان تھی رادھا کے لئے ہوشربا

ہاں وہی راگ زراگا کے مجھے ترپاؤ

تم جو ملتے ہو تو دل سے نہیں ملتے ہو کبھی

ایسے ملنے سے تولے دوست جُدائی اچھی
آج تک کھل نہ سکی آہ مرے دل کی کلی

مسکرا کر اسے اک بار کھلاتے جاؤ

ایک دن آئے گا جب ہوگی نہ دھن جینے کی
سرد ہو جائے گی یہ آگ مرے سینے کی
بھر کے دو جام کے حسرت ہے ابھی پینے کی

کہیں ایسا نہ ہو اے دوست کہ پھر پچھتاؤ

آج اس طرح سے گاؤ کہ ستارے ناچیں
حسرتیں دل میں جو سوتی ہیں یکا یک جاگیں
اور جب نیند سے بوجھل ہوں تمھاری آنکھیں

لے کے انگریزی یہ کہنا کہ بس اب سو جاؤ

غزل کے اشعار

بن کے داغ دل مایوس نمایاں ہوں گے
یہی اک روز ایامِ مئے عرفاں ہوں گے
مہ جیس اب تجھے دیکھیں گے تو حیراں ہوں گے
وہ ترے شکر گزارائے شب ہجران ہوں گے
تو جو پچھتاؤے گا ہم اور پشیمان ہوں گے
جو گل تر کی طرح چاک گریباں ہوں گے
سوچتا ہوں کبھی ان انسان بھی انساں ہوں گے
آمد فصل بہاری سے پریشاں ہوں گے

کبھی مٹ کر نہ فنا حسرت و ارماں ہوں گے
داغہائے دل سوزاں کو میں رکھتا ہوں عزیز
میری الفت نے بڑھایا ہے ترا حسن و جمال
سایہ زلف پریشاں جو سمجھتے ہیں تجھے
شکوہ جو پر اے دوست نہ ہو شرمندہ
راس آئے گا انھیں کو یہ جنون الفت
دیکھ کر شیخ و برہمن کی عداوت یارب
دو بہاروں کو نہ دعوت کہ اسیرانِ قفس

منشی محمود حسن - زار

منشی محمود حسن نام زار تخلص۔ شاہجہانپور کے قدیمی باشندہ تھے۔ ان کے ہم عصر شعرا جناب

اسعد شاہ بھمانپوری جناب احمد حسین صاحب شوق۔ فیض الحسن فیضی وغیرہ تھے۔ آپ ۲۱ شعبان
۱۳۶۴ھ مطابق ۱۹۴۵ء راہی ملک بقا ہوئے۔ زیادہ حالات نہ معلوم ہو سکے۔

نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

بیخودوں کو کسی مطلب سے سروکار نہ تھا ورنہ ملنا ترا آسان تھا دشوار نہ تھا
عقدہ اے گریہ خوں آج کیا حل تونے جو لہو تھا جگر و دل میں وہ بیکار نہ تھا
حکم تعزیر کجا ناز منصور کجا مفتی وقت کوئی محرم اسرار نہ تھا
عشق میں سب سے بڑی تھی یہ مصیبت اے زار
پند گو لاکھ تھے لیکن کوئی غم خوار نہ تھا

عدو بھی رشک سے رویا مرے حال پریشاں پر ہنسی آئی جوان کو خندہ چاک گریباں پر
محبت میں لہو جب رفتہ رفتہ ہو گیا پانی ہوئیں مجبور آنکھیں انکشاف راز پنہاں پر
مرے نزدیک واعظ صرف اتنی ہی قیامت ہے، نگاہ خلق محشر میں پڑے گی حسن جاناں پر
مجھے اب مل گئی اے زار داد گر یہ پیہم
نظر آئے ہیں داغ اشک خوں کچھ ان کے داماں پر

کریم الرضا خان۔ رضا

کریم الرضا خان صاحب خلف جناب ریاض الرضا خان صاحب فروغ محلہ علی زئی کے ساکن
اور شرفائے شہر سے تھے۔ علی گڑھ محمدن کالج سے ایم۔ اے اور ۱۹۱۶ء میں ایل۔ ایل۔ بی کے
امتحانات پاس کئے۔ شاہ بھمانپور کے کامیاب وکلاء میں شمار تھا سیاست میں نمایاں حصہ
لیا۔ ایم۔ ایل۔ سی رہے اور شاہ بھمانپور سٹی بورڈ کے چیئرمین بھی۔ شاعری سے زمانہ طالب
علی سے شوق تھا۔ نمونہ کلام
چار حرف آرزو بھی لب تک آسکتے نہیں وہ سنیں تو کیا سنیں جب ہم سنا سکتے نہیں

ناہلے دل کہ جن سے کانپتے ہیں دل
ان کو آنا ہے تو آئیں شوق سے دل میں مگر
کیا قیامت ہے بتوں کا دل ہلا سکتے نہیں
حسرتوں کی بھیسڑ سے آرام پاسکتے نہیں
جان من دل کی طرح اس کو چھپا سکتے نہیں

شافع محشر سے ہے امید کامل اے رضا
وہ جو حامی ہیں تو ہم دوزخ میں جاسکتے نہیں

خان بہادر فضل الرحمن خاں - رحمن

خان بہادر فضل الرحمن خاں صاحب مرحوم خلف جناب عثمان خاں صاحب ساکن محلہ عثمان باغ فخر شہر تھے۔ تدبیر و سیاست میں یگانہ۔ کامیاب ترین وکیل۔ رہنما سے وقت اور صائب الرائے انسان تھے۔ میونسپل بورڈ شاہجہاںپور کے عرصہ دراز تک چنیز میں رہتے اسلامیہ انسٹرکالج اور گاندھی فیض عام پوسٹ گریجویٹ کالج آپ کی یادگار ہیں۔ اولاد نکور میں ایک فرزند ظل الرحمن خاں پروفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے جس کی شادی ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم جو ہندوستان کے صدر مملکت رہ چکے تھے کی دختر سے ہوئی ہے۔ خان بہادر فضل الرحمن خاں صاحب نے ابتدائی تعلیم حسب رواج حاصل کی۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی پاس کر کے وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ خود علم داں تھے اور علم والوں کی قدر کرتے تھے۔ طبیعت نہایت موزوں پائی تھی۔ گاہے گاہے شعر موزوں فرمایا کرتے تھے۔ نہایت تلاش کے بعد آپ کے چند اشعار دستیاب ہوئے ہیں جو ناظرین کی صیافت طبع کے لئے درج ذیل ہیں۔ آپ نے سہ میں وفات پائی۔

مسکراتا ہے وہ گل پھولوں کو خنداں دیکھ کر
فضل رحمن اس کی رحمت نے لیا آغوش میں
کچھ ہوا بدلی تو ہے رنگ گلستاں دیکھ کر
اشک جب میں نے بہائے فرد عیاں دیکھ کر

کہتے جسے حیات ہیں اک اضطراب ہے
جس میں سکوں نصیب ہو وہ زندگی نہیں

حکیم حبیب الرحمن خاں حبیب

آپ کے والد ماجد کا نام محسن رضا خاں تھا۔ آپ شاہجہانپور کے قدیم باشندے تھے اور اہل افغانہ میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ آپ کے آبا و اجداد نے عہد شاہجہانی میں افغانستان سے آکر یہاں توطن اختیار کر لیا تھا۔ نوابین شاہجہانپور نے آپ کے گھرانے کو جاگیریں عطا فرمائیں اور اعزاز و اکرام سے نوازا۔ آپ کا خاندان باعتبار تمول شہر میں ممتاز تھا۔ حکیم صاحب موصوف نے طبیہ کالج لکھنؤ سے سند حکمت حاصل کی اور آخر دم تک اسی شہر میں حکمت کرتے رہے۔ حکیم حبیب الرحمن خاں صاحب اردو فارسی اور عربی میں دستگاہ رکھتے تھے حکمت کے مصروف پیشے کے ساتھ ساتھ شوق شاعری بھی تھا گاہے گاہے مشاعروں میں بھی شرکت فرماتے تھے۔ شاہجہانپور کے بزرگ اور باکمال شاعر سید مختار احمد میاں مختار کے جو حضرت امیر مینائی کے شاگرد تھے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے تھے۔ آپ کا مطالعہ وسیع تھا اور زبان پر عبور حاصل تھا اس لئے آپ کے کلام میں وہ تمام اوصاف موجود ہیں جو ماہر فن کے کلام میں ہونا چاہیے۔ نازک خیالی اور شگفتگی آپ کے کلام کی خصوصیت ہے۔ حکیم حبیب الرحمن خاں صاحب محض ایک طبیب و شاعر ہی نہیں سیاست داں بھی تھے۔ ۱۹۵۲ء میں آزاد ہندوستان کے پہلے الکشن میں شہری حلقہ سے یو۔ پی کی اسمبلی میں پانچ سال ایم۔ ایل۔ اے بھی رہے اور اپنی بساط بھر خدمات انجام دیں۔ آپ کا انتقال بتاریخ ۶ جنوری ۱۹۷۱ء کو ہوا۔

نمونہ کلام

کیا نظر سوز تیرا جلوہ رخسار نہ تھا	کیوں گلہ ہے جو کوئی طالب دیدار نہ تھا
میں گرفتار تھا جب تک کہ گرفتار نہ تھا	کر دیا قید غم عشق نے آزاد مجھے
ورنہ مرنا تو شبِ ہجر میں دشوار نہ تھا	کس تمنا پہ گزاری ہے تمہیں کیا معلوم
وہ تو اے شوخی قسمت درد لدار نہ تھا	کنج زنداں میں بھی رہنے نہ دیا عاشق کو
جس کی قسمت میں تیرا سایہ دیوار نہ تھا	عمر کس طرح گزاری ہے خدا ہی جلنے
آہ آسان تھی نالہ کوئی دشوار نہ تھا	جانے کیا سوچ کے خاموش رہا میں ورنہ
دل سی شے اور کوئی اس کا خریدار نہ تھا	کس قدر سرد تھا بازار محبت یارب

میرے اظہار و فانی مجھے مارا اے حبیب

ورنہ اس طرح تو وہ مائل آزار نہ تھا

دینی نہ تھی تباہی دل کی خبر مجھے
کھوئے گئے ہیں دونوں محبت کی راہ میں
دل سوز کوئی مجھ سا لگے گا تجھے کہاں

دنیا سے کھو گیا ہے میرا نامہ بر مجھے
میں راہبر کو ڈھونڈتا ہوں راہبر مجھے
لیتا چل اپنے ساتھ چراغ سحر مجھے

سید امانت حسین - ربط

سید امانت حسین ربط قدیمی باشندہ قصبہ تلہر کے تھے۔ ترک سکونت کر کے شاہجہا پور آئے تھے۔ اردو فارسی کی تعلیم حسب رواج قدیم حاصل کی۔ قدرے انگریزی زبان سے بھی واقف تھے۔ خان بہادر منسوب حسن خاں صاحب چیرمین میونسپل بورڈ کی توجہ سے میونسپل بورڈ میں ملازمت حاصل ہو گئی۔ ترقی کرتے ہوئے انسپکٹر کے عہدے تک پہنچے۔ کسی وسیلے سے امیر محمود آباد تک رسائی ہو گئی تھی شاہجہا پور سے محمود آباد آگئے اور عرصے تک منصرم رہے۔ بعد سبکدوشی شاہجہا پور چلے گئے آدمی رسا اور ذہین تھے۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کے پریزیڈنٹ رہے اور جسٹریٹ اعزازی بھی کچھ مدت تک رہے۔ ضلع سیتار پور میں ایک ہزار بیگہ کا فارم بنا لیا تھا اولاد کی کج رفتاری اور بے ڈھنگے پن سے مجبور ہو کر فروخت کر دیا۔ صدر اسپتال کے جنوب کو عالی شان مکان تھا وہ بھی فروخت کر کے یہاں سے نورنگ آباد میں اپنے ایک عزیز کے یہاں قیام کیا اور وہیں کچھ دنوں کے بعد انتقال ہو گیا۔ ربط صاحب کے ایک فرزند روغنہ ڈسٹری میں ملازم ہیں جن سے راقم الحروف نے حضرت ربط کے حالات معلوم کرنا چاہے مگر انھوں نے کوئی توجہ نہیں دی نہ تفصیلی حالات بتائے ربط صاحب اپنے بڑے بھائی وجاہت حسین رمز سے مشورہ سخن کیا کرتے تھے۔ ۱۹۷۷ء سے قبل بھر پچھتر سال نہایت کسم پرسی کے عالم میں انتقال ہوا کوئی اولاد پاس موجود نہیں تھی۔ نمونہ کلام بدقت حاصل ہوا جو قارئین کی دلچسپی کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔

اپنے وحشی کا بہاروں پر یہ احساں دیکھئے
دل کو ظاہر ہیں نگاہوں سے نہ کیجے آشنا
لطف ہے اس نگہ ناز کا قاتل ہونا
بن گیا دست اجل چہرہ قاتل کی نقاب

گوںچ اٹھا آوازہ چاک گریباں دیکھئے
دیکھئے جس کو اُسے با چشم پنہاں دیکھئے
ایک تصویر کا دو رخ سے مقابل ہونا
ختم ہے ختم ہے مجروح کا بسمل ہونا

کب میں جنوں کے ہاتھ سے نالاں نہیں رہا کس دن یہ مجھ سے دست و گریباں نہیں رہا
ان آنسوؤں نے اور ڈبویا خزاں میں رلبط گلشن کو روچکا تو بیاباں نہیں رہا
حضرت رلبط نے ہر صنف سخن نعت - مرثیہ - قصیدہ - منقبت - رباعی - قطعہ - مناجات وغیرہ پر
کامیابی سے طبع آزمائی کی ہے۔ آپ کا ذخیرہ کلام بہت تھا لیکن اولاد نے جو تعلیم سے بے بہرہ ہے
سب تلف کر دیا۔ ان کا مطبوعہ کلام بھی نظر نہیں آتا۔ راقم الحروف کو مرحوم سے نیاز تھا ان کی ذاتی لائبریری
میں بہت سی نایاب و نادر کتابیں تھیں جو برائے نام قیمت میں فروخت کر دی گئیں۔ صد افسوس کہ
گھر میں کوئی قدر داں نہیں تھا ورنہ قابل قدر ذخیرہ کتب کیوں برباد و تباہ ہوتا۔

نبی حسن - خیال مینائی

نبی حسن خیال کے والد ماجد کا نام جناب ولی حسن انصاری تھا۔ انٹر اسلامیہ اسکول اور بنی - اے
گاندھی فیض عام ڈگری کالج شاہجہانپور سے پاس کر کے پاکستان ہجرت فرما گئے جہاں آپ نے اپنی
تعلیم جاری رکھی اور ایم۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی کی اسناد حاصل کیں۔ فی الوقت میاں گوندل (گجرات) میں
ایک تعلیمی ادارے میں پرنسپل کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ آپ کے والد ولی حسن صاحب نے
شاہجہانپور سے 'مرقع' کے نام سے ایک رسالہ اپنے 'نامی پریس' سے جاری کیا تھا۔ حضرت نیاز
فٹیوری سے آپ کے خصوصی مراسم تھے اور کبھی کبھی حضرت نیاز ولی حسن صاحب سے ملنے شاہجہانپور تشریف
لاتے رہتے تھے۔ جناب نبی حسن خیال حضرت دل شاہجہانپوری کے شاگردوں میں ہیں اور پاکستان
میں بحیثیت شاعر معروف ہیں۔ منظومات کا مجموعہ 'شہر دل' اور نعتیہ کلام کا مجموعہ 'نور کی ندیاں رواں'
شائع ہو چکا ہے۔

وفا اس دور میں بدنام کیوں ہے سوچنا ہوگا	شرافت مورد الزام کیوں ہے سوچنا ہوگا
وطن میں آج قتل عام کیوں ہے سوچنا ہوگا	سیاست اس قدر ناکام کیوں ہے سوچنا ہوگا
بوں پر پھر تمہارا نام کیوں ہے سوچنا ہوگا	نہ تم نے پھول برسائے نہ زخموں پر نمک چھڑایا
مریض ہجر کو آرام کیوں ہے سوچنا ہوگا	فراق یار میں جینا بہت دشوار ہوتا ہے
مگر یہ رسم اتنی عام کیوں ہے سوچنا ہوگا	تری باہوں میں باہیں ڈال دینا میری عادت ہے

روش کے رنگ میں کہنا غزل مشکل ہے مینائی
یہ طرز شاعری الہام کیوں ہے سوچنا ہوگا

سمندر دریا اور طوفان

نظم

یہ خوابوں کا جزیرہ یہ پری زادوں کا گہوارہ
کئی برسوں سے اک ویران صحرا بڑھتا جاتا ہے
کوئی طوفانِ برق و باد آئے گا گلستاں میں
ہوا ساکت ہے اک تاریک سایا بڑھتا جاتا ہے

یہ دل کا شہر قبرستان بن جائے گا یادوں کا
کبھی تقدیر کے اپنے بھی کتبے پڑھ لئے ہوتے
گلوں کی فصل آنے تک چمن کا حشر کیا ہوگا
کتا بیں پڑھ نہیں سکتے تو چہرے پڑھ لئے ہوتے

اب اس کے بعد کیا ہوگا یہ کوئی کہہ نہیں سکتا
سمندر کو دل دریا نے اک موجِ بلا دے دی
زمین ایشیا کا پاسباں بن کر جو ابھرا تھا
اسے اربابِ مکر و فن نے پھانسی کی سزا دے دی

نوائے کارگر بخشی متاعِ جسم و جاں دے دی
فلک سے توڑ کر اہل زمین کو کہکشاں دے دی
ہم اس کو بھول جائیں ہم سے ایسا ہو نہیں سکتا
وہ جس نے بے نواؤں کو بھی جرات کی زباں دیدی

۲۳۰
 قطعاً کھیت جلتے ہیں باغ جلتے ہیں نامرادی کے داغ جلتے ہیں
 جشن آزادی وطن کی قسم خوں دل سے چراغ جلتے ہیں

مجھ سے روشن مجھ سے تابندہ جبین ایشیا میری قسمت نور کے ساپنوں میں ڈھلنا چاہئے
 جنت کشمیر ہوں میں نو بہار ایشیا میری وادی سے بھی ایک سورج نکلنا چاہئے

اشفاق حسین - رمز

اشفاق حسین رمز شاہجہاںپوری تقسیم ہند کے بعد پاکستان ہجرت کر گئے جہاں ان کے کلام کا مجموعہ 'دام خیال' کے نام سے شائع ہوا۔ حضرت رمز نے 'پس منظر' کے عنوان سے اپنے بارے میں مزید کہا ہے کہ انہوں نے اپنی تمام زندگی سادہ گزاری حالات ناسازگار ہونے کی وجہ سے تعلیم مکمل کر سکے مگر طبیعت کا رجحان شروع ہی سے شعر و ادب کی طرف مائل تھا ان کے کرم فرما نبی اللہ درد اور ادارت حسین ادیب نے ایک استاد سے روشناس کرا دیا ان کا نام احمد حسین اور تخلص شوق تھا اور شوق صاحب حضرت نوح ناروی کے شاگرد تھے زبانی کے ماہر تھے۔ رمز نے ان سے اصلاح لینا شروع کر دی مگر بد قسمتی سے شوق صاحب چند ماہ بعد پاکستان ہجرت کر گئے اور رمز صاحب شاہجہاںپور میں رہ گئے ایک دن انہوں نے اپنے ایک دوست پنڈت جگموہن ناتھ روتق سے ذکر کیا۔ پنڈت جی نے ان کو اعتبار الملک حکیم ضمیر حسن خاں صاحب دل شاہجہاںپوری جانشین امیر مینائی کی خدمت میں پیش کر دیا۔ قسمت سے بہت اچھا استاد مل گیا کئی غزلیں استاد کو دکھائیں اس کے بعد استاد نے اپنے ایک شاگرد مولانا عابد حسین عابد کے حوالے کر دیا وہ خود بھی استاد تھے اور نٹو سے زائد شاگرد رکھتے تھے رمز صاحب نے عابد صاحب سے کافی استفادہ کیا تقریباً چار سال عابد صاحب سے اصلاح لی انقلاب زمانہ کہ رمز صاحب کو بھی جانا پڑا اور استاد سے شاگرد جدا ہو گیا۔ پاکستان جا کر رمز صاحب تارک الشعر ہو گئے۔ نئے نئے مسائل درپیش ہوئے پہلے کراچی پھر لاہور کا نہ کو منزل کیا۔ وہاں چند علم دوست اجاب نے انہیں پھر سے شعر و سخن کے چکر میں ڈال دیا۔ رمز صاحب کے مختصر انتخاب کلام پر پیش لفظ شبم رومانی کا تحریر کیا ہوا ہے۔ اس مجموعے میں غزلیں بھی ہیں نظمیں بھی، قطع بھی ہیں اور رباعیاں بھی۔ ایک عدد مثنوی بھی۔ بقول شبم رومانی رمز صاحب بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ انہوں نے اعتبار الملک حضرت

دل شاہجہاں پوری اور ان کے جانشین حضرت عابد شاہجہاں پوری کو اپنا کلام دکھایا ہے اس لئے خاندان دل کی شریفانہ اور مہذب شاعری کا پر تو ان کے کلام میں بھی ملتا ہے رباعیاں اور قطعات برائے بیت ہیں البتہ مثنوی کے تیور کہتے ہیں کہ اگر وہ اس پر زیادہ محنت کریں تو کامیاب ہیں

یہ دلنواز تکلم یہ دلنشیں آواز
وفا و عشق کی دشواریاں اے تو بہ
ڈرانہ پرکشش محشرے مجھ کو اے واعظ
فسانہ دل غمگین کہا ہے جب میں نے
کبھی ہے جور مسلسل کبھی ہے لطف و کرم
نیاز عشق نے دیوانہ کر دیا مجھ کو

تمہارے حسن کی ہر اک ادا ہے روح نواز
مری نگاہ سے گزے بہت نشیب و فراز
مری نگاہ میں ہے رحمت نگاہ نواز
فضا میں گونج اٹھی باز گشت کی آواز
طلسم راز ہے اب تک تمہاری فطرت ناز
ہر ایک نقش قدم پر جھکی جیس نیاز

مال ایسے فسانے کا رمز کیا کہیے
وہ جس کا صبح قیامت سے کم نہیں آغاز

متفرق اشعار

دور طوفاں سے سفینہ ہے کہ طوفاں سے قریب
اب نہ بستی کی تمنا ہے نہ ویرانے کی
مرے پاس بیٹھتا ہے کوئی رُخ بدل بدل کر
کچھ تم سے بدگماں ہیں تو کچھ آسماں سے ہم
کہ آج رنگِ حادست یار تک پہنچا
ہوسکا تو حضرت ناصح کو سمجھائیں گے ہم

دل بیتاب اب اتنا بھی تو احساس نہیں
نگہ شوق کو ہے اک نئے عالم کی تلاکش
کبھی اس طرف ہیں نظریں کبھی اس طرف ہیں نظریں
دونوں کا ایک طرز ہے دونوں کی ایک جو
یہ کس کا خون ہوا کون دار تک پہنچا
عشق کی فطرت تو ہے بیگانہ سودوزیاں

رباعی

مخور ہواؤں کی قسم کھاتا ہوں
معصوم اداؤں کی قسم کھاتا ہوں

رنگیں فضاؤں کی قسم کھاتا ہوں
شکوے نہیں مجھ کو ستم بیچلکے

قطعہ

پردہ داری مدام کرتا ہوں
میں ترا احترام کرتا ہوں

مجھ کو معلوم ہے تیری فطرت
چپ ہی بہنے دے مجھ کو اے واعظ

شیخ فیض الدین - اثر

شیخ فیض الدین اثر علقہ باقرزئی کے رہنے والے اور قوم کے نوربان تھے۔ شاعری کا جب شوق ہوا تو حضرت بہادر علی قادری سے مشورہ سخن لینے لگے مگر کچھ مدت احسان شاہ پھانپوری کے شاگردوں میں شامل ہو گئے علمیت کم تھی مگر صاف کہتے تھے۔ ان کا زمانہ بیسویں صدی کی ابتدا کا تھا۔ نمونہ کلام ذیل میں درج ہے۔

وہی ہے دل جو محبت میں بیقرار رہے	وہی ہے آنکھ کہ جس میں کچھ انتظار ہے
نمائیں گے کبھی واعظ یہ مسئلہ تیرا	شراب عشق بھی پی کر گناہگار رہے
عدو بھی ہم کو جھڑکنے لگے خدا کی شان	تھارے عشق میں کیا کیا ذلیل و خوار ہے
ہمارا ساتھ دیا رنج و غم نے خوب اثر	شب فراق یہی دونوں نمگسار رہے

تیرا آتا ہے تو پہلو کی طرف آتا ہے	تاک لیتے ہیں وہ کس طرح نشاناد دل کا
پاؤں سے ملتے جب دل کو تو فرماتے ہیں	ہم کو یوں آتا ہے مٹی میں ملانا دل کا
اس میں بھی ہے مرے دشمن کی کوئی چال ضرور	تیرے کوچے سے تعجب ہے پھر آنا دل کا

کہتے ہیں جب ظلم پر آئیں گے ہم	عاشقوں سے خاک چھنوائیں گے ہم
چھوڑ کر تنہا نہ جائے آرزو	جب اکیلے ہوں گے گھبرائیں گے ہم

ثبات علم و تحمل سے کوہسار ہوں میں	کوئی اٹھا نہیں سکتا جسے وہ بار ہوں میں
جو حال کہتا ہوں اپنا تو نیند آتی ہے	وہ درد دل کو بھی سنتے ہیں داستاں کی طرح

شاہ محمد ہاشم - ہاشم

شاہ ہجہا پور کے رہنے والے صوفی منش اور صوفی مزاج تھے لباس فقیرانہ پہنتے تھے بوجہ شوق یاد الہی تعلقات دنیا سے گوشہ گیری اختیار کر کے تنہائی میں پڑے رہتے تھے۔ بڑے قانع اور متواکل تھے۔ حضرت شاہ ولدھا بلگرامی نور اللہ مرقدہ کے دستِ حق پرست پر بیعت کر کے دنیا و مافیہا پر لات ماردی تھی مگر اس کے باوجود شعر گوئی کی طرف بہت مائل تھے۔ نہایت خوشنوائی اور رنگین ادائیگی سے شعر کہتے تھے جس سے تصوف کا رنگ ٹپکتا تھا اور بخار میں حقیقت کا لطف آجاتا تھا۔ لائبریری نے آپ کی سکونت کا محلہ تحریر نہیں کیا اور نہ نسب کی بابت کچھ لکھا۔ مبلغ علم و فضل سے بھی بے خبر رکھا۔ تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ ہاشم سید تھے اور فارسی کے فاضل تھے محلہ بایزید خیل یا ضیاء خیل کے ساکن تھے۔ چند اشعار مل گئے ہدیہ ناظرین کیے جاتے ہیں۔

اشعار

تاج من از کاسہ سر تخت من روئے زمین
بہوئے روئے تو مردہ ام سر خود بکویے تو بردہ ام
آپکی وفات کا سن بھی لاعلمی میں ہے۔

تکیہ ام پہلوئے خویش و فرش خاک و خون بس است
نہ بیچ سوئے گریز من نہ بہ بیچ سوئے سرے مرا

منشی عبدالقدوس - بیدل

منشی عبدالقدوس بیدل محلہ محمد زئی کے ساکن اور شاہ ہجہا پور کے قدیمی باشندے تھے۔ اردو فارسی کا مذاق اچھا تھا۔ ہوا اسٹیٹ میں نائب بخشی تھے بعد ملازمت و شیعہ نویسی کا پیشہ اختیار کیا تقریباً پندرہ سال ہوئے کہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ نمونہ کلام گلستانہ زبان اردو بابت فروری ۱۹۱۱ء سے منقول ہے۔

وعدہ وصل کو پھر کل پہ اٹھا رکھا ہے
آپ کو بانی بیداد کہیں گے اب سے

تم نے بے فائدہ جھگڑا یہ لگا رکھا ہے
سوچ کر ہم نے بھی نام آپ کا کیا رکھا ہے

جائے جبرت ہے کوئی اس کا خریدار نہیں
 مثل آئینہ دل اہل سفر کھا ہے
 ہجر میں دل کے پہلنے کے لیے اے بیدل
 ان کی حسرت کو کلیجے سے لگا رکھا ہے

منشی پیارے لال پذیر تلہری

منشی پیارے لال پذیر، شاہجہانپور کے معروف قصبہ تلہر کے رہنے والے تھے۔ پیشہ
 مدرسہ تھا۔ قصبہ شہبازنگر کے ایک مدرسہ میں مدرس تھے۔ ابوالخیاں نواب ناظم علی خاں ہجر کے شاگرد
 تھے۔ آپ صاحب دیوان شاعر تھے، تحفہ عشق، آپ کے انتخاب کلام کا نام ہے۔ خاندانی حالات
 کا پتہ نہ چل سکا۔ غزل بطور نمونہ کلام نقل کی جاتی ہے۔

غزل

اس ستمگر کی نرالی شان ہے
 ہر ادا پہ بانگین قربان ہے
 ہے اگر مشکل یہاں آنا ترا
 جان کھو دینا ہمیں آسان ہے
 دیکھ کر روعے منور یار کا
 آئینہ میری طرح حیران ہے
 یوں سوال وصل پر کہنے لگے
 وصل میرا کیا کوئی آسان ہے
 ان کو اپنی جان کہہ سکتا نہیں
 بے وفا ہے جانے والی جان ہے

ہائے دل ہم کس کو دے بیٹھے پذیر
 جو ابھی کم سن ابھی نادان ہے

منشی سخاوت حسین سخا

قصبہ تلہر ضلع شاہجہانپور کے ساکن تھے۔ حضرت ناطق لکھنوی کے شاگرد تھے۔ اردو
 فارسی کے علاوہ بقدر ضرورت انگریزی بھی جانتے تھے۔ تلاش معاش کے سلسلے میں زندگی کا

نمونہ کلام

کھل گئیں زرگس کی آنکھیں چشم جاناں دیکھ کر
وہ شب وعدہ میرے گھر آئے واپس کیوں پھرے
زندہ رکھا ہے کسی کی آرزو نے ہجر میں
ہوش سنبل کے اڑے زلف پریشاں دیکھ کر
چرخ شاید جل گیا عشرت کا سماں دیکھ کر
ورنہ مجھ میں دم کہاں تھا شام ہجران دیکھ کر

ہو کے برہم دفتر عالم نہ برہم کیجیے
وقت آخر ہاتھ سینے پر جو کھینچ کر آگئے
وہ بھی بھکی آگئی جو تھی مال داستان
دیکھ کر ایمانے فطرت دل کو یہ کہنا پڑا
جو ورق ہے میری ہستی کا وہی کم کیجئے
مدعا یہ ہے کہ اپنا آپ ماتم کیجئے
اب ارادہ ہے کہ کم افسانہ برہم کیجئے
حسن ہی کو کار فرمائے دو عالم کیجئے

منشی عبدالحفیظ عیش

منشی عبدالحفیظ عیش شاہجہانپور کے قدیمی باشندہ اور شہر کے مشرقی حصہ موسومہ بہ لودی پور
میں رہتے تھے۔ علم و ادب سے دلچسپی تھی۔ شعر بھی موزوں کرتے تھے مگر یہ نہ معلوم ہوسکا کہ کس کے
شاگرد تھے۔ اشعار سے مشاقی جھلکتی ہے۔ نمونہ کلام پیش کیا جاتا ہے۔

وہ پری یا حور یا انسان ہے
دین و ایماں لے چکے دل لے چکے
میں کروں شکوہ تمھارا غیر سے
اب ترے بیمار ہیں باقی ہے کیا
ہائے کب آئے عیادت کے لیے
ہاں زباں دانی بہت مشکل ہے عیش
عقل جس کو دیکھ کر حیران ہے
اب مری جاں اور کیا ارمان ہے
سب غلط سب جھوٹ سب بہتان ہے
چند ساعت کا فقط مہمان ہے
نبض جب ساقط ہے لب پہ جان ہے
شعر کہہ لینا تو یوں آسان ہے

اس شوخ نے جو ناز سے ترچھی نگاہ کی
آواز ہر طرف سے اٹھی آہ آہ کی

تھوڑی سی خاک اڑا کے دکھا دینا نامہ بر
 اے شمع بزم اسس تری ہمت پر آفریں
 پوچھیں جو وہ خبر مرے حال تباہ کی
 جل جل کے بجھ گئی مگر اصلا نہ آہ کی
 سن کر سوال وصل کہا بھی تو یہ کہا
 وہ دل لگی بھلی ہے جو ہو راہ راہ کی
 پُرورد ہو کلام نہ کس طرح عیش کا
 کھائے ہوئے ہیں چوٹ کسی کی نگاہ کی

حبیب حسن خاں عرف جگن خاں - حبیب

حبیب حسن خاں حبیب کے والد ماجد کا نام قاسم علی خاں اور محلہ مہمان شاہ کے رہنے والے تھے۔ اردو فارسی سے بقدر ضرورت واقف تھے۔ مولانا ارشد سیما بی مرحوم سے شرف تلمذہ اصل تھا زندگی کا بیشتر حصہ بسلسلہ ملازمت کوٹہ میں گزرا۔ انجمن شیدائے اسلام کوٹہ کے صدر اور بزم اقبال کے سرگرم ممبر تھے۔ بمقام تقریباً پچپن سال بروز جمعرات ۲۰ اپریل ۱۹۷۸ء کو رحلت فرمائی۔

نمونہ کلام

بکھری ہوئی جب ان کی نظر دیکھتا ہوں میں
 تصویر بن گیا ہوں تری جلوہ گاہ میں
 گھبرا کے سوئے قلب و جگر دیکھتا ہوں میں
 یہ بھی خبر نہیں کہ کدھر دیکھتا ہوں میں
 وہ سُکرا رہے ہیں جدھر دیکھتا ہوں میں
 حسن نظر کہوں کہ فریب نظر کہوں

دنیا میں پھونک پھونک کے رکھنا قدم حبیب
 ہر ہر قدم پہ تو شوخ خطر دیکھتا ہوں میں

سید محمد سلطان، سلطان

نام سید محمد سلطان اور تخلص بھی سلطان تھا شاہجہاں پور کے قدیمی باشندے اور مدرسین العلوم شاہجہاں پور میں مدرس تھے۔ شعر و سخن کا بچپن سے شوق تھا۔ سید حسین احمد ماں بیباک تلمیذ حضرت

داغ دہلوی کے طبقہ تلامذہ میں شمار تھا۔ حضرت سلطان کے حالات اس سے زیادہ معلوم نہ ہو سکے۔ نمونہ کلام میں چار اشعار پیش کیے جاتے ہیں کلام بھی اس سے زائد نہ حاصل ہو سکا لیکن اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ کہنہ مشق تھے۔

منہ پر نہ آئے گا کبھی لب تک نہ آئے گا
کس طرح اٹھ سکیں گے فلک کے یہ جور و ظلم
کیوں کرنے مجھ کو اپنے مقدر پہ ناز ہو
کیوں ٹالتے ہیں آپ نہ باتیں بنائے

افشا نہ ہو گا وہ جو مرے دل کا راز ہے
دل ابتدا سے خوگر آنکوش ناز ہے
اس بت سے ان دنو مجھے حاصل نیاز ہے
آنکھیں بتا رہی ہیں جو پوشیدہ راز ہے

منشی شفیع اللہ خاں - شفا

جناب منشی شفیع اللہ خاں شفا انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں اپنے آبائی مکان واقع محلہ گاڑی پورہ میں ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ حسب رواج محلے کے مدرس میں تعلیم پائی۔ اردو فارسی سے واقف تھے۔ سن شعور کو پہنچنے تو معاشی مسائل میں گھر گئے میونسپل بورڈ میں بطور منشی ملازمت کر لی۔ طبیعت موزوں پائی تھی۔ شعر و شاعری کا شوق پیدا ہو گیا حضرت اسعد شاہ جہا پوری کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہو گئے۔ شعر اچھا کہتے تھے۔ کلام بہت تھا مگر ورثہ کی لاپرواہی سے تلف ہو گیا۔ ایک مشاعرے کی روداد سے کلام دستیاب ہو گیا جو بدیہ ناظرین ہے۔ شفا ۱۹۵۰ء سے قبل رحلت فرما چکے تھے۔

نمونہ کلام

میرے پہلو سے وہ ظالم جان دل لے کر اٹھا
ہیں ترقی پر کوششے اس نگاہ شوخ کے
رہتی ہے تاثیر ہر دم منتظر فریاد کی
بحر عالم میں نہ ہو گا کوئی مجھ سا نامراد

ناز سے فتنہ خرام ناز سے محشر اٹھا
اب ترا اقبال اے چرخ ستم پرور اٹھا
نالہ زیر لب ادھر آیا ادھر محشر اٹھا
فوج طوفان خیز اٹھی کشتی کا جب ننگر اٹھا

میکدے میں جب کبھی میں نے شفا رکھا قدم
میرے استقبال کو شیشے اٹھے ساغر اٹھا

حسن کے ناز اٹھانا کوئی دشوار نہ تھا
ان کی بیباک نگاہوں نے دیئے ہیں آزار
غیر سے وصل کا اقرار شفا سے انکار
زار تو تھا مگر ایسا بھی دل زار نہ تھا
پہلے دل دردِ محبت سے خبردار نہ تھا
تجھ سا عیار کوئی لے بت عیار نہ تھا

مولوی مفتی سید محمد مہدی حسن - آزاد

مولوی سید محمد مہدی حسن سادات غوثیہ سے ہیں والد کا نام سید محمد کاظم حسن ابن سید فضل اللہ ابن سید محب اللہ ابن قطبی میاں ابن سید درویش صاحب ابن حضرت شہاب الدین سید احمد صاحب ہے۔ ابتدائی تعلیم مدرسین العلوم شاہجہانپور میں پائی اور سند فضیلت کے لیے مدرسہ امینیہ دہلی میں اکتساب علم کیا۔ بعد فراغت نائب مدرس رہے۔ ۱۳۳۸ھ میں دستار بندی حضرت مولانا محمود الحسن صاحب کے بابرکت ہاتھوں سے دیوبند میں ہوئی۔ ٹونک اور سرونج کے مدارس میں مدرس اول رہے۔ آپ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے بیعت تھے۔ راندر میں مفتی اعظم کے عہدہ جلیلہ پر سرفراز رہے۔ علمی شہرت کے سبب مختلف مقامات سے آپ کو اعلیٰ ترین دینی عہدوں کی پیش کش کی گئی مگر آپ کی قناعت پسند طبیعت نے گوارا نہ کیا۔ ایک زمانے تک دہلی میں رہ کر آپ وطن واپس آ گئے۔ نہایت ذی استعداد اور وسیع النظر عالم تھے۔ عربی اور اردو میں آپ کی بہت سی تصانیف مختلف علوم و فنون میں طبع ہو چکی ہیں۔ ادبی ذوق بھی تھا اور آپ بحیثیت شاعر بھی ایک مقام رکھتے تھے۔ نواب ناظم علی خاں، ہجر مشہور استاد کے شاگرد تھے

نمونہ کلام

اس جہان پر فتن سے جو دل مضطر اٹھا
عاشق شیدا ہو یا پروانہ ہو یا شمع ہو
موت اس کی ہے جو بیٹھا ہاتھ پاؤں توڑ کر
قطع کی ہے راہ الفت اس ہجومِ صعوت پر
اس تجاہل کے میں قرباں پوچھتے ہیں مجھ سے
بعد مردن ہوگی لے آزاد آزادی نصیب
کوئی غم لے کر اٹھا کوئی الم لے کر اٹھا
جو اٹھا اس بزم سے وہ جان ہی دے کر اٹھا
دہر میں زندہ ہے وہ جو اپنے پیروں پر اٹھا
ہر قدم پر میں نے کی منزل گر اگر کر اٹھا
تیرے دل میں درد یہ کیوں کہہ ہو کیونکر اٹھا
اس بہار بے حزاں کا لطف تو مگر اٹھا

بابو مکٹ بہاری لال۔ حرماں

بابو مکٹ بہاری لال شاہجہانپور کے قدیم باشندہ اور محلہ رنگ محلہ کے رہنے والے تھے۔ اردو فارسی زبانوں کو حسب رواج قدیم سیکھا تھا۔ شاعری کا طبیعت میں مذاق تھا جناب حکیم رگھبیر سہا کے بریائیں و شاداں جہاں آبادی کے شاگرد تھے۔ حرماں کے پوتے بابو اونکار سہا سے میکش شاہجہانپور کے جانے پہچانے شاعر ہیں۔ کلام رسالہ زبان اردو بابت ماہ دسمبر ۱۹۱۲ء سے منقول ہے۔ دو شعر رسالہ میں شائع ہوئے ہیں وہی پیش خدمت ہیں۔

طرز و فائن بات کوئی رسم و راہ کی
آتی نہیں نظر مجھے صورت نباہ کی
انجام کار اس دل خانہ خراب نے
دریائے عشق میں مری کشتی تباہ کی

منشی چھیدا لال۔ شیدا

منشی چھیدا لال شیدا شاہجہانپور کے رہنے والے تھے۔ اردو فارسی سے بخوبی واقف تھے اور شعر و شاعری کا شوق تھا۔ اب سے چالیس سال قبل راقم الحروف نے خود ان کو مشاعروں میں پڑھتے ہوئے دیکھا مگر یہ نہیں معلوم کس کے شاگرد اور کس محلے کے رہنے والے تھے۔ شاہجہانپور کے قدیم باشندہ تھے اور آباؤ اجداد کا یہی وطن تھا۔

نمونہ کلام

خیر اتنی ہوئی وہ مائل اصرا نہ تھا	ورنہ زاہد کو بھی مئے پینے سے انکار نہ تھا
رونق افروز ہو جب وہ بدل کر پوشاک	اہل محفل کے گریباں میں کوئی تار نہ تھا
بے کسی ہیں جو نظر کی شب غم اے شیدا	غم جاناں کے سوا کوئی بھی غم خوار نہ تھا

جو اٹھا بالیں سے میری کچھ اثر لے کر اٹھا
کوئی افسردہ کوئی گریباں کوئی مضطر اٹھا

غیر کو ساغر پہ ساغر بزم میں اس نے دیئے میں دفور رشک سے خون جگر پی کر اٹھا
 درہم و برہم ہوئی ناگاہ دنیا سے قرار یہ نگاہ شوخ اٹھی یافتہ محشر اٹھا
 سیکڑوں فتنے اٹھے آئے ہزاروں انقلاب
 آستان یار سے شیدا نہ اپنا سراٹھا

حضرت ممتاز اللہ خاں۔ ممتاز

جناب ممتاز اللہ خاں صاحب کے والد ماجد مرحوم کا نام احمد اللہ خاں ساکن محلہ بابوزئی شاہجہانپور تھا آپ کی تاریخ پیدائش ۹ فروری ۱۹۰۹ء ہے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم گھر میں ہوئی۔ ایک معلم سے فارسی اور اردو پڑھی۔ ۱۹۲۶ء اردو مڈل اول درجہ میں پاس کیا اور مشن اسکول میں داخلہ لے کر انگریزی کی تعلیم آٹھویں کلاس تک حاصل کی۔ محکمہ پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف میں کئی سال تک براؤنچ پوسٹ ماسٹری کی رہے۔ ۱۹۳۶ء میں میونسپل بورڈ کے محکمہ تعلیم میں مدرس پر تقرر ہوا۔ ۱۹۵۱ء میں بی۔ بی۔ ٹی۔ سی کی سند لی۔ ۱۹۵۲ء میں ہیڈ ماسٹری پر ترقی پائی۔ ۱۹۵۳ء میں ہندی مڈل کا امتحان دیا اور سکندڑویشن میں کامیاب ہوئے۔ ۱۹۶۹ء میں پنشن لے لی لیکن ایک دینی مدرسہ بحر العلوم میں مدرس کی جگہ پر تقرر ہو گیا تھا۔

شاعری کا شوق اوائل عمری سے تھا۔ ۱۹۲۶ء سے حضرت مولانا اسعد شاہ جہانپوری سے مشورہ سخن کیا۔ آپ کا شمار حضرت اسعد کے ممتاز تلامذہ میں ہوتا تھا۔ مقامی اور بیرونی مشاعروں میں شرکت کرتے رہے۔ ۱۹۵۱ء کے ہند پاک مشاعرہ دہلی میں اپنی کامیاب غزل پر کپ انعام کیا گیا۔ ریاست پوایاں ضلع شاہجہانپور کے آل انڈیا مشاعرے میں آپ کی کامیاب غزل پر راجہ صاحب نے سونے کا تمغہ آپ کو عنایت کیا۔ ممتاز صاحب اپنے دور میں نہایت ممتاز شاعروں میں گنے جاتے تھے۔ آپ کا ترنم اور تجت اللفظ دونوں کا انداز غضب کا تھا۔ بوجہ ضعیفی اور مصروفیت شاعری ترک کر دی تھی۔ درس و تدریس سے جو وقت بچتا یا خدا میں صرف کرتے تھے۔

۱۹۸۶ء میں طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ اولاد میں صرف دختر ہے۔ نمونہ کلام

نذر قارئین ہے۔

ہائے وہ منظر کہ بے پردہ جمال یار تھا
کار فرما باغ میں بھی کیف چشم یار تھا
برسوں پھولوں کو دیئے بو سے نگاہ شوق نے
کر وٹیں لینے لگی تھیں دل کی مردہ حسرتیں
اب یہ کیسی بے رخی وہ دور ماضی یاد کر
میرا دل بھی تیری زد میں اے نگاہ یار تھا
ذره ذرہ جلوہ گاہ ناز کا بیدار تھا
جو کلی تھی مست تھی جو پھول تھا سرشار تھا
کس قدر رنگیں فریب نقش پلے یار تھا
سحر اثر کتنا فریب التفات یار تھا
ہجر کی راتیں گزاریں اس طرح ممتاز نے
چاند کی جانب نگاہیں تھیں خیال یار تھا

کیف خودداری سے ہیں اب بے خود متانہ ہم
ٹوٹے پڑتے ہیں ہر اک ذرہ پہ بیتا بانہ ہم
مرجا جو شش وفادنیہ اثر لینے لگی
یہ تغیر بھی ہے تکمیل تماشہ کی دلیل
ہم وہ غم دیدہ ہیں کیا ہوش و خرد کیا ننگ و نام
کھیل ہے ممتاز اب ہر امتحان آرزو
ہو نہیں سکتے وفاد عشق سے بیگانہ ہم
لائے رضواں تو نہ ہوں منت کشں پیمانہ ہم
لے کے آئے ہیں ازل سے فطرت پروانہ ہم
سرخ افسانہ، چشم خونچکاں، افسانہ ہم
ہو گئے آخر مذاق دید سے بیگانہ ہم
اک تبسم پر ٹادیں سب مستاع خانہ ہم
کھیل ہے ممتاز اب ہر امتحان آرزو
ہو نہیں سکتے وفاد عشق سے بیگانہ ہم

سید احمد حسین صاحب - شوق

سید احمد حسین صاحب شوق ساکن شاہجہاں پور نواب ناظم علی خاں ہجر کے شاگرد تھے۔
ہجر صاحب کے رسالے زبان اردو کے مینجر اور ناشر بھی تھے اس سے زیادہ حالات کا پتہ نہیں
چل سکا۔ آپ کا کلام رسالہ 'جلوہ یار' بابت ماہ ستمبر ۱۹۱۰ء سے منقول ہے۔ جلوہ یار میرٹھ
سے بہ نگرانی صوفی خواجہ محمد اکبر خاں صاحب اکبر وارثی و جناب منشی برکت شیر خاں صاحب ادیب
شائع ہوتا تھا۔

ایسے بیہوش ہوئے شور مچانے والے
میں تری بزم سے یوں تو نہ اٹھوں گا ہرگز
روٹھنا آپ ہی پھر آپ ہی من بھی جانا
کم نگاہی ہے تری شرط محبت کے خلاف
کبھی الفت کی نگاہیں تو کبھی پیار کی آنکھ

تا قیامت نہیں اب ہوش میں آنے والے
کون ہوتے ہیں عدو مجھ کو اٹھانے والے
یہی انداز تو ہیں دل کو لہجانے والے
دل مرا پھیر دے او آنکھ چرانے والے
یوں مرے دل کو لہجاتے ہیں لہجانے والے

اشعار ماخوذ از زبان اردو بابت ماہ مئی۔ جون ۱۹۱۰ء

کیوں وصل بت ماہ لقا ہونہیں سکتا
ہم چاہیں تو دشوار ہے آسان نہیں ہے
تم اور شب وعدہ چلے آؤ میرے گھر
افت ہے بڑی چیز بڑی چیز بڑی چیز
مشکل تو یہ ہے وہ نہیں سنتے نہیں سنتے

سچا ہو اگر عشق تو کیا ہونہیں سکتا
تم چاہو اگر دل سے تو کیا ہونہیں سکتا
یہ ہونہیں سکتا بخدا ہونہیں سکتا
اس کا کبھی انجام بھلا ہونہیں سکتا
رونا تو یہ ہے میرا کہا ہونہیں سکتا

منشی مقبول حسن خاں کیف

منشی مقبول حسن خاں نام اور کیف تخلص تھا۔ شاہجہانپور کے باشندہ تھے۔ ان کا
زمانہ شعرائے شاہجہانپور کے تیسرے دور کا زمانہ معلوم ہوتا ہے۔ زیادہ حالات نہ دستیاب
ہوسکے۔ نمونہ کلام ایک مشاعرے کی روداد سے نقل ہے جو ۱۹۳۲ء میں پنڈت جگموہن ناتھ
رینہ شوق نے کل ہند سطح پر منعقد کرایا تھا۔

خط قسمت بدل جانا بہت مشکل سمجھتے ہیں
ادھر عجز و نیاز اور اس طرف وہ شان استغنا
دم آخر سر بالیں خدارا جلوہ فرما ہو
قیامت تک تمنا دید کی نکلے یہ ناممکن
جفاؤں پر جفائیں ہوں نہ ہولب آشنا شکوہ
خدا حافظ ترانے کشتی دل اب خدا حافظ

ہر اک تدبیر کو اک سعی لا حاصل سمجھتے ہیں
ان اسرار محبت کو کچھ اہل دل سمجھتے ہیں
کہ آساں ہو وہ مشکل سب جسے مشکل سمجھتے ہیں
ادارے بے جبابی پردہ مائل سمجھتے ہیں
یہ آئین وفا ہیں ان کو ہم اے دل سمجھتے ہیں
اطبار نبض کو موج لب ساحل سمجھتے ہیں

ہمیں بھی دیکھنا ہے تاکہ یہ رنگ استغنا
وہ کب تک بے اثرے کیف جذب دل سمجھتے ہیں

عبدالجمیل خاں - جمیل

عبدالجمیل خاں صاحب بنگش جمیل ابن فرخ محمد خاں ابن علی محمد خاں بانی فرخ آباد نواب
محمد خاں بنگش کے سلسلہ نسب سے ہیں۔ اردسمبر ۱۹۱۲ء کو موضع امیٹھی جدید تحصیل صدر ضلع فرخ آباد
اپنے آبائی وطن میں ولادت ہوئی۔ الہ آباد یونیورسٹی سے اعلیٰ قابل اور منشی کے امتحانات پاس کئے۔
اور انگریزی اسکول سے ہائی اسکول کیا۔ بسلسلہ ملازمت ۱۹۵۴ء میں واردشا، بھہانپور ہوئے
اور تقریباً ۲۸ سال سے مقیم ہیں۔ جولائی ۱۹۶۴ء میں اسٹنٹ ویکسی نیشن سپرنٹنڈنٹ کے عہدہ
سے ریٹائر ہوئے اور اسی شہر کے مستقل شہری کی حیثیت سے بفرغت زندگی گزار رہے ہیں۔
شاعری کی ابتداء ۱۹۳۰ء سے ہوئی حکیم عبدالعلی خاں۔ بسمل اور حضرت حفیظ مجیبی فرخ آبادی سے
مشورہ سخن اور استفادہ کیا۔ اپنے چون سالہ مشق سخن میں ہر ایک صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے
'افکار جمیل' کے نام سے انتخاب کلام زیور طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے۔ نمونہ کلام

طبع میں آشفنگی ہے آج کل	موسم دیوانگی ہے آج کل
دور جان زندگی ہے آج کل	جان پر گویا بنی ہے آج کل
باعث تغیر حال دل نہ پوچھ	وہ نظر بدلی ہوئی ہے آج کل
کیا کیوں کیوں کر کہوں کس سے کہوں	گفتنی نا گفتنی ہے آج کل

بے نیاز فکر فروا ہے جمیل

ان سے گاڑھی چھن رہی ہے آج کل

کل اس جان تننا کے تلون کا یہ عالم تھا	گھر ہی بھر میں وہ شعلہ تھا گھر ہی بھر میں وہ شبنم تھا
نہ دکھائے خدا دشمن کو بھی صدرے جدائی کے	ادھر افسردہ دل وہ تھے ادھر میں چشم پر نم تھا
بڑی پڑھول تھیں تہنایاں صحرائے اُلفت کی	جہاں کو سوں نظر میں کوئی مونس تھا نہ ہدم تھا

وہ جس نے بن کے خضر راہ مجھ کو راہ دکھلائی وہ میری سعی پیہم تھی وہ میرا عزم محکم تھا
جمیل بے نوا چرچے تھے جس کی بے زبانی کے
کل اس کے سوگواروں پر خموشی کا اک عالم تھا

ماسٹر شانتو سنگھ - بارق

ماسٹر شانتو سنگھ بارق شہانپور کے قدیمی باشندہ تھے۔ اردو فارسی سے بخوبی واقف
تھے مقامی اسکول میں مدرس تھے۔ دو ایک بزرگ شعرا کا گمان ہے کہ حضرت اسعد شاہ جہانپوری
کے تلامذہ میں شامل تھے مگر یہ مصدقہ نہیں ہے۔ کلام ایک روداد مشاعرہ سے منقول ہے۔
کبھی اک جوش و حشت سے زمانے میں تلام تھا سبق آموز خاموشی ہے اب گور غریباں پر
عدم سے کوئی دم کے واسطے آتے ہیں دنیا میں انہیں لمحوں میں کیا کیا کچھ گزر جاتی ہے انساں پر
ہو اناصح کے سمجھانے کا مجھ پر یہ اثر آخسر کہ دل کا فیصلہ چھوڑا بلکہ جان وایساں پر
کہاں کے آہ و نالے جوش کیسا ولولے کس کے نگاہ ناز نے بجلی گرا دی خسر من جاں پر
عیوض اغیار کے مجھ پر ستم ہونے لگا بارق
کرم پر ہے کرم اس بت کا اک حسان احساں پر

بجا ہے قدر کیا اس چیز کی جو مفت ہاتھ آئے مگر قیمت دل مضطر کی کچھ بے دل سمجھتے ہیں
کوئی بیتابی دل پوچھے ایسے جان فروشوں سے کہ جو قاتل کے ہر انداز کو قاتل سمجھتے ہیں
نہ پوچھو ہم سے وصل یار میں اور جان دینے میں کسے آساں سمجھتے ہیں کسے مشکل سمجھتے ہیں
وہ مجنوں ہیں کہ ہم اپنے ہی نقش پا کو وحشت میں نشان کاروان صاحب محل سمجھتے ہیں

جب سے طاری مجھ پہ اے ساقی ہے از خود رفتگی تیرے صدقے پھر وہی میرے لئے ساغر اٹھا
پوچھنا صح اس سے جس کے جمع ہوں ہوش و حواس کیا خبر یہ درد دل میں کب اٹھا کیوں کراٹھا
آخری منزل تھا گویا میرا تھک کر بیٹھنا مثل نقش پانہ پھر اپنا تن لاغراٹھا

دور گردوں کہہ دیا ہے یوں بہ آواز دہل خاک میں چھوڑا ملا کر اس کو جس کا سراٹھا

سید ارشاد حسین عرف پیارے میاں رشید

شہر شاہجہانپور کے ایک باعزت و عظمت بزرگ سید اسرار حسین کے فرزند عالیجناب سید ارشاد حسین عرف پیارے میاں رشید ممتاز شعرا کی صف اولین کے شاعر تھے۔ ماہ فروری ۱۹۱۳ء میں ولادت ہوئی۔ اندرون خانہ تعلیم و تربیت کے بعد مدرسہ عین العلوم میں داخل ہو کر اکتساب علم کیا۔ عربی و فارسی میں مولوی۔ عالم۔ فاضل اور کامل کے اعلیٰ ترین امتحانات میں امتیاز حاصل کیا اور انٹرمیڈیٹ تک انگریزی پڑھی۔ معاشی مسئلے کے حل کے لئے آرڈیننس کلوڈنگ فیکٹری شاہجہانپور میں ملازمت مل گئی۔ اپنے فرائض منصبی بحسن و خوبی انجام دے کر آفس سپرنٹنڈنٹ کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور خانہ نشین ہو گئے مگر خانہ نشینی میں بھی سیمانی طبیعت نے بیٹھنے نہ دیا علمی و ادبی تحقیق کے کاموں میں مصروف رہے۔ حضرت رشید حکیم حبیب الرحمان خاں حبیب کے شاگرد تھے۔ کچھ مدت بعد حکیم صاحب موصوف نے اپنے پیشہ ورانہ اور سیاسی انہماک سے مجبور ہو کر پیارے میاں رشید اپنے لائق شاگرد کو اپنے استاد حضرت مختار احمد میاں مختار شاگرد حضرت امیر مینائی کی خدمت میں رہبری اور مشورہ کے لئے حاضر کر دیا۔ جناب مختار کے پاکستان ہجرت فرمانے تک حضرت رشید استاد کے دامن فیض سے وابستہ رہے بعدہ خود اعتمادی نے رہنمائی کی اور مشق و مطالعہ سے اپنا ایک بلند مقام بنا لیا۔ فن شاعری پر عبور حاصل ہو گیا۔ تشنگان علم و فن چاروں طرف سے آ کر آپ کے گرد جمع ہو گئے۔ ۱۹۶۸ء میں جناب اشرف علی خاں شاہجہانپوری حال مقیم علی گڑھ سابق کلکٹر و ڈسٹرکٹ میجسٹریٹ کی ترغیب پر علی گڑھ منتقل ہو گئے جہاں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں ایڈمنسٹریٹو آفیسر کے جلیل القدر عہدے پر فائز کر دیئے گئے مگر کانفرنس کو آپ کی تنظیمی صلاحیتوں سے استفادے کا زیادہ موقع نہ ملا۔ ۴ مارچ ۱۹۸۱ء کو یکایک دل کا دورہ پڑنے سے رحلت فرما گئے نعش شاہجہانپور لا کر دوسرے دن اپنے آبائی قبرستان میں دفن کر دی گئی۔ آپ کی کسبھی اولادیں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور اچھے اچھے عہدوں پر سرفراز ہیں۔ پیارے میاں رشید مرحوم و مغفور نہایت مرنجان مرنج صاحب مروت، خوش اخلاق اور وضعدار بزرگ تھے۔ خدمت خلائق میں بہت دلچسپی

تھی۔ ہر صنف شاعری پر طبع آزمائی فرماتے تھے لیکن غزل ان کی شاعری کا خاص میدان تھا۔ ان کے تلامذہ میں چند ایسی شخصیات بھی ہیں جن کو برصغیر ہندو پاک عزت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اپنے پیچھے شاعری کا بڑا ذخیرہ چھوڑا۔ کلیات رشید جلد ہی زیور طباعت سے آراستہ ہو کر ارباب فکر و دانش سے داد وصول کرے گی۔ حضرت پیارے میاں رشید کے بعد شاہجہانپور میں فن شاعری کے ماہرین کا قحط نظر آتا ہے۔ حضرت عبدالسمیع ناں کہنت کی حالیہ موت نے اس علمی قحط میں مزید شدت اور سہینا کی پیدا کر دی۔ کاش کچھ مدت یہ بزرگ زندہ رہتے اور پیام اجل اس طرح نہ آتا تو ممکن تھا آپ کی رہنمائی میں کوئی باصلاحیت ان کی جگہ پر کر سکتا لیکن قدرت کے حکم کو ٹالنا کسی کے بس کا نہ تھا۔ نمونہ کلام تذکرہ شاعرانے اثر پر دلش حصہ سوم سے منقول ہے۔

حسین سے حسین بت خرد نے بنائے	جنوں کے پرستار دھوکا نہ کھائے
ترا نقش ہوں جو ترے جی میں آئے	سنوارے بگاڑے بنائے مٹائے
ستم کیا کرم سے بھی گھبرا گیا ہوں	الہی زمانہ مجھے بھول جائے
کہاں اب نگاہ کرم کی بھی طاقت	وہ دیکھو وہ زخم جگر مسکرائے

سرور غم کی عادت ہو گئی ہے	محبت اب محبت ہو گئی ہے
فلک کی دشمنوں کی دوستوں کی	ہمیں پر کیوں عنایت ہو گئی ہے
مری قسمت کی تاریکی بھی شاید	شریک شام غربت ہو گئی ہے
رشید ان کی ہوئی جب جب عنایت	دل دجاں پر قیامت ہو گئی ہے

زہے نصیب کہ یہ اختصاص میرے لیے	حرام ہے ترے غم سے خلاص میرے لیے
عجب نظام ہے یہ عشق کی شریعت کا	نہ خوں بہا ہے نہ اذن قصاص میرے لیے
مجھے کرم سے زیادہ ترا ستم ہے عزیز	وہ اور سب کے لئے ہے یہ خاص میرے لئے

جب حسن تھا اک راز مخفی افشا بھی تو ہونا چاہئے تھا
پھر ذوق طلب کو دیدہ بنیا، ہیر تماشا چاہئے تھا

مصروف تکلم ہوتے کیوں؟ مشتاق تجلی ہوتا کون
 دنیا سے محبت سمونی تھی، آشوب تمتا چاہیے تھا
 عرفان حقیقت مشکل تھا تو شوق حقیقت بخشا کیوں
 بنیاد خودی جب ڈھکانا تھی احساس مٹانا چاہیے تھا

اشفاق علی خاں - اشفاق

محلہ بازید خیل کے افتخار علی خاں کے گھر میں جناب اشفاق علی خاں کی جب ولادت ہوئی تو کس کو
 خبر تھی کہ یہ نوزائیدہ بچہ جوان ہو کر محکم جوہر قابلیت ہوگا۔ ایسا نامور ہوگا کہ مدتوں بھلا یا نہ جاسکے گا۔ جس
 میدان میں اترے گا اپنی مہارت کا لوہا منوالے گا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد مولوی کفایت اللہ مفتی اعظم
 ہند کے حقیقی برادر خورد مولوی نعمت اللہ مدظلہ العالی جو اپنے وقت کے فاضل اجل۔ عالم اکمل۔
 عابد و زاہد اور نہایت خدا ترس بزرگ تھے اشفاق علی خاں کے معلم ہوئے۔ عربی فارسی میں درجہ
 فضیلت حاصل کر کے دہلی یونیورسٹی سے بی۔ اے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم۔ اے (انگریزی)
 ایم۔ اے (فارسی) اور ایل۔ ایل۔ بی کے امتحانات امتیازی شان سے پاس کئے۔ شاہجہانپور
 واپس آکر وکالت شروع کر دی۔ اپنی ذکاوت اور ذہانت کی بدولت قلیل مدت میں شہرت کی سیڑھی پر
 پہنچ گئے۔ سیاست کی طرف مڑے تو ۱۹۵۷ء کے الکشن میں یوں کامیاب ہوئے کہ بزرگ سیاست
 داں انگلشٹ بنداں رہ گئے اس وقت کی اسمبلی میں سب سے کم عمر ایم۔ ایل۔ اے ہی تھے۔ تحریک
 عزت ناموس رسول کی خاطر کئی بار جیل بھی گئے۔ جادو بیباں مقرر اور شاہجہانپور کے مسلم لیڈروں میں
 سرفہرست تھے۔ تصنیف و تالیف کی طرف رخ کیا تو لکھ لکھ کر مسودوں کے انبار لگا دیئے۔

شعر و شاعری کا مادہ طبیعت میں موجود تھا ۱۹۵۲ء میں آغاز شعر گوئی کیا۔ فطری لیاقت نے بہت
 جلد اس قابل بنا دیا کہ ہم عصروں میں خوشگوار و شکر مقال سمجھے جانے لگے۔ شاہجہانپور علم و فضل اور
 شعر و سخن میں آپ کی ذات والا صفات پر فخر کرنے لگا۔ خود کسی کے شاگرد نہیں تھے مگر اشفاق صاحب
 کے شاگردوں کی صف تیار ہو گئی۔ مشاعروں میں غزلیوں کے لئے برابر شریک ہوتے اور واہ واہ کے
 پھولوں سے جھولی بھر کر اٹھتے تھے۔ فکر سخن نہایت رسالتی کاش عین عالم جوانی میں رحلت نہ ہوتی

اور عمر طبعی کو پہنچتے تو کسی کیسی یادگاریں چھوڑ جاتے۔ مرحوم کو ہمیشہ شہادت کی آرزو تھی جو خداوند کریم نے پوری کر دی۔ ۸ دسمبر ۱۹۷۸ء کی شب میں اپنے ہی گھر میں ظالم ڈاکوؤں کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ بڑی بہن نے بھی بھائی کا ساتھ دیا۔ بھائی کو بچانے کی کوشش میں وہ بھی قربان ہو کر درجہ شہادت پانے میں کامیاب ہو گئی۔ دو سکر دن جب دونوں جنازے ایک ساتھ آخری منزل کی جانب بڑھے تو ہزار ہا لوگوں کی آنکھوں سے اشک رواں تھے۔

اشفاق علی خاں صاحب کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف کثیر ہیں لیکن ان کی تفصیل اور ان کے نام مخصوص احباب کو معلوم ہیں ورنہ کتنے ہی مسودات تیار تھے اور طباعت کی منزل تک نہیں پہنچے تھے۔ اردو۔ عربی۔ فارسی اور انگریزی چاروں زبانوں کے ماہر تھے اور ہر زبان میں تصانیف تھیں۔ مرحوم کی نوجوان بیوہ اپنے خوردسال بچے کے ساتھ اپنے مائیکے علی گڑھ چلی گئی سنا ہے جس کی تحویل میں اشفاق صاحب کی نخی لائبریری کی نادر و نایاب کتابیں ہیں۔ مسودات مرحوم کے ایک شاگرد احتشام بن حسن کے قبضے میں ہیں۔ جو علی گڑھ یونیورسٹی میں استاد ہیں۔ ان کی تصانیف میں جگر کی غزلیہ شاعری اور علم بدیع تاریخ و تدوین خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

اشفاق صاحب تصوف کے خلاف تھے اور اس کو توحید کے لئے زہر سمجھتے تھے۔ ایک قطعہ اسی خیال کی ترجمانی کرتا ہے۔

قطعہ

توحید پھر کتاب الہی کی کیوں رہی	جب وحدت الوجود کی سرحدیں آڑی
اے صاحب خصوص کے بیرو خطامعان	قرآن ہے بڑا کہ خصوص الحکم بڑی

چند اشعار پیش قارئین ہیں جو اشفاق صاحب کے زاویہ نظر اور فلسفہ حیات پر روشنی ڈالتے ہیں۔

نظم جہاں ہے نادرست ہاتھ میں لے زمام کار	اپنا خلوص معتبر غیر کا اعتبار کیا
چھین لے بڑھ کے میکہ بندہ میکہ نہ بن	آہ یہ تیکر ہاتھ میں ساغر مستعار کیا

اک جنوں ہے کہ حوادث سے ہے گرم پیکار	اک جنوں ہے کہ الجھتا ہے گریبانوں سے
کم سے کم چادر افلاک ہو پارہ پارہ	وہ جنوں کیا جو بہل جائے گریبانوں سے

میں ڈھونڈ رہا ہوں اپنی منزل بے میری تلاش راہزن کو
 مردان خدا کا شوق بیتاب تحریک عمل ہے اہرمن کو
 دوستی کے معاملے میں وفا کو جزو ایمان کہتے تھے۔ قطعہ ملاحظہ کیجئے۔
 سمجھ کر بزم یاراں کر مرتب کہ ہیں کچھ اہرمن بھی آدمی رو
 اگر اک دوست بھی ہو علفی سا تو ہر دشمن ترے حق میں ہلاکو
 غزلیہ رنگ بھی دیکھیے۔

ہے یہ اعجاز جوش جیا کا بھوٹ نکلی گل تر سے شبہم
 اور مل بیٹھ لیں چاند لہے ہم نشیں پھر کہاں تم کہاں ہم
 آج بھی آپ آخر نہ آئے آج بھی یاد کرتے رہے ہم
 آپ کی اک نگاہ محبت میرے دل کے لئے دولت جم

خداوند ایہ کیا آئین ہے تیری خدائی کا ترا انسان کرے مشق ستم تیرے ہی انساں پر
 شہادت سے کچھ دن قبل اپنی غزل کے مقطع میں یوں پیشین گوئی کر دی تھی۔
 اشفاق ایک شعلہ تھا خاموش ہو گیا
 کیا شک!، خدا نہ کردہ، تمہیں اس خبر میں ہے

اشفاق علی خاں مرحوم کی زندگی میں ان کے شاگرد اور دست راست عزیز مشہود حسن خاں
 ایڈووکیٹ کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اپنے حافظے میں مرحوم کے اشعار محفوظ کر لئے تھے اور
 راقم الحروف کو لکھوا دیئے۔

عبدالماجد محمد میاں - شفق بدایونی ثم شاہجہا پوری

عبدالماجد محمد میاں وارثی شفق سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ستائیسویں پشت
 میں ہیں۔ آپ کے مورث سیدنا عبدالرحمان ثانی کے فرزند سیدنا حضرت مخدوم عبداللہ مکیؒ
 ۶۱ھ میں ہجرت فرما کر بدایوں شریف وارد ہوئے اور توطن اختیار کر لیا۔ شفق صاحب کے

والد ماجد کا نام سیدنا مولوی عبدالحی ہے۔ سید واڑہ بدایوں میں تاریخ ۱۱ فروری ۱۹۱۳ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی زندگی بدایوں میں گزری اور وہیں اردو فارسی عربی وغیرہ کی تعلیم حاصل کر کے انگریزی اسکول و کالج سے ہائی اسکول و انٹر پاس کیا۔ ذی علم خاندان کے ماحول نے شعر و شاعری کی طرف مائل کر دیا اپنے حقیقی برادر عم زاد و بہنوئی جناب محمد عبدالسمیع آرزو سے مشورہ سخن لیا۔ ریلوے میں ملازمت کرنے کے بعد ایک جگہ مقام نہ رہا۔ ۱۹۳۹ء سے شاہجہانپور میں مقام اور یہیں سینئر انسپکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہو کر مستقلاً آباد ہو گئے ہیں تقریباً پینتیس سال سے محلہ بارہ زئی دوئم میں اپنے ذاتی مکان میں رہائش اختیار کئے ہوئے ہیں۔ آپ کے دو صاحبزادوں اور ایک صاحبزادی کو بھی شاعری وراثت میں پہنچی جن کے حالات اس کتاب میں موجود ہیں۔ فرخ اردو کے سلسلے میں خود اپنے اور آپ کے بچوں نے از حد وقت دیا اور محنت صرف کی ہے۔ حضرت شفق کا نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیے

کہیے یکتائی کا دعویٰ اب تو باطل ہو گیا آئینے کے آئینہ مد مقابل ہو گیا
زخم دل سے حسرت و ارماں کی دنیا بس گئی جو گرا قطرہ زمیں پر دو سرا دل ہو گیا
رہنمائے دشتِ غربت آتشِ الفت بنی سوز دل اپنا چراغِ راہ منزل ہو گیا

اس میں ارمانوں کی دنیا اے شفق آباد ہے
دل کا ہر ذرہ گلستانِ عناد دل ہو گیا

تمنائیں دم اظہار بھی روپوش ہوتی ہیں محبت میں دعائیں بھی بقدر ہوش ہوتی ہیں
ترے زخم نہاں اے دل کسی دن رنگ لائیں گے وہی چٹیں ابھر آتی ہیں جو روپوش ہوتی ہیں
ہماری بے خودی خود تر جانِ حیرت دل ہے یہ باتیں روز ہوتی ہیں مگر خاموش ہوتی ہیں

شفق ہم محور ہتے ہیں خیال مئے پرستی میں
تصویریں ہماری خواہشیں مئے نوش ہوتی ہیں

محمد عشرت اللہ عشرت

محمد عشرت اللہ عشرت ابن منشی حکمت اللہ صاحب ۱۵ جون ۱۹۱۵ء کو آبائی مکان واقع محلہ ضیائیل

میں پیدا ہوئے مولوی نظام علی صاحب اور مولوی جھنڈو خاں صاحب سے اکتسابِ علم کیا۔ بارہ سال کی عمر سے مشہور نابینا شاعرہ محترمہ حجاب صاحبہ کی زیر تربیت و نگرانی رہے اور انھیں سے مشورہ سخن لیا۔ نظم، غزل، قطعات وغیرہ پر طبع آزمائی فرماتے ہیں۔

نمونہ کلام

ساقی یہ التفات ترا بے رُخی کے ساتھ	ایسی ہنسی بھی کیا مری تشنہ لہی کے ساتھ
وہ مسکرا رہے ہیں مرے عرضِ حال پر	تسکینِ دلفریب ہے کس سادگی کے ساتھ
ہمدالستِ خوابِ عدمِ رستخیزِ حشر	عمریں گزار دی ہیں تری ہر خوشی کے ساتھ
شاید سوادِ منزلِ جاناں میں آگئے	خود پاؤں اٹھ رہے ہیں بڑی سرخوشی کے ساتھ

نگہاں بسوئے برق کبھی، آشیاں کبھی	یوں بھی ہوئی ہے زلیت کہیں کامراں کبھی
راہ طلب ہیں چلنے لگے سر کے بل وہاں	تھکنے لگے ہیں پائے تختس جہاں کبھی
فریادِ وجہہ پردہ دری ضبطِ وجہہ موت	ڈر ہے پیامِ دل کا نہ کہہ دے زباں کبھی

عشرت اس آرزو میں گزار رہی تمام عمر
اے کاش دردِ عشق بنے جاوداں کبھی

حامد علی خاں حامد مینائی

حامد مینائی ایک اعلیٰ خاندان کے فرد ہیں سن شعور ہی سے شعر و شاعری کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ حضرت عابد مینائی کے سامنے زانوئے تلمذتہہ کیا اور استاد کے دامنِ فیض سے ان کی حیات تک وابستہ رہے۔ بیشتر اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے جس میں نظم، غزل، قطعہ رباعی، نعت و منقبت شامل ہے۔ ان کا ایک انتخاب کلام 'فردوسِ نظر' کے نام سے ۱۹۶۶ء میں منظرِ عام پر آکر اہل ذوق سے داد حاصل کر چکا ہے۔ ذریعہ معاش ملازمت تھا آرمی کلوڈنگ فیکٹری میں بے پردہ سپروائزری فائز تھے۔ سبکدوشی کے بعد گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے۔ آپ شاعر بھی ہیں اور شاعرِ گم بھی۔ شاہجہانپور میں آپ کے مقبول تعداد میں شاگرد ہیں جو آپ سے استفادہ کرتے ہیں۔

غم جس میں نہ شامل ہو وہ عنوان نہیں دیکھا
 دیکھا ہے گریباں کو تری شوخ نظر نے
 سمجھے بھی تو کیا سمجھے وہ روداد گلستاں
 آزار محبت ارے توبہ ارے توبہ
 ہر مرحلہ طے میں نے کیا راہ وفا میں
 چھائی ہے فضاؤں پہ قیامت کی اداسی
 خالی کبھی کانٹوں سے گلستاں نہیں دیکھا
 بھولے سے کبھی چاک گریباں نہیں دیکھا
 جس نے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا
 اس درد کا ہم نے کبھی درماں نہیں دیکھا
 زنداں نہیں دیکھا کہ بیاباں نہیں دیکھا
 دیکھے مرا گھر جس نے بیاباں نہیں دیکھا
 حامد غم انساں سے جو خود بھی تڑپ اٹھے
 اس دہریں ایسا کوئی انساں نہیں دیکھا

رباعیات :-

ہر بار غم عشق اٹھایا میں نے
 آداب محبت کے ہوں واقف حامد
 دنیا کو یہ انداز سکھایا میں نے
 غمخواروں سے ہر راز چھپایا میں نے

جب مل نہ سکا میرے سوالوں کا جواب
 وہ برہمی حسن وہ برگشتہ نظر
 اک پیکر حسرت تھا دل خانہ خراب
 اب تک ہے مرے ذہن میں طرز عتاب

متفرق اشعار :-

یہ وصل و ہجر کے افسانے کب تک
 بدل دو حامد انداز اب بیاباں کا

وہ تو کیسے نگہ ناز نے خود پر ستم کی
 چارہ سازوں سے کہیں درد کا درماں ہوتا

جو محبت میں تباہی کا گلہ کرتے ہیں
 میری نظروں میں وہ تو ہیں وفا کرتے ہیں

ترے تنہا بدلنے سے کہیں عنوان بدلتے ہیں
 اگر ہم بھی بدل جائیں تو افسانے بدل جائیں

ہائے وہ آنکھ کہ جس میں نہ ہو کوئی آنسو
 ہائے وہ دل جو محبت کا پرستار نہیں

حامد حسین - حامد مینائی

حضرت حامد حسین حامد مینائی خلف اکبر حضرت عابد حسین عابد مینائی جانشین اعتماد الملک حضرت دل شاہ بھہانپوری ۱۰ جولائی ۱۹۱۸ء کو محلہ بارڈوزئی میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد محترم سے تعلیم و تربیت پائی۔ شاعری ورثے میں پائی اور اس میدان میں عابد مینائی کی رہبری قدم قدم پر رہی۔ مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ۲۹ اپریل ۱۹۸۳ء کو رحلت فرمائی۔

نمونہ کلام

سحاب اور شب ماہتاب پیدا کر	کوئی وسیلہ شغل شراب پیدا کر
سکوت اور پھر اتنا سکوت ارے تو بہ	نگاہ ناز کوئی انقلاب پیدا کر
ہزار غم ہے لیکن زباں سے اُن بھی نہ کی	جو ہو سکے تو ہمارا جواب پیدا کر

طرز ادا رباعی خیتام کا بدل	ہر جنبشیں نگاہ کہ جیسے کوئی غزل
افسانے اس کے بن گئے دنیا کے عشق میں	جو حرف بے خودی میں زباں کے گیا نکل
حامد یہ حادثہ یہ زمانے کا انقلاب	بیگانہ حواس مرادل ہے آج کل

معراج و فالے دل ناکام یہی ہے	بیداد نہیں ہے کرم عام یہی ہے
ہے ورد زباں شام و سحر نام تھارا	کچھ کام ہمیں اور نہیں، کام یہی ہے
کیوں دست جنوں جانب داماں نہیں اٹھتا	حامد نگہ شوخ کا پیغام یہی ہے

قطعہ

دل مرا اب کسی صورت سے بہلتا ہی نہیں	ساز پر تم کوئی غنمگین ترانہ چھیڑو
کچھ تو سامان سکوں مجھ کو میسر ہو کبھی	میری ناکام محبت کا فسانہ چھیڑو

حکیم احمد علی خاں - وفا

حکیم احمد علی خاں وفا ۶ اپریل ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوئے مگر چھ سال کی عمر ہونے پائی تھی کہ شفیق کے والد سوار فوج کے اول درجہ کے حوالدار جناب محمود علی خاں یوسف زئی عالم جاودانی کو کوچ کر گئے۔ بیوہ ماں نے زمانے کے گرم و سرد کا بے جگری سے مقابلہ کر کے اپنے فرزند اور دل کے ٹکڑے کو حسبِ توفیق ضروری تعلیم دلوائی۔ حضرت وفا نہایت ذہین و محنتی تھے اسکولی تعلیم سے فراغت کے بعد فنِ طب سیکھا اور اس حد تک ہمارت حاصل کر لی کہ اس فن پر ایک مفید رسالہ تصنیف کیا۔ عجیب بات ہے کہ اتنی معلومات کے باوجود اس معزز و ممتاز فن کو کسب معاش کا وسیلہ بنانے کے بجائے درسِ تدریس کو ذریعہ آمدنی قرار دیا سٹی بورڈ کے ایک اسکول میں مدرس رہے اور مدرس اول کے عہدے سے جون ۱۹۸۰ء میں سبکدوش ہو کر حکمت اور طبابت شروع کر دی۔ شعر و شاعری کا بچپن سے شوق تھا حکیم سلامت اللہ خاں سلامت جانشین حافظ نثار احمد خاں عرف حافظ بدھن خاں تائب کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا۔ سلامت اللہ خاں صاحب سلامت نے ۱۹۶۱ء میں وفا صاحب کو مسند جانشینی عطا فرمائی۔ بعد رحلت حکیم سلامت اللہ خاں حضرت وفانے چندے حضرت عابد جانشین اعتبار الملک حضرت دل شاہ پھانپوری سے مشورہ سخن لیا۔ محمد اللہ وفا صاحب اب صاحبِ تلامذہ ہیں۔ علم عروض میں بھی ایک رسالہ آپ کی تصنیف سے ہے۔ اب تک آپ کے تین ضخیم دیوان طبع ہو چکے ہیں۔ چوتھا دیوان اور ایک مثنوی طباعت کے لئے تیار ہے۔ آپ کے ایک دیوان 'دامان وفا' پر اردو اکاڈمی اتر پردیش نے ایک ہزار روپیہ کے انعام سے بھی نوازا اور اعتراف خدمت کیا۔ آپ کے دو صاحبزادے ڈاکٹر اور دو صاحبزادے لکچر ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیے۔

جو مالک ہے وہی دل کا مکین ہے مکان یہ دوستو خالی نہیں ہے
جمال یار ایسا دلنشین ہے کہ اب اچھا کوئی لگتا نہیں ہے

ہو خلوص و وفا پہ جن کی نظر دوست ایسے جہاں میں ہیں کمتر
ہو نہ تو بہن میکہ مجھ سے لاؤ دے دو مجھے بھی اک ساغر

جب یہ ہے تیرا تغافل ہم تو مر جائیں گے آپ
جب مٹا نقشِ دوئی ہم ایک ہو جائیں گے آپ

کس قدر آسان ہے صورت ہماری موت کی
اے وفا وہ دور ہو کر بھی بہت نزدیک ہیں

یوں کبھی غالب کبھی خود ذوق بن جاتا ہوں میں
اب وہ روتے ہیں بہت جب یاد آجاتا ہوں میں

فیض روحانی جوان سے اے وفا پاتا ہوں میں
زندگی بھر مجھ کو ترپاتے رہے رہ کر جدا

آدمی حالات سے مجبور ہے
اے وفا تم چپ رہے تم نے بہت اچھا کیا
یہ عام بات ہے اس بے وفا کی بات نہیں
آشیانہ پھر آشیانہ ہے
وے زندگی مجھے دل بے مدعا کے ساتھ
ہر ایک کام میں اس کی رضا کو ڈھونڈ لیا
حاملانِ عرش کو حیران و ششدر دیکھ کر

پیکر غم ہے کبھی مسرور ہے
اپنی اپنی کہہ رہے تھے سب ہی ان کی بزم میں
وفا کے نام سے نا آشنا زمانہ ہے
گر قفس میں بھی آب و دانہ ہے
اے مالک حیات قناعت پسند ہوں
خدا پرست وہی ہے کہ ہم نشین جس نے
لے لیا بار امانت میں نے ہنس کر اے وفا

محمد صنعت اللہ خاں - صنعت

محمد صنعت اللہ خاں صنعت خلعت منشی محمد رفعت اللہ خاں المعروف بہ رفیع خاں ساکن محلہ باڑوڑنی
پیشاوری ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ انگریزی اسکول میں آٹھویں تک پڑھا۔ گھر میں اردو فارسی سیکھی۔
تقریباً بیس سال سے شعر کہتے ہیں۔ عابد مینائی شاہجہا پوری کے مفقودا لجز ہو جانے کے بعد حضرت
نسیم شاہجہا پوری سے مشورہ سخن لیتے ہیں۔ کلام بقدر دیوان جمع ہو چکا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ کیجئے:-
ان کے حضور اہل وفا بے زباں رہے
وہ دل کے حوصلے وہ ارادے کہاں رہے
اس سے غرض نہیں کہ مرا آشیاں رہے
پھر بھی مری وفاؤں سے وہ بدگماں رہے
شکوے کئے نہ مائل آہ و فغاں رہے
اب تو ہمیں تصور منزل بھی ہے گراں
بجلی گری تو حشر گلستاں کا ہو گا کیا
صنعت میں ان کے عشق میں برباد ہو گیا

کیوں ساقی میخانہ پہ الزام نہ آئے
وہ سن تو رہے ہیں میری روداد محبت
اک میں ہوں کہ مجرم ہونے کی نظر میں
دراصل وہی لوگ مقدر کے دھنی ہیں
جب میری طرف مصلحتاً جام نہ آئے
تاکید ہے یہ بھی کہ مرا نام نہ آئے
اک وہ ہیں کہ ان پر کبھی الزام نہ آئے
اٹھ کر تری محفل سے جو شکام نہ آئے

حالات کا رہ رہ کے تقاضہ ہے یہ صنعت
لب پر گلہ گردشں ایام نہ آئے

منظر شاہجہاںپوری

نسب اہل سادات سے ہیں۔ الہ آباد میں ولادت ہوئی اور وہیں پرورش پائی اور تعلیم و تربیت
ہوئی شعر و سخن کا شوق بھی الہ آباد ہی میں پیدا ہوا اور پروان چڑھا۔ طویل مدت سے بمبئی میں مقیم ہیں۔ ایک
اخبار سلسلہ بھی جاری کیا۔ دُنیا سے شعروادب میں امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ شاہجہاںپور سے اپنے
آبائی تعلق کے وسیلے سے گاہے گاہے تشریف لاتے رہتے ہیں۔ نمونہ کلام۔

نجانے کون نگاہوں سے ناگہاں گزرا
وہ سامنے رہے جب تک کرن کرن تھی نگاہ
غلط نگاہی جانناں کا ایک لمحہ تھا
بس اتنا یاد ہے برق جمال ٹوٹ پڑی
نہ ان کے ساتھ سہی ان کی یاد ہی میں سہی
قفس میں پھول کھلے جب بہار کا جھونکا
تڑپ کے دل نے کہا خیر ہونشیمین کی
بہت کیا جو دعائے تو ہاتھ اٹھواے
زمین کو چہ جانناں پہ پڑے تھے قدم

یہ امتیاز منظر تجھے مبارک ہو

کہ بزم میں وہ تجھی سے کشاں کشاں گزرا

قبل آغاز ہی انجم کا ڈر ہوتا ہے
غیر کے غم کا بھی اب دل پر اثر ہوتا ہے
بھیک دیتا ہو کوئی یا کہ طلب کرتا ہو
دور اندیش بڑا تنگ نظر ہوتا ہے
کوئی روتا ہے تو دامن مرا تر ہوتا ہے
دونوں صورت میں بشر تنگ بشر ہوتا ہے

ایک طوفان ہے نغموں کا کوئی ساز نہیں
گیت گالیتا ہوں زنداں میں بھی زنجیر کے ساتھ
اڑنے والے تو قفس توڑ کے اڑ جاتے ہیں
گنگناتی ہیں وہ آنکھیں مگر آواز نہیں
میں کہیں بھی رہوں تنہا مری آواز نہیں
عزم پرواز رہیں پر پرواز نہیں

سید حسن اختر

سید حسن نام اور اختر تخلص ہے۔ اختر مشہور شاعر و ادیب مصور فطرت جناب ظہور احمد وحشی کے صاحبزادے ہیں۔ ۱۹۲۰ء میں ولادت ہوئی۔ ان کے والد حضرت وحشی کا ۱۹۴۲ء میں انتقال ہوا، جب اختر ایک نوجوان طالب علم تھے اور اس وقت ان کا قیام اپنے والد کے ساتھ دہلی میں تھا۔ تعلیم دہلی میں پائی۔ کچھ دنوں اور سیری کا کورس پڑھا لیکن تکمیل نہ کر سکے اور یہ کورس ترک کر کے اردو میں فاضل ادب کیا۔ والد کے انتقال کے بعد والد نے ملازمت کی لیکن زیادہ عرصے تک جاری نہ رکھ سکے اور دست بردار ہو گئے۔ وثیقہ نویسی کا پیشہ اختیار کیا اور اب تک اسی پیشے سے منسلک ہیں۔ شعر و شاعری ورثے میں پائی تھی۔ نمونہ کلام:

آپ کے لطف و عنایت کی تمنا ہی سہی
کچھ تو ہو وجہ تستی دل غمگین کے لئے
اک ذرا دیر کو آجائے بیمار کے پاس
آپ آئیں تو سر بزم برفا گلندہ نقاب
دل کے بہلانے کو یہ ایک سہارا ہی سہی
آپ وعدہ تو کریں وعدہ فردا ہی سہی
رسم دنیا ہی سہی، وقت کا منشا ہی سہی
ہوش میں میں نہ ہی ایک تماشا ہی سہی

نہ مصیبتوں کو دوام ہے نہ مسرتوں کو قیام ہے
یہی نظم لیل و نہار ہے کبھی صبح ہے کبھی شام ہے

دل مضطرب کو تو ہی بتا میں کہوں پہلنے کو کس طرح
کوئی قول ہے نہ قرار ہے، نہ سلام ہے نہ پیام ہے
یہ گھٹا یہ رات یہ حسیں فضا مجھے جام دے مرے سا قیا
بھلا کون سوچے اب ایسے میں یہ حلال ہے کہ حرام ہے

راز شاہ بجا پوری

اہل شاہ بجا پور حضرت راز کے نام اور کارناموں سے زیادہ واقف نہیں اس لئے کہ وہ نو عمری ہی میں غالباً ۱۹۳۰ء میں گجرات کے شہر احمد آباد میں جا کر بس گئے تھے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ ان کے شاگرد رشید رحمت امر وہوی نے ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ وہ قصبہ تلہر کے قریب کوئی گاؤں مستدی ہے وہاں کے رہنے والے تھے۔ احمد آباد میں انھیں استاد فن کا درجہ حاصل تھا۔ اور وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ پیشہ کے اعتبار سے گھڑی ساز تھے۔ ان کے کلام کا ایک مجموعہ مرتب شکل میں دہلی میں جناب ظفر ادیب کو بھیج دیا گیا تھا لیکن وہ شائع نہیں ہو سکا۔ احمد آباد اور گردونواح میں ان کے تلامذہ ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ کینسر کے موذی مرض میں، ۲ جولائی ۱۹۵۷ء کو ان کا انتقال ہوا۔ عمر پچاس کے لگ بھگ تھی مقامی اخبارات نے ان کے انتقال کی خبر نمایاں طور پر شائع کی۔

چند اشعار بطور نمونہ

اس نے جس کا نہیں مقام کہیں
آپ کا سن لیا ہے نام کہیں
بیٹھ اے دل نظر ملائے بغیر
بندگی میں نہیں سلام کہیں

آتے ہی ان کے روبرو سپنوں کی بات ہو گئی
تم نے جو تو سے تم کہا کھل گئے زندگی کے پھول
آنکھوں میں دن گزر گیا پلکوں میں رات ہو گئی
تم نے نقاب الٹ دیا شرح حیات ہو گئی
راز دل شکستہ کا آہی گیا انھیں خیال
کانٹوں کو چومتے ہی آج پھولوں سے بات ہو گئی

سنا گیا ہے مقدر بدلنے والے ہیں
وہ کہکشاں سے مقدر بدلنے والے ہیں
ابھی تو اور سخن ور بدلنے والے ہیں
سنا ہے موت کے منتر بدلنے والے ہیں

جہاں شوق کے تیور بدلنے والے ہیں
ہے جن کے بخت میں درد کی خاک افشانی
ابھی سے گرم ہیں کیوں ناقدان بزم سخن
سنا ہے راز کے میداں میں آگئی ہے حیات

نظر سے روک رہے ہیں نظر کے تیروں کو
سفر بن کے نہ دیکھا تھا ہم سفیروں کو
میں دیکھتا ہی رہا ہاتھ کی لکیروں کو

کمال فن ہے یہ دیکھو تو ہم اسیروں کو
ڈراہوں یوں بھی سوادیکھ کر نکپروں کو
زمانہ چال قیامت کی چسل گیا ہے ہے

منشی محمد اظہار حسین - اظہر

منشی محمد اظہار حسین ولد منشی اولاد حسین صدیقی محلہ تاجوخیل کے قدیمی باشندہ تھے۔ محکمہ ریلوے میں ملازم اور ذی علم تھے شعر و شاعری کا شوق اوائل زندگی سے تھا۔ مختار احمد میاں مختار کے شاگرد تھے۔ ان کے ہم عصر اصغر علی خاں اصغر حضرت عابد مینائی اور حضرت ممتاز اللہ خاں ممتاز وغیرہ کہے جاسکتے ہیں۔ اخیر زمانہ میں پاکستان ہجرت کر گئے اور وہیں انتقال ہو گیا۔ مرحوم راقم السطور اور قمر رئیس کی والدہ کے ماموں زاد بھائی تھے۔

غزل

اسے بھی قیس کا اک جذبہ کمال سمجھتے ہیں
یہ وہ انداز ہے جس کو ترے بسمل سمجھتے ہیں
حقیقت آشنا اس کو تری محفل سمجھتے ہیں
کہ اظہار تمنا ہم بہت مشکل سمجھتے ہیں
جسے ہم زندگی عشق کا حاصل سمجھتے ہیں

تری جنبش کو ہم اے پردہ محفل سمجھتے ہیں
نگاہ لطف کے مطلب کو دنیا خاک سمجھے گی
جسے بیگانہ راز حقیقت بت کدہ سمجھے
نگاہ یاس تو ہی کاش شرح آرزو بنتی
قیامت ہے اسے دنیا نے مرگ ناگہاں سمجھا

پڑے ہیں جا بجا ذرات خاک دل جو اے اظہر
انھیں ذروں کو اب ہم عشق کی منزل سمجھتے ہیں

مبارک ششم

سر ابدال خاں المذاہب بہ معتمد الدولہ نواب بہادر خاں چغتای بن دریا خاں باقر زئی نے ۱۶۳۶ء
یہ شہر بسایا تھا اور اپنے آقا دولی نعمت سہنشاہ شاہجہاں صاحب قرآن سے موسوم کر کے شاہجہانپور
نام رکھا اس دیار خوش سواد کے مشرقی حاشیے پر واقع بستی احمد پور کا باشندہ ہوں اس بستی سے
میرے اجداد کا زمانہ آبادی سے وطنیت کا رشتہ ہے۔ بستی کے ہر جانب پھیلے ہوئے سبزہ
زاروں میں پل کر اور قریب بہتے ہوئے دریا نے کھتوت میں نہا نہا کر توانا ہوا۔ جوان ہوا اور یہیں
بوڑھا ہوا ہوں۔ یہ دیہی علاقہ ہے۔ یہاں کی انہی فیصد آبادی کی زندگی کا دار و مدار زمینات کی کاشت
پر ہے لیکن یہاں کی خاک سے اعلیٰ سول اور فوجی عہدیدار بھی اُٹھے، ہنرمند و دستکار ہوئے وکیل و
مختار اور تھانیدار پیدا ہوئے مگر مفلس و نادار بھی ہمیشہ آبادی کا جزو بنے رہے۔

میرے والد محترم مولوی عبدالعلی خاں قانون پیشہ تھے وہ میجسٹریٹ بھی ہوئے اور زمیندار
بھی رہے۔ وہ اپنی ایمانداری اور فہارت کے سبب نہایت مقبول و معروف رہے اور طویل مدت
تک خدمات انجام دیں۔ ان کا انتقال میری والدہ محترمہ سیدہ مختار بیگم کے انتقال کے سترہ سال
بعد ۱۹۶۹ء جون میں ہو گیا۔ میری والدہ مرحومہ حافظ، قاری، مولوی سید حبیب الحق کی دختر تھیں۔
ان کے جد مولوی عبدالعلیم بلند پایہ درویش و بزرگ تھے جن کو نواب عبدالعزیز خاں ابن نواب بہادر خاں
کی درخواست پر اورنگ زیب عالمگیر نے شاہ جہانپور کے شاہی امام و خطیب کا منصب عطا کیا تھا۔
یہ منصب نسلًا بعد نسلًا ہوتا ہوا میرے نانا تک پہنچا۔ اولاد ذکر نہ ہونے پر شاہی امامت و
خطابت دوسرے خاندان میں منتقل ہو گئی۔

ہائی اسکول کی سند کے مطابق میری تاریخ پیدائش ۱۳ مارچ ۱۹۲۴ء ہے جو اصل سے
کم از کم چھ سات سال کم ہے ۱۹۳۸ء دسمبر میں میری شادی ہوئی تو بچہ نہ تھا میں عہد جوانی میں داخل

ہو چکا تھا اور پھر ۲ جنوری ۱۹۴۲ء کو ایک چچی کا باپ بھی بن گیا مگر میری سچ ہے کہ میں طالب علم تھا اور شادی کے برسوں بعد تک کالج اور یونیورسٹی کی رونق رہا۔ طالب علمی کا زمانہ گزار کر جب زندگی میں قدم رکھا تو منظر بدل گیا۔

زندگی کے دشت میں پہنچے تو سورج چڑھ گیا
دھوپ کی شدت ہوئی ایسی کہ گھبرانے لگے

والد صاحب کا آخری دور حیات تھا۔ سب سے بڑا بیٹا ہونے کے ناطے گھریلو ذمہ داریاں اٹھا نہیں پایا تھا کہ آزادی کا سال آگیا۔ ملک کی تقسیم۔ قتل و خون۔ انتقال آبادی اور حالات کی غیر یقینی میں مستقل الجھ کر رہ گیا۔ چند سال بعد خاتمہ زمینداری کا اعلان ہو گیا۔ زمینداری چلی گئی خود کاشت باقی رہ گئی۔ میں نے ایک مقامی انگلش فرم میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس وقت اولاد میں دو بیٹے اور سات بیٹیاں ہیں۔ سب سے بڑا بیٹا کرنل عارف ۱۹۸۹ء کے آغاز میں فوت ہو گیا۔ شاعری وراثت میں نہیں پائی۔ سوزِ دل کی دین ہے۔ آغاز ۱۹۳۲ء میں ہوا۔ اٹاوا، علی گڑھ اور لکھنؤ کے دوران قیام ذوق و شوق شاعری کو بڑھاوا ملا۔ جس شعر سے شاعری کی ابتدا ہوئی وہی اس کی بنیاد قرار پایا۔

صباح جو.... کے گھر سے گزرتو اس سے اتنا ضرور کہنا

کہ تیری فرقت میں ہائے ظالم شمیم آنسو بہا رہے ہیں

شاعری کا سلسلہ چلا تو اب تک چلا جا رہا ہے حالانکہ دل و دماغ کام کار ہانہ آنکھیں مگر اس مشغلے سے دست بردار ہونے کو جی نہیں چاہتا۔ معروف اصناف شاعری میں نظم، قطعہ، نعت، منقبت اور غزل پر طبع آزمائی کی لیکن غزل کی صنف سب سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ مقامی اساتذہ حضرت امداد، حضرت اشفاق اور جناب پیارے میاں رشید سے استفادہ کیا ہے مگر زیادہ قریب رہنے کا وقت نہ ملا سبب یہ کہ زندگی کا وہی زمانہ بیرون شہر گزرا۔ جو کچھ کہا خود بڑے اعتماد سے کہا۔ اساتذہ قدیم و جدید کا کلام زیر مطالعہ رکھا۔ کسی کی تقلید کی نہ کسی مقبول و معروف شاعر کو اپنے لئے نمونہ بنایا۔ اپنی بات اپنی طرح کہنے اور اپنے لہجے میں ادا کرنے کی کوششیں ہیں مصروف ہوں۔ اب تک دو انتخاب غزلیات 'نقشِ نوا اور آب و ہوا' طبع ہو چکے ہیں۔ تیسرا تیار ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ نثر میں تذکرہ شعرا، شاہجہانپور اور غیر مسلم شعرا، شاہجہانپور میری تصنیف و تالیف میں شامل ہے۔ آخری الذکر بزبان ہندی ہے جو جلد ہی منظر عام پر آجائے گی۔

چند غزلیں بطور نمونہ کلام درج ذیل ہیں۔

ہے نگاہوں میں فقط سطوت خشکی و تری
تھی حصاروں میں پریشاں گل تر کی خوشبو
میں مسافر ہوں رہ غم میں کڑی منزل کا
ڈالتا ہوں جو نظر مڑ کے کبھی ماضی پر
نقل کو گوہر اصلی کے مقابل رکھ دو
کنتی محدود ہے دنیا کی وسیع النظری
لے اڑی اس کو بہت دور نسیم سحری
ظلمتو، میرے مقدر میں نہیں شب بسری
ایک آواز ابھرتی ہے بڑی درد بھری
ہے بڑے اوج پر اس وقت فن شیشہ گری
کل نہ مشکل ہو مگر آج تو مشکل ہے شمیم
شاعری رسم و روایت سے نظر آئے بری

رفیق زندگی ہوتا کوئی احساس ایسا بھی
شکایت کس لئے کرتے ہو موجوں کی حوادث سے
ہمارے حوصلوں کی کم نصیبی سے نہ ہاتھ آیا
دھواں آلود آہوں کا جو منظر ہے خیالوں میں
یہ ہم پھیلے ہیں یا ہونے لگا ہے تنگ پیراہن
وہی آرام جاں ہوتا وہی دل میں کھٹکتا بھی
سفینہ چھوڑ کر موجوں پہ یارو تم نے دیکھا بھی
کیا تھا دور تک ہم نے غم دوراں کا پیچھا بھی
وہی منظر بگولوں کا بیابانوں میں دیکھا بھی
خلوص دل سے اس پر آج تک لوگوں نے سوچا بھی
شمیم اس بات پر ہم سے خفا ہیں آسماں والے
بتوں کو توڑتے ہیں اور کر لیتے ہیں سجدہ بھی

اک درد سر ہے پیرہن آرزو مجھے
شعلہ میرے وجود کا لوسرد ہو گیا
کروں حساب عمر کسی روز بیٹھ کر
راحت بھی تجھ سے دل کو ملی ہے کبھی کبھی
اک اجنبی سا لگتا ہوں اپنوں کے درمیاں
تجھ سے نجات اے غم دنیا نہیں ملی
بر باد عسر ہو گئی کرتے رفو مجھے
دے آہنج دل جلا کے کوئی شعلہ رو مجھے
مہلت تو دے یہ کار گہ رنگ و بو مجھے
اے شہر یار دیتا رہا دکھ بھی تو مجھے
پہچانتا نہیں ابھی میرا لہو مجھے
کیا میرے حال پر بھی نہ چھوڑے گا تو مجھے
تھے سب دنوں میں سخت جوانی کے دن شمیم
زرغہ کئے تھے یار و بہار و سبو مجھے

شکوہ یہی نہیں کہ زمانہ گزیدہ ہوں
تعدیر جس جاں میں ہوں فطرت ہے مبتلا
شکوہ ہے یہ کہ خود سے بھی خاطر کبیدہ ہوں
یہ آگہی کی منزل آخر کا وقت ہے
میرا قصور ہے بنفیس ناکشیدہ ہوں
کافی ہے ایک گھونٹ کوئی پی کر دیکھ لے
انجام سوچ سوچ کے میں آبدیدہ ہوں
دو آتش ہوں یعنی مکرر کشیدہ ہوں
میں خود ہی آئینے سے ملاتا نہیں نظر
آئینہ سوچتا ہے بہت برگزیدہ ہوں
ہے جسم و جاں پہ دھوپ کی چادر کا سائبان
لیکن خبر نہیں ہے کہاں آرمیدہ ہوں
سب کی سدا سنی ہے زمانے نے غور سے
میں آج تک کشیم مگر ناشنیدہ ہوں

اشعار :-
دست و پا کر دو جدا ممکن ہے شر برپا کروں
کیا خبر کس وقت حال بے خودی میں کیا کروں

بد نصیبی ہے کہ دریا بھی نظر آئے سراب
اے عذاب تشنگی یہ حال ہے تو کیا کروں

دھوپ کا مارا کوئی ممکن ہے آنکھے ادھر
پھیل کر صحرائے غم میں دور تک سایا کروں

ہزاروں قافلوں کی روز اس میں بھڑھوتی کیوں
اگر دشوار اتنا جادہ شہر عدم ہوتا

لہو کی شمع روشن کاش کر لیتے اندھیروں میں
نہ فکر رہگزر ہوتی نہ رنج ہیچ و خم ہوتا

مشیر جھنجھا نوی

حضرت مشیر جھنجھا نوی کا اصل نام سید مشیر الحسن علوی، والد کا نام ڈاکٹر سید ناظر حسین ہے۔ جناب مشیر قصبہ جھنجھا ضلع مظفر نگر یو۔ پی میں، ۲۷ دسمبر ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئے لیکن ان کے والد شاہجہا پور میں منتقل ہو گئے اور مشیر صاحب کے لڑکپن اور جوانی کا بیشتر حصہ شاہجہا پور میں بسر ہوا۔ انٹر میڈیٹ تک اسی شہر کے طالب علم رہے چوں کہ اس وقت شاہجہا پور میں کوئی ڈگری کالج نہیں تھا اس لئے بریلی کالج سے بی اے کرنے کے بعد علی گڑھ جا کر امتیازی شان کے ساتھ بی اے کیا بعدہ پنجاب یونیورسٹی سے اردو میں آنرز کیا اور اول پوزیشن حاصل کی۔ اس کے بعد دہلی چلے گئے اور دہلی یونیورسٹی سے ایم اے کی تکمیل کی۔ ۱۹۵۰ء سے مستقلاً دہلی میں قیام رہا جہاں فنیچوری مسلم ہائر سیکنڈری اسکول میں بحیثیت اردو ٹیچر ۲۳ دسمبر ۱۹۸۸ء تک رہے۔ ان کو بحیثیت ممتاز معلم دہلی انتظامیہ نے اسٹیٹ ایوارڈ دیا اور ۶۸۶ میں انھوں نے اردو اکیڈمی دہلی سے اپنی شعری خدمات کے صلے میں ایوارڈ حاصل کیا۔

شعر و شاعری کا شوق ابتدائی زندگی سے ہے۔ ۱۹۲۶ء میں اعتباراً الملک حکیم ضمیر حسن خاں صاحب دہلی شاہجہا پور کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے ہوئی۔ اس کے علاوہ دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ "انفاس سخن" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ دہلی میں انھیں استاد فن کا درجہ حاصل تھا۔ کلاسیکی فکر و اسلوب کے بلند پایہ شعر کہتے تھے۔ نمونہ کلام

محل کے فرش نے مری رفتار چھین لی	آسائشوں نے جرأتِ اظہار چھین لی
یوسف نہیں تو کوئی خریدار بھی نہیں	اک خوش نظر نے گرمی بازار چھین لی
پختہ عمارتوں سے وہ ٹکرا کے رہ گیا	سیلاب نے مگر مری دیوار چھین لی
ترک تعلقات کا یہ بھی اثر ہوا	تنہائیوں نے طاقت گفتار چھین لی
پیش حریم میں بھی سپر بن گیا مشیر	جب دوستوں نے ہاتھ سے تلوار چھین لی

فضا میں جھومتے ہوئے وہ گیسوؤں کے قافلے	نفس میں بس گئے تھے خوشبوؤں کے قافلے
طلسم رنگ و بو، یہ جوانیوں کی آہٹیں	بدن کی لوچ لوچ میں وہ جادوؤں کے قافلے

دلوں کو روندتے ہوئے وہ آہوؤں کے قافلے
جھن جھن، کھن کھن، وہ گھنگھر وؤں کے قافلے
زمیں کی نذر ہو گئے وہ آسٹوؤں کے قافلے

غزال چشم، سروقد، سبک خرام، خوش ادا
شباب ورقص گل بدن، خراب و شعروا سخن
مشیر جن کو مل سکا نہ کوئی دامن کرم

سانپ نے کاٹا مجھے اور کاٹتے ہی مر گیا
میرے اندر کافر شستہ خوف کھا کر مر گیا
آنڈھیوں میں جب گرا تو گھر کو آنگن کر گیا
یہ بھی دیکھا ہے کہ انسان سانس لے کر مر گیا
اس لئے میسر علاوہ ہر کسی کا سر گیا

زہر اس ماحول کا مجھ میں کچھ اتنا بھر گیا
میں زمانے کی شرافت سے کچھ ایسا ڈر گیا
وہ گھنیرا پٹر جس کے سارے میں رہتے تھے ہم
سانس لینا زندگی کی اک علامت ہے مگر
ایک میں کوتاہ قد تھا اس کی محفل میں مشیر

عاشق علی - عاشق

حضرت عاشق علی عاشق ابن شیخ فضل علی ساکن محلہ ایمن زئی جلال نگر ۱۹۲۳ء میں پیدا
ہوئے۔ درجہ تین (اردو) تک تعلیم ہے کتب بینی اور عشق سخن نے ذہن کو جلا بخشی۔ حضرت شاہ
سید اسرار علی عرف چھوٹے میاں شائق بدایونی کے مرید و خلیفہ ہیں عشق رسولؐ میں غرق ہیں نعت گوئی میں
شہرت ہے۔ دیگر اصناف سخن میں بھی گاہے گاہے طبع آزمائی کرتے ہیں حضرت قیصر شکیلی کے
تلامذہ میں شمار ہوتا ہے۔

نعت

جل اٹھا دل سوزِ غم سے رنگ وہ لائی کہ بس
درد حسرت نے چل کر لی وہ انگریزی کہ بس
گر پڑے تو جانب دل سے صدا آئی کہ بس
حق نے بخشی ہے انھیں وہ شان یکتائی کہ بس

یاد سرکارِ دو عالم اس طرح آئی کہ بس
سوئے طیبہ جب چلے زائر تو سینے میں مرے
ہو کے بے خود جب جمال حق سے موسیٰ طور پر
کوئی بھی ثانی نہیں آقا و موسیٰ کا مرے

آزوو یہ ہے کہ دنیا آئینہ خانہ لگے
 جستجو میں تیری ہر قید تعین اٹھ گئی
 اس قدر مانوس درد و غم ہے میرا دل کہ اب
 ہو گیا جب سے اسیر گیسوئے خمدار دل
 بول اٹھے دور ہی سے مجھ کو آتا دیکھ کر
 ڈرہ ذرہ مجھ کو عکس حسن جاناں نہ لگے
 اب نہ کچھ کعبہ لگے مجھ کو نہ بت خانہ لگے
 جور بھی اس کا بانداز کریمانہ لگے
 یہ جہاں رنگ و بو اب اس کو دیرانہ لگے
 یہ تو مجھ کو میرے عاشق جیسا دیوانہ لگے

احمد اللہ خاں کیفی

احمد اللہ خاں کیفی خلیفہ ملک حمید اللہ خاں ساکن محلہ ہمند جلال نگر کی ولادت ۱۵ جون ۱۹۲۲ء
 کو ہوئی حسب رواج قدیم ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور اردو پڑھ کر انگریزی اسکول میں داخلہ
 لے لیا ہائی اسکول کے بعد کالج میں داخل ہوئے اور بی۔ اے کی سند حاصل کی۔ کاروبار کرتے
 ہیں۔ ۱۹۴۴ء سے شوق شاعری ہے۔ اشفاق علی خاں اشفاق ایڈووکیٹ مرحوم سے شرف تلمذ حاصل
 تھا۔ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔

وحشت انگیز ہے کس درجہ خدا جانے بہار
 پھر ہوئی جاتی ہے بے کیف یہ محفل کیفی
 خود قدم اٹھنے لگے سیر بیاباں کے لئے
 پھر طلب گار لہو ہے یہ چراغاں کے لئے

مری سرگزشت غم کو نہ سمجھ سکا زمانہ
 کہو کس طرح بتاؤں کہ کہاں گری تھی بجلی
 کسے اب سناؤں جا کر یہ الم بھرا فسانہ
 نہ رہا ہے آشیانہ نہ ہے شاخ آشیانہ

نظر فریبی گلشن یہ رنگ بوئے بہار
 ہے آشنا تو مرے غم سے اک جہاں کیفی
 مرے لہو کا تماشہ ہے لالہ زار نہیں
 جو غم بھی میرا بٹائے وہ غمگسار نہیں

جو مشکلات جہاں سے نڈھال ہونے کا
 وہ سر بلند رہا پائمال ہونے کا

وہ کامیاب تمنا رہا ہے جو کینفی شکست خوردہ فکر مآل ہونہ سکا

ہزار غم ہیں مگر دل کو یہ سکون تو ہے کہ بارِ دردِ خوشی سے اٹھایا میں نے
جو زندگی میں کیا کچھ تو یہ کیا کینفی غم جہاں کو غم جاں بنا لیا میں نے

عبدالرحیم خاں - درد

عبدالرحیم خاں صاحب درد نبیرہ رسالوار عبدالکریم خاں صاحب باڈی گارڈ شہنشاہ جارج پنجم محلہ تارین ٹکلی کے ساکن تھے۔ حضرت دل شاہ جہاں پوری کے ممتاز شاگرد اور ذی علم آدمی تھے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان بے اپنے خاندان کے ہجرت فرما گئے اور وہیں رحلت فرمائی۔ نمونہ کلام۔

چھا گئی وارفتگی بیگانہ محشر اٹھا
اصطلاح عام میں کہتے ہیں جس کو درد دل
دو ہلال اک بدر کو گھیرے ہوئے آئے نظر
تھا حقیقت میں وہی اپنا مال جستجو
درد راہ عشق میں اب تو یہ حالت ہو گئی
چارہ گر بایں سے میری جانے کیا کہہ کر اٹھا
رات سینے میں وہی کبخت رہ رہ کر اٹھا
جب وہ خواب ناز سے انگڑائیاں لے کر اٹھا
دشت عبرت خیز میں جو گرد بن بن کر اٹھا
سوچتا ہوں خود بخود کیوں کر گرا کیوں کر اٹھا

تری باتوں کو اے قاصد فریب دل سمجھتے ہیں
بدشواری کئے طے مرحلے جن غم نصیبوں نے
ہوئے بیگانہ ہستی حقیقت آشنا ہو کر
سربالیں کوئی اے درد آیا چارہ سازی کو
وہ شرمندہ ہوں اس کو ہم بہت مشکل سمجھتے ہیں
وہ راہ عشق میں ہر سانس کو منزل سمجھتے ہیں
نظر آتا ہے جو ذرہ اسے ہم دل سمجھتے ہیں
مصیبت ہے کہ مرنا بھی تو ہم مشکل سمجھتے ہیں

متاع ہوش قرباں اس نگاہ برق ساماں پر
مآل اضطراب و کاوش دل دیکھیے کیا ہو
ہوا بیگانہ صبر و تحمل درد وارفتہ
اثر ڈالا ہے جس نے جنبش تارِ رگ جاں پر
ابھی جوش جنوں نے ہاتھ ڈالا ہے گریباں پر
شب غم وہ مصیبت تھی دل آشفته ساماں پر

شمس الدین احمد شمس

شمس الدین احمد شمس شاہجہاںپور محلہ بارڈوزئی کے رہنے والے تھے۔ اجداد مجاہدین جنگ آزادی تھے اور ۱۸۵۷ء کے زمانے میں انگریزوں کے خلاف لڑنے میں حصہ لیا بعدہ موروثی رہے۔ حضرت شمس کی ابتدائی زندگی گھر میں رہ کر تعلیم میں گزری۔ مدارس میں بھی اکتساب علم کیا۔ شعرو شاعری کا شوق تھا حضرت اسعد کی رہنمائی حاصل ہوگی مشاعروں میں اکثر شریک ہوتے تھے اور داد سخن پاتے تھے۔ ۱۹۸۷ء کے بعد انتقال فرمایا۔

نمونہ کلام

نزع میں تھی ترے بیمار کو یہ محویت
تھا ترے دھیان میں دنیا سے خبردار نہ تھا
دیکھنے والوں کی حیرت سے کھلی تھیں آنکھیں
کوئی بھی ہوش میں اپنے دم دیدار نہ تھا
جیتے جی شمس مرے پوچھنے والے تھے سبھی
بند آنکھیں جو ہوئیں ایک بھی غم خوار نہ تھا

یاد ماضی کھو چکا ہوں فکر مستقبل ہے آج
نا تواری کا بُرا ہوا ب قدم اُٹھتے نہیں
اب تو مشکل ہو گیا دامن بچانا، کیا کروں
وہ اُلٹ دیں کاش اپنے رخ سے یہ رنگین نقاب
ہو رہا ہے درہم و برہم نظام کائنات
کارواں بھٹکا ہوا ہے راستہ ملتا نہیں
مطمئن بیٹھا ہوں میں اپنا نشیمن پھونک کر
لکھ رہا ہوں خون دل سے شمس میں اپنی غزل

مٹ گئیں اے شمس آخر یاد گاریں عیش کی

اب نظر کے سامنے دھندلا سا عکس دل ہے آج

حضرت ییاقۓ حسین ییاقۓ ٲلہری

مولوی ییاقۓ حسین صدیقی کے والد کا نام مولوی سخاوت حسین سخا تھا۔ آبابی سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے شاہجہاںپور کے معروف قصبہ ٲلہری میں اب سے لگ بھگ ساٹھ سال قبل پیدا ہوئے گویا آپ کی ولادت ۱۹۲۲ء کے آس پاس ہوئی تھی۔ یہ قصبہ کسی زمانے میں 'شہر کمان' کے نام سے جانا جاتا تھا جس کے متعلق حضرت عقیل ٲلہری نے فخریہ انداز میں فرمایا تھا

خوشا مولد مہست شہر کمان کہ حلۓ بگوش بود اصفہان

شہر کمان کے بجلے اب ٲلہر ہو گیا۔ حضرت ییاقۓ کا خاندان ٲلہر کے ممتاز اور معزز خاندان میں شمار کیا جاتا ہے ٲشتہا ٲشت سے علم و فضل اس خاندان کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ آپ کے والد مرحوم مولانا سخاوت حسین سخا عالم مبہر ٲابند شریعت اور شاعر تھے لیکن طبیعت ٲرا بتدار ہی سے فقر کا رنگ غالب تھا جو آخر دم تک قائم رہا ان کے معاصرین علمائے کرام میں سے بعض کا کہنا ہے کہ ان کے فقر سے بوئے اسد اللہی ظاہر ہوا کرتی تھی اور ان کی زندگی کیسر درویشانہ تھی۔ حضرت ییاقۓ کے والد ماجد کا سایہ اس وقت ان کے سر سے اٹھ گیا جب وہ آٹھ نو سال کی عمر کے تھے والد کے انتقال کے بعد والدہ محترمہ نے نہایت حوصلے سے بیٹے کی تعلیم و تربیت کی۔ اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم والد مرحوم سے حاصل کی تھی والدہ نے خاندانی روایات کو قائم رکھنے کے لئے مولوی ییاقۓ حسین کو بغرض تعلیم شاہجہاںپور بھیج دیا اور مدرسہ عین العلم میں داخلہ کروا دیا لیکن چند ماہ ہی میں یہاں سے طبیعت اچاٹ ہو گئی لہذا بریلی کا رخ کیا وہاں تھوڑے دن مدرسہ منظر الاسلام میں درس لیا مگر وہاں بھی دل نہ لگا تو لاہور چلے گئے جہاں چھ ماہ قیام کر کے ٲلہر واپس آ گئے۔ والدہ ماجدہ نے آپ کو دادوں ضلع علی گڑھ کے 'حافظیہ سعیدیہ مدرسے میں داخلہ کے لئے مجبور کیا لہذا دادوں جا کر حضرت ییاقۓ نے ابتدا ہی سے عربی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی چار سال بعد بعض ناگزیر حالات سے مجبور ہو کر دادوں کو بھی خیر باد کہہ دیا۔ ۱۹۲۵ء کے اوائل میں مدرسہ عالیہ رام پور میں داخلہ کرایا اور درس نظامی کی شاخ میں تعلیم حاصل کرنے لگے درس نظامی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی کے سرکاری امتحانات بھی پاس کرتے رہے چنانچہ ۱۹۲۸ء میں الہ آباد سے مولوی ۳۹ء میں عالم اور ۴۱ء میں فاضل کے امتحانات پاس کر لئے۔ ۱۹۳۳ء میں پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کرنے کے ساتھ ہی درس نظامی کی تکمیل بھی کر لی۔ چار سال تک ٲلہر جائجی بیچنا تھ ہائی اسکول میں اردو فارسی کے مدرس رہے۔ ۱۹۵۶ء میں طبی تعلیم کے

حصول کے لئے لکھنؤ کے تکمیل المطب کالج میں داخلہ لیا بعد آٹھ ماہ یہ سلسلہ بعض وجوہ سے منقطع کرنا پڑا اور وطن واپس آگئے۔

شاعری کا شوق مولانا لیاقت حسین کو اوائل عمری سے تھا دادوں کے دوران قیام میں حضرت مسین احمد میاں بیباک شاہ، بھانپوری تلمیذ حضرت داغ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ دو غزلوں پر اصلاح کرانے کے بعد حضرت بیباک کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد پروفیسر شاداں بلگرامی سے مشورہ سخن کرنے لگے۔ پہلے ثاقب تخلص اختیار کیا مگر اسے ترک کر کے لیاقت رکھ لیا۔ حضرت لیاقت تلہری کا کلام ہندوپاک کے موقر جراند میں شائع ہوتا رہا ہے فن شاعری سے واقف ہیں۔ ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے آپ کی نظم اور غزل دونوں یکساں فنی مہارت کا ثبوت ہیں۔ شاہ بھانپور خاص قصبہ تلہر اور قصبہ کٹرہ میں آپ کے شاگرد کثیر تعداد میں ہیں۔ اب خود بہت کم کہتے ہیں تلامذہ کی رہبری زیادہ فرماتے ہیں تلہر میں زیادہ تر شاعر آپ کے شاگرد ہیں۔ بطور نمونہ کلام چند غزلیات قارئین کی نذر ہیں۔

غزلیات۔

ہو گئے ہیں اپنے مرکز سے بہت ہی دور ہم
ہم نے کی ہر رنگ میں تجھ دید رسم عاشقی
آج بھی ہے وادیِ امین کو موسیٰ کی تلاش
کیوں نہ ہوں پھر آفتوں میں ہر گھڑی محصور ہم
دشت میں مجنوں بنے اور دار پر منصور ہم
آؤ پھر چل کر کریں روشن چراغ طور ہم

یہ مانا ایک مشت خاک ہوں پھر بھی بہت کچھ ہوں
لیاقت دل کی دنیا بھی بڑی پر شور دنیا ہے
اب اس سے بھی زیادہ بد نصیبی اور کیا ہوگی
خرد کی شاطری کچھ بھی نہ کام آئی محبت میں
جہاں میں میں نہ ہوتا آپ پہچانے کہاں جاتے
نہ ہوتا دل تو درد دل کے افسانے کہاں جاتے
رہے ہم میں مگر پھر بھی نہ آئے وہ نظر برسوں
کہ ہم ہوش و خرد رکھ کر رہے ہیں بے خبر برسوں

کسی کے جور سے درس وفا لیا میں نے
حریف ارض و سما بھی نہ ہو سکے میرے
گرا میں ایسا کہ خود کو اٹھالیا میں نے
ازل میں بار امانت اٹھالیا میں نے

محبت جس کسی پر بھی اثر انداز ہوتی ہے
غزل کیا ہے محبت کا چھلکتا ایک پیمانہ
وہ ہستی دو جہاں میں لائق اعزاز ہوتی ہے
کہ جس میں دل کی دھڑکن سانس کی آواز ہوتی ہے

حنیف اسعدی

حنیف اسعدی شاہجہاںپور کے ایک ذی علم گھرانہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حضرت صدیق حسن اسعد شاہجہاںپور کی کچہری میں اعلیٰ عہدہ دار اور ایک باوقار شخصیت کے مالک تھے اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ حنیف اسعدی نے اسلامیہ ہائی اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور وہاں سے بی۔ اے کیا۔ اس کے بعد وہ ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔

حنیف اسعدی نے ابتداء میں غزلیں اور نظمیں کہیں۔ بعد میں ان کے دل میں عشق رسول نے جگہ بنالی اور پاکستان کے باکمال نعت گو شعراء میں وہ ایک منفرد حیثیت کے مالک ہوئے۔ ان کی نعتوں کا مجموعہ 'ذکر خیر الانام' کے نام سے شائع ہو کر ہر حلقہ کے ناقدین سے خراج حاصل کر چکا ہے۔ افسوس ہے کہ وہ دستیاب نہ ہو سکا۔

ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے بھی ان کی اپنی پہچان ہے۔ زبان کے درو بست پر انھیں بے پناہ قدرت حاصل ہے۔ شعری اظہار میں طرفگی اور تازگی ہے۔ روایتی مضامین سے وہ ہمیشہ گریز کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں ندرتِ فکر ہی نہیں ایک نئی شعریت کا احساس ہوتا ہے۔

یہاں تو سایہ دیوار و در ہے سو جاؤ
مسافر وہ تھارا ہی گھر ہے سو جاؤ

ابھی مجھے تو نہیں ہیں رباطِ شب کے چراغ
ابھی تورات کا پچھلا پہر ہے سو جاؤ

ابھی تو شام گئی ہے تلاشِ فردا میں سے
سحر سے رات ابھی بے خبر ہے سو جاؤ

یہ دیکھ کر کہ فضا میں ہیں نیند سے بو جھل
یہ سوچ کر کسی زانو پہ سر ہے سو جاؤ

بجز ستاروں کے دیکھے ہیں رتجگے کس نے
تھکے حال کی کس کو خبر ہے سو جاؤ

گزرتے لمحوں میں شامل ہیں عسر کے لمحے
شبِ حیات بہت مختصر ہے سو جاؤ

یہ کہہ رہی ہیں ستاروں کی نیم وا آنکھیں
کہ جاگنے کے لئے عمر بھر ہے سو جاؤ

حنیف کون یہ رہ رہ کے دے رہا ہے صدا
کہ کل کی رات بھی پیش نظر ہے سو جاؤ

غزل

نَس نَس میں گھٹن سی بس گئی ہے
شعلے سے نپک رہے ہیں تن میں ،
یہ رات ، یہ رت ، یہ گھپ اندھیرا
ماحول پہ ہول سا ہے طاری ،
بادل تو نہ آئے تھے نہ برسے ،
اس بار بہار کیا خزاں بھی ،
رنگت تو اڑا کے لے گئی دھوپ
ہم خود تو ادھر کو جانے پائے
مٹی کا مزاج کیا بدلتا ،
فنجوں کا کوئی پیام نے کر ،
موسم کو فضا ترس گئی ہے
وحشت سی لہو میں بس گئی ہے
تنہائی کبھی کو ڈس گئی ہے
منظر کو نظر ترس گئی ہے
دامن پہ گھٹا برس گئی ہے
بیگانہ خار و خس گئی ہے
خوشبو کہیں اور بس گئی ہے
اک ہیچ پس جس گئی ہے
بدلی تو ادھر برس گئی ہے
اک موج سوئے قفس گئی ہے

کیا دے گی ہم کو پائے کو بونی
زنجیر تو اور کس گئی ہے

غزل

خدا کے بندے ہیں سجدوں سے سرگراں کیا کیا
پکارتا ہے جبینوں کو آستیاں کیا کیا

روئیں روئیں میں چراغوں کی طرح روشن ہیں
وہ نقش پا ہیں سر رہ گزار جاں کیا کیا

میں ان کو کیسے بتاؤں جو میں نے دیکھا ہے
تھاری کھوج میں ہیں میرے راز داں کیا کیا
نظر اٹھی تو فضاؤں نے بھی ادا کیا،
گزر گئے تری یادوں کے کارواں کیا کیا
مجھے تو پھونک دیا اب کے موسم گل نے
چمن کی یاد میں کوندی ہیں بجلیاں کیا کیا
کبھی کبھی جو ستاتی ہے گھر کی ویرانی،
تو خار زلیست کھٹکتا ہے نزد جاں کیا کیا
اب آئے ہو تو نظر کو یقیں نہیں آتا
نہ آئے تھے تو گزرتے رہے گماں کیا کیا

شبیر رومانی

شبیر رومانی تخلص۔ مرزا عظیم احمد بیگ چغتائی، نام۔ مرزا اظہر علی بیگ چغتائی والد تھے۔
۳۰ ستمبر ۱۹۲۸ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم شاہجہانپور میں ہوئی۔ ۱۹۴۸ء میں آگرہ یونیورسٹی
سے بی کام کا امتحان پاس کیا۔ شاہجہانپور کے ممتاز اور قادر الکلام شاعر حضرت دل جان شین
حضرت امیر مینائی کے رشید تلامذہ میں گنے جاتے تھے۔ عنفوان شباب سے ہی بہت
خوش سلیقہ، خوش پوش، خوش گو اور خوشنوا شاعر کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے تھے۔
گردونواح کے اور مقامی مشاعروں میں احترام و عزت سے مدعو کیے جاتے تھے۔ حضرت دل
مروم بھی اپنے اس ہونہار شاعر کی صلاحیت اور مقبولیت پر ناز کرتے تھے۔ تقسیم ملک سے
پہلے اسلامیہ انٹر کالج شاہجہانپور کے شعبہ اکاؤنٹ سے وابستہ تھے۔ تقسیم کے بعد کراچی (پاکستان)
میں مقیم رہے اور وہیں محکمہ دفاع سے وابستہ ہو گئے۔ کراچی پہنچنے کے بعد کچھ عرصہ بعد ان کی
تخلیقی صلاحیتوں کو مزید جلا نصیب ہوئی۔ ہاجر شعرا میں جلد ہی انھوں نے اپنی الگ
شناخت بنائی۔ ابتدا میں 'جھنکار' اور 'شیراز' کی ادارت سے متعلق رہے بعد میں بعض موقر

جریدوں اور اخبارات کے کالم نویس بھی بنے۔ بچوں کے لیے بھی وہ دلچسپ نظمیں لکھتے رہے۔ پاکستان میں ان کا پہلا کارنامہ جس نے لوگوں کو چونکا دیا ان کی ”مثنوی سیر کراچی“ ہے جس میں کراچی کی تمدنی، تہذیبی اور ادبی زندگی کے علاوہ اس کے اہم مقامات کو بھی شاعرانہ حسن کے ساتھ ادا کیا گیا ہے۔ یہ مثنوی ترمیم و اضافہ کے ساتھ دوبار طبع ہوئی۔ انہوں نے اپنا پہلا شعری مجموعہ ’جزیرہ‘ کے نام سے ۱۹۵۹ء میں شائع کرایا۔ اس کے آغاز میں پاکستان کے ممتاز نقادوں ڈاکٹر وزیر آغا اور محمد علی صدیقی نے تنقیدی تبصرے بھی لکھے ہیں۔

شبتم رومانی کو غزل اور نظم دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے اگرچہ ان کی نظموں میں بھی غزل کی سی غنائیت اور زبان و بیان کی شیرینی و دلکشی و رعنائی ملتی ہے۔ بقول احمد ندیم قاسمی ”ان کے یہاں موضوعات کا حیرت انگیز تنوع ہے“ محمد علی صدیقی نے ان کی نظموں کے بارے میں صحیح لکھا ہے کہ ”یہ نظمیں جدید حسیت کی آئینہ دار ہیں اور نہایت خوبصورت ہیں“ راقم الحروف سے شبتم رومانی کے گزشتہ چالیس سال سے خصوصی مراسم رہے ہیں۔ شاہجہانپور سے ہجرت کے بعد وہ ارض پاکستان سے مجھے اپنا تازہ کلام بھیجتے رہے۔ حال ہی میں جب ان کے ’جزیرہ‘ کا مطالعہ کیا تو اندازہ ہوا کہ ان کی تخلیقی فکر بدترج ارتقار کی منزلوں سے گزرتی رہی ہے۔ اپنے پرانے کلام پر بھی انہوں نے برابر نظر ثانی کی ہے۔ اب ان کی غزلوں کے اشعار میں روایتی فرسودہ مضامین تقریباً نایاب ہیں اور ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ اپنے ہر شعر میں اپنے احساس، تجربے اور معاشرتی زندگی کا کوئی نیا گوشہ ابھاریں اس کے لئے وہ مناسب اور صوفی مناسبت سے الفاظ اور طرز ادا کا انتخاب کرتے ہیں جس سے ان کے کلام میں ایک اچھوتی شعری روانی اور کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہیں کہیں بد کی غزلوں میں فلسفیانہ فکر کی پرچھائیاں بھی رنگتی نظر آتی ہیں جیسے۔

بھیر میں جو بچھڑ گئے ہم سے	شام ڈھلنے کا انتظار کریں
گم ہے تنہائیوں میں شہر کا شہر	کیسے اُن جنگلوں کو پار کریں
اب تمہیں مجھ سے کچھ حجاب نہیں	اب ان آنکھوں میں کوئی خواب نہیں

کیسا لمحہ تھا جو چلے تھے خوشبو سے منہ موڑ کے ہم
صحرا میں آنکھیں ہیں پھولوں کی بستی چھوڑ کے ہم

روح سے روح ملی تھی جس دم اس لمحے کے ایسے ہوئے
ہاتھ سے ہاتھ جہاں چھوٹا ٹھٹھا پتھر ہیں اس موڑ کے ہم
کس کس سے کیا عہد کیا تھا ہم کو اب کچھ یاد نہیں
سارے رشتے بھول گئے ہیں تجھ سے. ناتا جوڑ کے ہم
شاخ گل ترا شاخ گل ترا خوشبو ہم کو بھی ورنہ
تجھ سے اپنا حق لے لیں گے آج کلانی موڑ کے ہم
سُنتے ہیں بلحوں کی رقابت، دیکھتے ہیں رنگوں کا نفاق
مغل خوابوں میں اے شبم ایک شکوہ چھوڑ کے ہم

توس لب چوم کے آئی آوار
نغمہ کہتا ہے کہ سے سے پوچھو
میرے الفاظ ہی مجھ تک پہنچے
کبھی خوشبو نے دکھایا چہرہ
میرے خط اس نے جلائے چھپ کر
وہی تھبرنوں میں نہانی آواز
کس کے ہونٹوں کی چرائی آواز
مجھ میں گونجی جو خدائی آواز
کبھی مجھ کو نظر آئی آواز
کس خموشی سے جلائی آواز

نظم پہیہ

کہیں غزل
کہیں کنول
کہیں رباب و چنگ ہیں
کہیں بلاکشان زندگی حریف سنگ ہیں
یہ سب لہو کے رنگ ہیں
یہ رقص و نغمہ سخن
یہ اعتبار فکر و فن
یہ روشنی کرن کرن
یہ پھول پھول سے بدن
یہ میری تیری آبرو یہ میرا تیرا پیر ہیں
یہ پیر ہیں
جو خواہشوں کے قامتوں پہ تنگ ہیں
یہ سب لہو کے رنگ ہیں
اسی لہو کی گردشوں سے
گھومتی ہے یہ زمیں
اسی لہو کو شہر شہر
چومتی ہے یہ زمیں
اسی لہو کی جست ہے زمیں سے آسماں تک
یہی لہو جدید ہے

یہی لہو قدیم ہے

یہی لہو قدیم ہے

شبہنم رومانی کی تصنیفات

مشہور سیر کراچی ۱۹۵۹ء

جزیرہ ۱۹۷۹ء

حرف نسبت ۱۹۸۳ء

مولف ارمان بجنوں دو جلدوں میں

قررئیس

پروفیسر قمرئیس کا اصل نام مصاحب علی خاں ہے۔ سرکاری اندراج کے مطابق وہ ۱۲ جولائی ۱۹۳۲ء کو پیدا ہوئے۔ والدہ کے قول کے مطابق ان کی پیدائش مذکورہ تاریخ سے کوئی دس ماہ پہلے کی ہے۔ والد مولوی عبدالعلی خاں صاحب مختار اور زمیندار تھے۔ والدہ کا نام مختار بیگم تھا۔ والد نے ۱۹۰۶ء میں مختاری کا امتحان امتیاز سے پاس کیا تھا۔ اس وقت سے ۱۹۶۹ء تک یعنی تقریباً تیس سال تک شاہجہانپور کی عدالتوں میں مختاری کی۔ اس دوران کئی سال تک آنریری مجسٹریٹ اور تقریباً بیس سال تک بار ایبوسوی ایشن شاہجہانپور کے صدر رہے۔ اپنے پیشہ میں مہارت، دیانت اور لگن کی وجہ سے دور دور تک شہرت رکھتے تھے۔ مقدمات کی ایسی کثرت تھی کہ دو دو وکیل ملازم تھے۔ تحصیل تلہر کے گاؤں بمبیا کے وہ زمیندار نمبردار بھی تھے۔

قررئیس کی ابتدائی تعلیم شاہجہانپور میں ہوئی۔ مشن ہائی اسکول سے آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کر کے وہ ایک سال تک حسین آباد گورنمنٹ ہائی اسکول لکھنؤ میں زیر تعلیم رہے۔ ہائی اسکول اسلامیہ ہائی اسکول شاہجہانپور سے ۱۹۴۸ء میں کیا۔ گاندھی فیض عام کالج شاہجہانپور سے انٹراور پھر ۱۹۵۲ء میں بی۔ اے کے امتحانات پاس کیے۔

۱۹۵۲ء میں قمرئیس نے لکھنؤ یونیورسٹی میں ایم۔ اے (تاریخ) اور ایل۔ ایل۔ بی میں داخلہ لیا۔ یہ تین سال کا کورس تھا۔ لیکن والد صاحب کے اصرار پر انھوں نے ۱۹۵۳ء میں ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان پاس کر کے وکالت شروع کر دی۔ ۱۹۵۶ء کے اوائل تک انھوں نے وکالت کی۔ کام کی کثرت تھی۔ آمدنی بھی دوسرے نئے وکیلوں کے مقابلہ میں معقول تھی۔ اس دوران ان کے

شادی بھی ایک غریب منظر علی خاں کی اکلوتی بیٹی رئیس بانو سے ہو گئی تھی۔ لیکن اس پیشہ میں ان کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ شعر و ادب سے جو دلچسپی انھیں کالج کے زمانہ تعلیم میں شروع ہوئی تھی لکھنؤ کے زمانہ قیام میں یہ چنگاری بڑھ کر شعلہ بن گئی تھی۔ انھوں نے گھر والوں سے چھپا کر اردو میں ایم۔ اے کا پرائیویٹ امتحان دیا۔ اور پچاس امیدواروں میں اول آئے۔ اس سے ان کا حوصلہ بڑھا اور انھوں نے والد صاحب کی مرضی کے خلاف، علی گڑھ جا کر مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ لے لیا۔ اشتراکیت اور ترقی پسند ادبی تحریک سے وہ کالج کے زمانہ تعلیم میں ہی وابستہ ہو گئے تھے۔ لکھنؤ میں انھوں نے ”شہرِ پناہ“ اور ”گلکارِ مقبرہ“ جیسی نظمیں انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں پڑھیں اور داد حاصل کی۔ لکھنؤ ہی میں آل احمد سرور سید احتشام حسین اور ڈاکٹر محمد حسن جیسے ممتاز ترقی پسند دانشوروں سے ان کے تعلقات استوار ہوئے۔ یہ سلسلہ علی گڑھ میں بھی جاری رہا۔

گزشتہ تیس بتیس سال کی مدت میں قمر رئیس نے علم و ادب کی دنیا میں جو شہرت اور عزت حاصل کی اس کا مختصر سا خاکہ فخر الدین علی احمد کھیٹی لکھنؤ کے خبر نامہ میں جس کے وہ رکن ہیں ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے۔

۱۹۵۹ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پروفیسر رشید احمد صدیقی کی نگرانی میں ”پریم چند کی ناول نگاری“ پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اگست ۱۹۵۹ء میں شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی سے بحیثیت لکچرر وابستہ ہوئے۔ یہیں پہلے ریڈر اور پھر پروفیسر کے عہدہ تک ترقی حاصل کی۔ دو بار صدر شعبہ اردو کے منصب پر فائز رہے۔

پروفیسر قمر رئیس دہلی یونیورسٹی کے ان چند ممتاز پروفیسروں میں ہیں جنھیں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ”نیشنل لکچرر“ کے خطاب سے نوازا۔

حکومت ہند نے تین بار مہمان پروفیسر کی حیثیت سے تاشقند یونیورسٹی میں ان کا تقرر کیا۔ جہاں انھوں نے چھ سال کام کیا۔

ڈاکٹر قمر رئیس نے ماسکو، بسن (پرتگال)، کراچی، لاہور۔ اسلام آباد (پاکستان) لندن اور اس کے علاوہ ٹورنٹو، مانٹریال، کیلگری اور امریکہ کی کئی کانفرنسوں اور سیمیناروں میں مقالے پڑھے اور لکچر دیئے۔

ڈاکٹر قمر رئیس کو امتیاز میراوارڈ، نیاز فتحپوری اوارڈ، فیض اوارڈ کراچی اور عالمی اردو

کانفرنس کا احتشام حسین ایوارڈ مل چکا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی متعدد تصانیف پر یو۔ پی بہار اور دہلی اکیڈمیوں کے ایوارڈ تفویض ہو چکے ہیں۔

پروفیسر قمر رئیس یو۔ پی اردو اکیڈمی، دہلی اردو اکیڈمی، ہریانہ اردو اکیڈمی، ترقی اردو بورڈ، انجمن ترقی اردو ہند اور جامعہ اردو علی گڑھ کے رکن رہے۔ وہ چار بار کل ہند انجمن اساتذہ اردو اور تین بار کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری کے عہدے کے لئے چنے گئے۔ گجرات کمیٹی کی سفارشات کو عمل میں لانے کے لیے علی سردار جعفری کمیٹی کے بھی وہ ممبر نامزد کیے گئے۔ آج کل وہ ہند ازبکستان دوستی سوسائٹی کے جنرل سکریٹری اور وزارت تعلیم حکومت ہند کی اس اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی کے رکن ہیں جس کا کام ملک میں قومی یک جہتی کو فروغ دینے کے لیے ہر ریاست کے تعلیمی نصاب کا جائزہ لینا ہے۔

ڈاکٹر قمر رئیس ماہنامہ ادیب، علی گڑھ میگزین، عصری آگہی اور "نیاسفر" کے مدیر اعلیٰ کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔

ان کی کئی کتابیں انگریزی، ہندی، ترکی اور روسی زبان میں بھی شائع ہو چکی ہیں۔

ڈاکٹر قمر رئیس کی چند اہم کتابوں کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) پریم چند کا تنقیدی مطالعہ (۲) پریم چند فکر و فن (۳) پریم چند: شخصیت اور کارنامے (۴) رتن ناتھ سرشار (۵) تلاش و توازن (۶) تنقیدی تناظر (۷) تفہیم و تعبیر (۸) ترجمہ کافن اور روایت (۹) اردو میں طنز و مزاح کی روایت (۱۰) شعراء ازبکستان (منظوم ترجمے وغیرہ (۱۱) علی شیرنوائی اور ازبکستان۔

قمر رئیس نے اپنا کلام محفوظ نہیں رکھا۔ ابتدائی دور کی غزلیں اور بعد کا کلام سب خرد برد ہو گیا۔ دو مفرد اشعار اور دو نظمیں پیش ہیں۔

کرسیاں جن کو ملیں مسند شاہی کی طرح

ہم پہ وہ ٹوٹ پڑے قہر الہی کی طرح

یہ آج فضا میں جو گھٹن ہے۔ جو اس ہے

کہتے ہیں یہ طوفاں کے لئے حسن طلب ہے

موج و ماہی

ایک موج رواں صفحہ آب پر تیرتی
 کسماتی لچکتی تڑپتی ہوئی
 صفحہ آب سے نیچے تہ میں گئی
 اک تھلے میں پڑی نیم خوابیدہ ماہی کو
 آغوش میں لے کے اوپر چلی
 راستہ میں عجیب جوش و پندار سے
 موج گویا ہوئی
 کم نظر بے خبر ماہی تہ نشیں
 تو کینز خور و خواب اب تک رہی
 آدکھاؤں تجھے زندگی، روشنی
 رقص سورج کی کرنوں کا شام و سحر
 شوخ چنیل ہواؤں کا اجلانگر

مست شاخوں میں پتوں کی سرگوشیاں
 مرغزاروں میں آہو کی مدہوشیاں
 خوش نوا طائروں کے حسین زمزمے
 مست و مجوسفر ابر کے قافلے
 یہ وہ آزاد دنیا ہے ذرہ جہاں قلب شہزاد ہے
 ہر طرف پُرفشاں
 من کی آزادیاں
 تن کی شہزادیاں

صفحہ آب پر موج جو نہی اٹھی
 اک بڑی موج کے سیل آغوش میں
 کھو کے گم ہو گئی
 ماہی کم نظر
 سہمی سہمی ہوئی

دیر تک موج کی راہ تنگتی رہی۔ دہلی ۱۹۶۷ء

نیم شب

چاند نکلا تھا مگر دیر ہوئی ڈوب گیا
 اواب لوٹ چلیں دور نکل آئے ہیں
 مضمحل راہ گزاریں یہ تھکے ہارے درخت
 سر جھکائے ہوئے سمٹے ہوئے اکتائے ہوئے
 اک دھواں ایک دھندلکا سا رواں ہے ہر سو
 رات کی مانگ سے افشاں بھی اڑی جاتی ہے
 ققمقے رات کی پہنائی میں اے روبرج مجاز!
 پھر دکھتی ہوئی زنجیر نظر آتے ہیں

کہر آلود فضا میں یہ اداسی کا فسوں
 رات اک خوابِ حیا ہے کہ جگا بھی نہ سکوں
 کتنی سنسان ہے یہ رات، گزر گاہ حیات
 کیسی خاموش ہے ناظرہ فطرت کی برات
 ایک وادی کہ جہاں رقص نہ رومان نہ گیت
 کوئی آہٹ نہیں آواز نہیں دور و قریب

کچھ قدم اور سہی اے دلِ وحشت ساماں
 اپنی دیوانگی شوق کے ہاتھوں تو بھی
 بے نوا، بے سرو سامان رہا ہے اب تک
 اپنی بستی میں بھی ویران رہا ہے اب تک
 مجھ کو تنہائی کبھی اتنی گراں بار نہ تھی
 ذہن میں تلخی افکار تھی، پیکار نہ تھی
 تیری وحشت کی قسم منزلِ شب دور نہیں
 ہم بہت دور سہی، شہرِ طرب دور نہیں
 چاند نکلا تھا مگر دیر ہوئی ڈوب گیا
 آؤ اب لوٹ چلیں دور نکل آئے ہیں

علی گڑھ ۱۹۵۶ء

جناب قمر الدین قمر

حضرت قمر الدین قمر خلف نظام الدین عزت شیخ پھدی میاں محلہ سنتری کے ساکن ہیں۔ ۱۰ جولائی
 ۱۹۳۲ء کو ولادت ہوئی۔ اردو مڈل پاس کیا اور کاروبار زندگی میں مشغول ہو گئے۔ طبیعت موزوں پائی
 شعر و شاعری کا شوق ہے۔ حضرت محشر امروہوی کے شاگرد ہیں۔

رنج و غم خلش آہیں اس کی بزم سے لائے
 دل کو ساتھ لائے ہو تم بھی کیسے پاگل ہو
 آج اپنے گھر میں ہم دشمنوں کے ساتھ آئے
 پتھروں کی بستی میں آئینہ اٹھا لائے
 آدمی ہجوم طوفاں میں شرط ہے نہ گھبرائے (کذا)
 خود تو کچھ نہیں سمجھے دوسروں کو سمجھائے
 آج کل کا انسان بھی کیا عجیب انسان ہے

بے وفازمانے میں کیا قمر شکایت ہے
 بیکسی کے عالم میں کون کس کے کام آئے

ہاتھ اٹھے ہیں مگر لب پہ دُعا کچھ بھی نہیں
 درجاناں سے میں لایا ہوں یہ زخموں کے گلاب
 اب مرے پاس اندھیروں کے سوا کچھ بھی نہیں
 کون کہتا ہے کہ اس در سے ملا کچھ بھی نہیں
 ورنہ تنہا میری بے کیف صدا کچھ بھی نہیں
 ایک امید کا تنہا سا دیا کچھ بھی نہیں
 زندگی صرن سراہوں کے سوا کچھ بھی نہیں
 اب نہ بیٹھے کسی دیوار کے سائے میں کوئی
 ان ہواؤں نے بچھا دی ہیں ہزاروں شمعیں
 ولوے چھن ہی گئے اس دل نارال کے قمر
 دوڑ آشوب میں جینے کی ادا کچھ بھی نہیں

خالد یوسف

خالد یوسف قصبہ تلہر ضلع شاہجہاںپور میں پیدا ہوئے۔ شاعری کی ابتدائی تربیت اپنے والد محمد احمد خاں مانل تلہری کے زیر سایہ حاصل کی۔ ابتدائی تعلیم بھی تلہر میں ہوئی۔ ۱۹۴۹ء میں پاکستان ہجرت کی۔ حیدرآباد (سندھ) میں سکونت اختیار کی۔ ۱۹۵۶ء میں پاکستان ایئر فورس اسکول سرگودھا سے سینئر کیمبرج کیا۔ ۱۹۶۱ء میں سندھ یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم۔ اے کیا۔ اور وہیں لکچرر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ ۱۹۶۳ء میں مقابلہ کے امتحانات میں کامیاب ہوئے اس کے بعد پاکستان ٹیکیشن سروس میں تقرر ہوا۔

۱۹۴۱ء میں ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان پاس کیا۔

۱۹۴۲ء میں شعری مجموعہ 'حسرت گنکار' شائع ہوا۔

۱۹۴۶ء میں سفارت خانہ پاکستان لندن میں بطور سیکنڈ سکریریٹری کے تقرر ہوا۔

شعروادب کے علاوہ دوسری دلچسپی علم نجوم ہے اور اس سلسلے میں بین الاقوامی کانفرنسوں میں برطانیہ کی نمائندگی کر چکے ہیں۔ عرصہ سے برطانیہ (لندن) میں مقیم ہیں۔ نمونہ کلام

غزل

چشم و گیسو کا کوئی ذکر نہ رخسار کی بات
 بیٹھ کر دیکھے ان سے درو دیوار کی بات
 یہ ادائیں یہ اشارے یہ حسیں قول و قرار
 کتنے آداب کے پردے میں ہے انکار کی بات
 رات بھر جس کی تمنا میں جلے ہیں ہم لوگ
 وہ سحر شیخ کی نظروں میں ہے کفار کی بات
 بزم اغیار اگر ہو تو بچھے جاتے ہیں
 اور کرتے ہیں وہ ہم سے رسن و دار کی بات
 مدح صیاد بہر حال ضروری تو نہیں
 چپ رہو یہ بھی ہے اب جرات کردار کی بات
 شہر کا شہر فصیلوں پہ اُمنڈ آئے گا
 بات چلتی ہے تو رہتی نہیں دوچار کی بات
 کس بھروسے پہ کریں عشق کا سودا خالہ
 وقت شاہد ہے کہ رہتی نہیں تلوار کی بات

نظم
 اجنبی گلاب

اجنبی شاخ کی زینت وہ تروتازہ گلاب
 اک مچلتا ہوا پیکر کہ حقیقت نہ سراب

ایک تصویر مقابل ہو تو دل کھو جائے
 ایک آئینہ کہ دیکھو تو نظر ہو جائے
 نغمہ و رنگ ہیں اس کی مستریم باتیں
 رس میں ڈوبی ہوئی بھگی ہوئی رسمِ جہم باتیں
 ایک قندیل کہ روشن ہے ستارے کی طرح
 ایک صورت کہ ہے جنت کے نظامے کی طرح
 وہ کہ اک شعر بھی ہے گیت بھی ہے ساز بھی ہے
 شعلہ حسن بھی ہے شعلہ آواز بھی ہے
 جی میں آتا ہے کہ یہ بند و سلاسل یہ قیود
 توڑ کر اس کے اجالوں میں کہیں کھو جاؤں

نکبت بریلوی

نام امتیاز حسین تخلص نکبت۔ والد حکیم مقبول حسین محلہ جلال نگر شاہجہانپور میں طب کرتے تھے۔ ۱۲ مئی ۱۹۳۵ء کو نکبت بریلی میں پیدا ہوئے۔ لیکن اپنا آبائی وطن وہ شاہجہانپور ہی بتاتے ہیں۔ یہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ اسلامیہ انسٹرکٹوریٹ سے میٹرک پاس کیا۔ اس کے بعد پاکستان ہجرت کی۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے فاضل ادب پاس کیا۔ وہیں سے بی۔ اے کیا۔ اور اسلام آباد سے فاضل طب و جراحی بھی کیا۔ درس و تدریس۔ حکمت اور ادبی پرچوں کی ادارت ان کا مشغلہ رہا۔ عرصہ سے مشہور ماہنامہ 'افکار' کی ادارت سے وابستہ ہیں، تیز ہوا کے باوجود، مجموعہ کلام زیر اشاعت ہے، نثر میں ان کے خاکے شائع ہو چکے ہیں۔ ادبی تبصرہ نگاری میں انھیں کمال حاصل ہے۔

نکبت بریلوی نظم اور غزل دونوں اصناف پر قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی نظموں میں سے پاکستان کے سیاسی حالات اور مہاجرین کے گونا گوں مسائل کی جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ فنی اعتبار سے ان کی نظمیں مختصر لیکن تاثر سے معمور ہوتی ہیں۔ یہی حال ان کی غزلوں کا ہے۔ ان کی غزلوں میں

کلاسیکی رچاؤ بھی ہے اور نئے احساس و شعور کی تازگی بھی۔ روایت کے احترام نے جدید طرز فکر کے باوجود ان کے کلام کو اعتبار بخشا ہے۔ وہ کلاسیکی شاعری کے رموز و علامات سے بھی کام لیتے ہیں اور نئی اشاراتی زبان بھی وضع کرتے ہیں جس سے ان کے اشعار میں ایک خاص طرحداری پیدا ہو جاتی ہے۔ پاکستان کے مشاعروں میں اکثر شریک ہوتے ہیں۔ چند سال قبل لکھنؤ کے ایک مشاعرہ میں بھی شرکت کے لئے آئے تھے۔

نمونہ کلام - نظم

مجبوری

پھر وہی جستجو وہی تگ و دو	اور آرام سے بسر کر لیں
دل نہیں مانتا کہ بیٹھ رہیں	جس قدر رہ گئی ہے عمر حزیں
راہ کے پیچ و خم سے گھبرا کر	دل مگر اس کو مانتا ہے کہیں
ڈھونڈ لیں کج عاقبت کوئی	

جب اپنے گھر میں آتا ہوں

میں دن بھر کا تھکا ہارا	بدن کو دھوپ کی شدت سے جو صدمہ پہنچتا ہے
جب اپنے گھر میں آتا ہوں	جو بے زاری، تھکاوٹ، درد سر لے کر پلٹتا ہوں
زمانے کے ستم اور کج ادائیگیوں کا جھول جاتا ہوں	وہ چہرہ مہرباں چہرہ
مری دہلیز پر ایک منتظر اور مہرباں چہرہ	نظر آتا ہے جب مجھ کو
مری ناکا میوں، میری تھکن، میری خجالت کو	تو میں اس کے بتسم ریزہ ہونٹوں اور آنکھوں میں
وہ چہرہ مسکرا کر دور کر دیتا ہے پل بھر میں	نوائے سحر پاتا ہوں
وہ پل بھر کو سہی لیکن کوئی سودا نہیں رہتا	اک ایسی لہر پاتا ہوں
مرے سر میں	محبت کی، عنایت کی
سحر آگیاں، مسرت خیز، اک آسودہ گر لہ	کہ ساری کلفتیں، ہر ڈکھ
میسر ہے مجھے گھر میں	زمانے کے ستم، سب بھول جاتا ہوں
جو باہر دھول بے پہچان کر دیتی ہے چہرے کو	جب اپنے گھر میں آتا ہوں

حضرت علامہ افضل الحکما سید فضل حق حسرت

حضرت حسرت مشہور گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ والد ماجد کا نام شاہ سید سبغت اللہ تھا۔ قاری سید احمد نقشبندی مجددی علیہ رحمت کے نواسے تھے۔ ابتدائی تعلیم والد محترم سے پائی۔ بعدہ مختلف مدارس میں تحصیل علم کیا۔ مدرسہ اعلیٰ حضرت بریلی میں اعلیٰ حضرت سے فلسفہ، منطق، ہیئت اور اقلیدس وغیرہ علوم میں اکتساب کیا۔ مدرسہ دارالعلوم کانپور میں اپنے خالو مولانا مفتی حاجی قاری نثار احمد صاحب سے تفسیر جلالین مع حواشی پڑھی۔ مشہور و معروف عالم متبحر ملا نظام شاہ جہانپوری حضرت حسرت کے پرانا ناٹھے۔ حسرت نے طب کی تعلیم مدرسہ بیہ مراد آباد میں افضل الحکما مولوی ہدایت علی صاحب لکھنوی سے حاصل کی پھر تکمیل و طب کالج لکھنؤ میں تکملہ کیا۔ شعر و سخن کا شوق بھی تھا۔ جناب اصغر علی خاں صاحب اصغر شاہ جہانپوری کے تلامذہ میں شامل تھے۔ کلام زیادہ تر برباد ہو گیا۔ طویل علالت کے بعد رحلت فرمائی اور وطن کی خاک کا پیوند ہوئے۔

نمونہ کلام۔

تو پھر مشکل نہیں جینا کسی کے عہد و پیمانہ پر
دم گریہ وہ ہنستے ہیں مرے حال پریشاں پر
دل صد چاک کی تصویر کھینچی ہے گریباں پر
کہ وہ آنسو بہانے آئے ہیں گور غریباں پر
سیہ بختی کا سایہ ہے مرے حال پریشاں پر

بھروسہ ہو جو اک برگشتہ قسمت کو تن و جاں پر
یہ رمز حسن و الفت ہے کوئی سمجھے تو کیا سمجھے
تماشا بن گئی جدت پسندی دست و وحشت کی
ہے آسودگان خاک مژدہ ہے قیامت کا
کنا یہ میں کیا اظہار عشق زلف یہ کہہ کر

وہ آزادی اسیری سے کہیں بدتر ہے اے حسرت

لگاں ہو جب قفس کا تنگئی دل سے گلستاں پر

کیا کہوں میں گکشن ایجاد سے کیوں کراٹھا
مختصر لکھنے کو بیٹھا لکھ کے اک دفتر اٹھا
اس نے مجھ کو بھی جلایا آپ بھی جل کر اٹھا
آستاں یار پر جو سر جھکا وہ سر اٹھا
ہم نے فوراً سر جھکا یا جب ترا خنجر اٹھا

بوئے گل بن کر اٹھا یا صورت صراٹھا
قہر درد محبت تھا عجب طول آفریں
شمع خنسل بن گیا آخر دل سوز آشنا
درحقیقت خاکساری عشق کی معراج ہے
دامن پاس وفا چھوٹا نہ اپنے ہاتھ سے

یوں کرائے حسرت بسر میخانے میں لیسل و نہار
رات بھر کر توبہ، لطف سے کشی دن بھر اٹھا

حضرت ہدایت اللہ خاں بیڈھب

حضرت بیڈھب کے والد کا نام عظمت اللہ خاں تھا اور محلہ بارہ دری میں رہتے تھے۔ غریب گھرنے سے تعلق تھا زیادہ تعلیم نہ حاصل کر سکے۔ مگر لڑکپن ہی سے مزاج میں شوخی شرارت تھی۔ محکمہ ڈاک و تار میں پوسٹ مین تھے اور اسی محکمے سے رٹائر ہوئے۔ شاعری میں مشہور و معروف شاعر حضرت مختار میاں مختار کے شاگرد تھے۔ نہایت سادا اور روزمرہ زبان میں شعر کہتے تھے مگر کبھی کبھی اشعار میں تہذیب سے گری ہوئی باتیں بھی کہہ جاتے تھے جو نازک مزاج لوگوں پر گراں گزرتی تھیں۔ دیوان زندگی ہی میں مکمل ہو چکا تھا مگر طبع نہ کرا سکے اور ایک مدت تک ان کے صاحبزادے کی تحویل میں رہا۔ بیڈھب کے ایک دوست شجاعت اللہ خاں شائع کروادینے کے وعدہ پر پاکستان لے گئے جہاں وہ برباد ہو گیا بیڈھب کا جو کچھ کلام میسر آسکا ہدیہ ناظرین ہے۔

اُن کے منہ تک جو نگالی جائے گی	آب کوثر سے کھنگالی جائے گی
نہتے کھیرے پتلے بیگن چاہئے	ایک کم سن کو یہ ڈالی جائے گی
سر پٹکتے دیکھ کر مجھ کو کہا	کیا یہ چو کھٹ توڑ ڈالی جائے گی
ہے ضرورت والدہ ایباد کی	اور ٹھنی ان کی بچپالی جائے گی
ہم اسی حسرت میں بوڑھے ہو گئے	کب تمہاری خورد سالی جائے گی
مے کے لے جانے کو بوتل چاہیے	پردے ہی میں پردہ والی جائے گی

عشق میں ہے جان کی پروا کسے
جائے لے بیڈھب جو سالی جائے گی

شیخ جی اپنے تقدس کا بیان کرتے رہے	اور ہم مٹھو میاں مٹھو میاں کرتے رہے
شوخیوں کرنے کے خوگر شوخیوں کرتے رہے	یارخاں کا کام جو تھا یار خاں کرتے رہے

دن دھاڑے ان کے کوچے میں فناں کرتے ہے
 آپ ادھر دیکھیں یہ ہمت یا رفاں کرتے ہے
 لوٹنے والوں نے لوٹا خوب لطف اتفاق
 ہم تھے ڈیسی لال، قوت رائیگاں کرتے ہے
 عمر بھی کیسے نبھی کیسے نبھائی کیا کہیں
 جو کہا بیوی نے وہ بیڑھب میاں کرتے ہے

دشمن اس طرح شب وصل مسلسل آئے
 کبھی پتو کبھی چپڑ کبھی کھٹمٹل آئے
 اونٹ کیوں کر کہیں ناصح کو گدھا کیسے کہیں
 ڈھینچو ڈھینچو ہی اسے آئے نہ بل بل آئے
 وصل کی حضرت ناصح نے بتادی تدبیر
 آپ کے واسطے دودھ آئے رساؤل آئے
 جھسے وہ بیڑھب کو دکھا کر بولے
 اس نمونے کی میرے واسطے مخمل آئے
 آج تو حضرت واعظ نے کرم فرمایا
 لیمپ ہٹ جائے زرادیر کو مکمل آئے
 بے ڈھب اس شوخ نے یہ کہہ کے دولتی جھاڑی
 نہ کسی کام کا ڈھب آئے نہ انکل آئے

فصیحت کرتے کرتے آگیا دل ان کے جو بن پر
 لگے منہ مارنے ناصح بھی حلوائے مرغن پر
 چھوٹو ندر اور لو کوٹوں، کا نہیں کچھ لطف اب باقی
 وہ مائل ہو گئے جب سے پٹاخوں کی دنادن پر
 کبھی تو نعرہ مسلم فقط اللہ اکبر تھا
 مگر اب ساتھ اس کے جسے بھی ہے گھنٹے کی ٹن ٹن پر
 تعجب ہے کہ دل پر جم گئی گرد کدورت کیوں
 درآغا کیلہ مائل ہے طبیعت اپنی دھو بن پر
 وہاں سے لوٹ کر کے باپ کو بھی بھول جاتے ہیں
 تعجب کیوں نہ ہو بیڑھب مجھے تعلیم لندن پر

جناب محمد حسن خاں شاکر

آپ کے والد ماجد کا نام علی محمد خاں تھا محلہ سنتری کے رہنے والے تھے۔ فقیر لکھنوی ثم لکھیم پوری کے شاگرد تھے۔ استعداد علمی اگرچہ معمولی تھی مگر موزونیت کا مادہ لے کر پیدا ہوئے تھے اس لئے شعر کہہ لیتے تھے اور شوق بھی تھا۔ کچھ جائیداد موروثی موجود تھی اس پر تمام عمر بسر کی۔ آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔ بہت خلیق اور ملنسار انسان تھے بڑی محبت سے پیش آتے تھے شاعری میں شہرت نصیب نہیں ہوئی۔ خانہ نشینی پسند تھی شعرا کے جلسوں میں کم شریک ہوتے تھے۔ سال رحلت معلوم نہیں۔ نمونہ کلام۔

پھر دل لگائیں گے نہ کسی دل ربا سے ہم
ان در پچوں سے مجھے سرد ہوائیں آئیں
مست کر دے ہمیں ساقی کہ گھٹائیں آئیں

اب کے بچے جو ہجر میں دست قضا سے ہم
سرد مہری سے تری سینہ جو صد چاک ہوا
کب سے دیتے ہیں دعائیں ترے منجھلنے کو

اپنی قسمت کے ستارے ان کے رخ کے خال ہیں
تم نہ کچھ ہو جاؤ گے مفلس نہ ہم کنگال ہیں
ناز برداری دلبر کے لئے حتمال ہیں

خوبی تقدیر سے ہم ایسے خوش اقبال ہیں
دل ہمارا لے کے بوسہ دینے میں حجت ہے کیا
صنعت سے لاغر ہیں شکل کاہ اے شاکر مگر

آنسو کی طرح گر پڑے رہ کر نگاہ میں
ہے غضب شاکر مسلمان قابوئے ہندو میں ہے
آگ کا انکار ہے یا دل مرا پہلو میں ہے
تو خم مے کی سمائی اک مرے چلو میں ہے

پہلو سے ہم اٹھائے گئے درد کی طرح
یار کا روئے منور سایہ کیسو میں ہے
سوز باطن سے جلا جاتا ہوں کیوں کر آئے چین
میکدے میں اس جہاں کے میں وہ عالی ظرف ہوں

ساقی کے ہجر میں مرا ساغر چھلک گیا
یا برگ گل سے قطرہ شبیم ڈھلک گیا
گل کا صبا کے ہاتھ سے دامن مسک گیا
انایلی کی آتی ہے صدایاں پردہ دل سے

دل خون ہو کے دیدہ تر سے ٹپک گیا
رخسار نازنین سے پسینہ ٹپک گیا
تار نظر سے بلبیل شیدار فو کرے
نہیں ہے کام مجھ مجنوں کو کچھ یلی کی محل سے

یہاں تک تمہارے ہجر میں ہم ناتواں ہوئے بے طاقتی سے رونگٹے تن پر گراں ہوئے

احمد اللہ خاں - شاکی

احمد اللہ خاں صاحب شاکی شاہجہاںپور کے قدیم باشندہ تھے۔ نسباً افغان تھے۔ شاکی کے اجداد کا شرفکے شہر میں شمار تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ذہین، خوش طبع، خوش رو اور خوش اطوار آدمی تھے۔ بسلسلہ ملازمت ریاست بھوپال میں عمر گزار دی۔ گاہے گاہے وطن بھی آتے تھے اور اعزہ واقربا سے مل کر واپس چلے جاتے تھے۔ ان کو فارسی میں بھی دستگاہ حاصل تھی۔ اردو فارسی دونوں میں شعر موزوں فرماتے تھے۔ طبعاً شاعر تھے۔ خانہہادر اعتبار الملک اقتدار جنگ افتخار الشعرا مولوی سید افتخار حسین صاحب مضطر خیر آبادی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ آپ کا دیوان 'جلوہ' زیور طباعت سے آراستہ ہو کر عوام و خواص سے داد وصول کر چکا ہے حضرت شاکی نے ہر صنعت سخن پر نہایت کامیابی سے طبع آزمائی کی۔ دیوان میں غزلیات - قصائد - نظمیں - سہرے - قطعات تاریخ - مستزاد وغیرہ شامل ہیں۔ قطعہ تاریخ کہنے پر آپ کو عبور حاصل تھا۔

نمونہ کلام

حشر بھی اک مری امید کا سماں ہوگا
کچھ تبستم ترے ہونٹوں پہ بھی رقصاں ہوگا
تیرا ملنا بھی اگر تا حد امکان ہوگا
درد خود حد سے گزر کر مراد رماں ہوگا
یہ بھی ادنیٰ سا فریب رُخ جاناں ہوگا
وہی اک روز رقیب سرو سماں ہوگا
چار قطروں سے بھی برپا کہیں طوفاں ہوگا
زلت پیچاں کے تسلسل میں بیاباں ہوگا
تیری حسرت وہ نہ ہوگی مراد رماں ہوگا
درد اپنا ہی شریکِ غم ہجر اں ہوگا

حسن کے زیب بدن جامہ عسریاں ہوگا
چھیتا دل کو نگاہوں کا فقط کام نہیں
شکل امکان بھی بدل دے گی ہماری قسمت
چارہ گر فکر تری کوشش لا حاصل ہے
حشر کے وعدہ دیدار پہ دل کہتا ہے
کیا خبر تھی کہ جس ارمان پہ جیتا ہوں میں
چشم گر یہ کا غلط دعویٰ طوفاں خیزی
مجھ کو دیتی ہے پتہ وسعت صحرے خیال
قید امکان نے جسے دل سے نکلنے نہ دیا
وقت پڑتا ہے تو کچھ اپنے ہی کام آتے ہیں

یوں بھی تو نام پس مرگ ہے گاشاکی
زینت دشت جنوں تارگر سیاں ہوگا

رشک گلشن نہ بنا سینہ صد چاک ہنوز
کس جگہ جا کے چھپا آؤں متاع دل کو
عاشقی لاکھ دکھاتی ہے امیدوں کی جھلک
آشیاں چھوڑے زمانہ ہوا جس بلبیل کو
داغ پر داغ دیئے جاتے ہیں افلاک ہنوز
تاک میں رہتے ہیں وہ دیدہ چالاک ہنوز
ہے پریشان مگر خاطر غمناک ہنوز
ڈھونڈتے پھرتے ہیں اس کو خس و خاشاک ہنوز
باندھ رکھی ہے بگولوں نے مری خاک ہنوز

بعد مردن بھی میں چکر میں پڑا ہوں شاک
ہائے باقی ہے وہی گردش افلاک ہنوز

بابورا میشور پر شاد چو بیچ

بابورا میشور پر شاد چو بیچ بی۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی وکیل شاہجہا پور قدیمی رہنے والے اس شہر
کے تھے۔ ہزل گو اور مزاج نگار ہونے کی وجہ سے مشاعروں کی جان تھے۔ آخر عمر میں اپنے فرزند کے پاس
لکھنؤ چلے گئے تھے جہاں انتقال ہو گیا۔ نمونہ کلام مشاعرے کی روداد سے نقل کیا گیا ہے۔

ہمیں وہ گر گٹوں کے رنگ میں شامل سمجھتے ہیں
ابھی کم سن ہیں وہ۔ کیوں وصل کی ہم آرزو رکھیں
نہ ہونے پر جو اس کے مرچکے ہیں ان کا کیا کہنا
پہلوں لوگ تیرے دست و پا پر جان دیتے ہیں
ہمیں کیا کوئی سودا ہے جو قانون نمک توڑیں

کبھی مردہ کبھی زندہ کبھی بسل سمجھتے ہیں
ہم اپنا قصہ دل شارد کا بل سمجھتے ہیں
مگر کے لفظ میں ہم کات کو فاضل سمجھتے ہیں
اسے مگر سمجھتے ہیں اسے ڈبیل سمجھتے ہیں
تمہارا ہم رخ روشن نمک کی سل سمجھتے ہیں

یہاں اشعار گیارہ چو بیچ لکھنے کی ہے پابندی
مگر ہم داستان بھر پیپر مل سمجھتے ہیں

ریاست علی خاں ریاست

ریاست علی خاں ریاست غلت شفاعت علی خاں صاحب کا واسطہ محلہ دلازاک جلال نگر کے ایک باعزت اور معزز نیز صاحب ثروت خاندان سے ہے ۵ اکتوبر ۱۹۲۵ء تاریخ ولادت ہے۔ ابتدائی تعلیم مقامی مدرسہ میں منشی چھدن خاں صاحب سے حاصل کی۔ نہرو انٹر کالج سے ہائی اسکول پاس کر کے بقیہ تعلیم پرائیویٹ طور پر تکمیل کو پہنچائی۔ آپ انگریزی، فارسی اور معاشیات میں ایم۔ اے ہیں اور اسلامیہ انٹر کالج شاہجہانپور میں پرنسپل کے جلیل القدر عہدے پر سرفراز رہے۔ ۱۹۶۵ء سے شوق شاعری پیدا ہوا۔ استاد وقت حضرت پیارے میاں رشید کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ تقریباً بیس سال سے مشق سخن جاری ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

شام ہوتی ہے کہیں اب نہ سحر ہوتی ہے	زندگی موت کے عالم میں بسر ہوتی ہے
گردش دہر سے گزرے گی خدایا کیسے	بس یہی دل میں خلش آٹھ پہر ہوتی ہے

حق پہ اس دور میں جو مسائل ہے	فی الحقیقت وہ مرد کال ہے
گر کے نظروں سے ٹوٹ جائے گا	سخت نازک یہ شیشہ دل ہے
عزم محکم ہو اور عمل پیہم	پھر تو آسان ہے جو مشکل ہے

آرام ہم کو مل نہ سکا ہم جہاں رہے	اے سوزِ غم بتا دل وحشی کہاں رہے
تو نے جو غم دیا وہ ہے سرچشمہ حیات	اب دل یہ چاہتا ہے غم جاوداں ہے

آنکھیں نہ بند ہو سکیں مرنے کے بعد بھی	شاید کچھ انتظار ابھی نامہ بر کا ہے
قانع ہے اپنے حال پہ جو خوش نصیب ہے	اس کا کوئی ہوس نہ جنوں مال و زر کا ہے

کس حال میں ہوں اور گزرتی ہے کس طرح	مدت ہوئی ملی نہیں اپنی خبر مجھے
وہ منزلیں بھی آئی ہیں راہ حیات میں	جن میں کبھی ملا نہ کوئی ہم سفر مجھے

منشی فتح چند شاداں

منشی فتح چند شاداں کے والد کا نام منشی پریم نرائن ساکن موضع پینا خور دضلع شاہجہانپور آپ
یکم جنوری ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئے۔ شہر میں دسویں درجہ تک تعلیم حاصل کی۔

شاعری کا شوق کشاں کشاں حضرت صدیق حسن اسعد شاہجہانپوری کے در دولت پر لے گیا
اور آپ نے ادب سے ان کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔

نمونہ کلام

جب نیاز عشق سے مخمور ہو جائیں گے ہم	مد ظلمت سے گزر کر نور ہو جائیں گے ہم
دل کے ہاتھوں جب کبھی مجبور ہو جائیں گے ہم	صحبت اہل سکوں سے دور ہو جائیں گے ہم
بادۂ عرفاں سے جب مخمور ہو جائیں گے ہم	ہوش کی دنیا سے کوسوں دور ہو جائیں گے ہم
التجائے دید کرتے کرتے اسے دل دیکھنا	خود کسی دن جلوہ گاہ طور ہو جائیں گے ہم
غم نہیں کچھ ہم کو مرگ ناگہاں کا غم نہیں	بچھ سے اسے درد جگر بہجور ہو جائیں گے ہم

آج شاداں ہنس کے ہرزخم جگر کہنے لگا
بلد چشم خونچکاں ناسور ہو جائیں گے ہم

ترس کچھ حال دل پر آگیا ہے	کہ واعظ چھڑ کر شرما گیا ہے
مقابل ہیں شبِ غم یا سحریاں	سنبھالو دل میرا گھبرا گیا ہے
نظر کی سحر پردازی سے کہہ دو	جسے کھانا تھا دھوکا کھا گیا ہے
بتائے چارہ ساز وحشت دل	میری وحشت سے کیوں گھبرا گیا ہے

فسانے عشق کے سن سن کے شاداں
دل غم آشنا کتا گیا ہے

مولوی محمد عبدالحمیٰ خاں - آشفۃ

حضرت آشفۃ کے والد ماجد مولوی عبدالغنی خاں صاحب جید عالم تھے۔ مدرسہ عین العسلم شاہجہانپور میں پالیس سال صدر مدرس رہے بعدہ آپ مدرسہ امینیہ دہلی میں صدر مفتی کے فرائض انجام دیتے رہے آخر عمر میں اپنے وطن شاہجہانپور تشریف لے آئے اور یہیں رحلت فرمائی۔ حضرت آشفۃ یکم جنوری ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۴۲ء میں مولوی فاضل اور ۱۹۴۵ء میں منشی فاضل کے امتحانات پاس کئے۔ انٹر کے بعد آپ اسلامیہ انٹر کالج شاہجہانپور میں عربی کے استاد ہو گئے اور اب تک اسی ادارے میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ شعر و شاعری کا شوق حضرت پیارے میاں کی صحبت سے پیدا ہوا اور ان کے تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ عبدالحمیٰ خاں صاحب شریف الطبع دین اور مرجان مرخ انسان ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے مشق سخن جاری ہے۔ چونکہ عربی اور فارسی میں اچھی استعداد رکھتے ہیں اسی لئے فارسی تراکیب آپ کے کلام میں نمایاں نظر آتی ہیں۔

نمونہ کلام ہدیہ ناظرین ہے۔

ہستی دل تھی فقط پیکر تسلیم و رضا
ہم تو نیرنگی قسمت کا گلہ کرتے تھے
رکھ دیا اس میں تمنا کا شرار کس نے
تم خفا کیوں ہو لیا نام تمہارا کس نے

میں یوں اک اک کا منہ تکتا رہا ہوں ان کی مغل میں
بجھتے تھے کہ اک اک گام ہمت آزما ہوگا
کہ شاید ذکر میرا برسبیل گفتگو نکلے
مگر تیری طلب میں پھر بھی اہل آرزو نکلے
مگر رونا یہ ہے اپنے بھی جو تھے حیلہ جو نکلے
زمانے میں بھلا آشفۃ غیروں کی شکایت کیا

تمہارا حال کیا ہوتا زمانے میں کبھی سوچا
شکایت کیا گلہ کیسا مقدر جب یہی ٹھہرا
اگر کرتے تمہاری طرح سے بیگانہ پن ہم بھی
اٹھاتے ہیں چلو جب تک اٹھیں رنج و محن ہم بھی
ہے بن کر غبار خاطر اہل وطن ہم بھی
بھلایا لاکھ سب نے اپنے دل سے لیکن آشفۃ

ارادہ کرتا رہے ہو ہمیں مٹانے کا
کرو گے کیا جو بڑھا شوق ظلم ڈھانے کا

طریق اہل محبت نہیں یہ آشفۃ کبھی ہے شکوہ فلک کا کبھی زمانے کا

آرزوں سے تمناؤں سے ارمانوں سے قصہ غم کی ہے زینت انھیں عنوانوں سے
بے خبر اس سے کہ ہستی کی قبا ہو گئی چاک ایک اک غنچہ کھلا تھا بڑے ارمانوں سے

شفیق حسن خاں - شفیق مینائی

اعتبار الملک مولوی حکیم ضمیر حسن خاں صاحب دل کے چھوٹے بیٹے شفیق حسن خاں صاحب شفیق بروز عبد الضحیٰ ۱۹۲۹ء کو محلہ ہاتھی تھان میں پیدا ہوئے۔ مشفق اور لائق باپ کی آغوش میں تعلیم و تربیت ہوئی۔ ادیب کامل اور انٹر میڈیٹ سے آگے بسبب خرابی صحت سلسلہ تعلیم جاری نہ رہا۔ عین اٹھان کے زمانے میں تپ دق کے موزی آزار نے آدب و چاہ۔ بفضلہ مالی حالت بہت اچھی تھی۔ ہر ممکنہ علاج کیا گیا مگر بقولے مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ حضرت ظہور احمد وحشی نے کیا خوب شعر کہا۔

خندہ زن ہے تپ اُلفت جو دوا کرتے ہیں

مکراتی ہے مشیت جو دعا کرتے ہیں

دوا و دعا کوئی کارگر نہ ہوئی۔ یہ ہو ہنار اور اپنے والد کا حقیقی جاں نشین شاعر عین اس وقت ہمارے درمیاں سے اٹھ گیا جب اس کی شاعری کا آفتاب بلند ہو چکا تھا اور جس کی حیات آفریں کر نہیں دوسروں کو سرشار کر رہی تھیں۔ ۱۹۷۹ء کو یہ آفتاب غروب ہو گیا۔

شفیق مرحوم طبع موزوں لے کر پیدا ہوئے تھے اور گھر کا ماحول بھی ایسا تھا کہ ہر وقت شعرو شاعری کا چرچا رہتا۔ ہندوستان کے مسئلہ اساتذہ مقبول و معروف شعراء حضرت دل کے مہمان ہوتے تو کئی کئی روز محفلیں جمتیں۔ شعرو سخن کی مجالس میں شفیق بھی دلچسپی لیتے۔ دل صاحب کے تلامذہ استاد کو گھیرے رہتے اور حسب توفیق استفادہ کرتے یہ سارا ماحول ایسا نہ تھا کہ شفیق خاموش تماشائی بنے رہتے۔ ابتدائی زندگی سے اشعار موزوں کرنا شروع کر دیئے تھے۔ والد محترم کی توجہ خاص حاصل تھی جس نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ جوہر کھلنے لگے۔ کلی کھلی تو

ہک گھر کے آنگن سے ہوا باہر اڑا لے گئی۔ شفیق شہر کے مشاعروں میں شرکت کرتے اور بھر پور داد پاتے۔ گاہے گاہے بیرون شہر مشاعروں میں حضرت دل کے ہمراہ شریک ہوتے اور جاتے رہتے تھے۔ تقریباً دس بارہ سال کی توجہ اور والد محترم کی رہنمائی نے ہر صنفِ سخن کے رموز و نکات سے آگاہ کر دیا تھا لیکن مزاج کا جھکاؤ رباعی کی جانب بمقابلہ دیگر اصناف کے زیادہ تھا۔ صنف رباعی میں مہارت پیدا کر لی تھی اور یہی ان کے ہر قسم کے خیالات، احساسات، جذبات اور تصورات کے اظہار کا وسیلہ ٹھہری تھی۔ علالت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ بیماری زور پکڑتی تو گھر میں روپوش رہتے۔ ۱۹۶۶ء میں اپنی رباعیات کا انتخاب کر لیا تھا اور اس کو اپنی زندگی ہی میں طبع کرانے کی آرزو تھی مگر قدرت کا فیصلہ کسی کی آرزو کا پابند نہیں ہوتا۔ روز بروز بگڑتی ہوئی حالت نے اتنی مہلت نہ دی کہ انتخاب و ترتیب کے بعد کے مرحلوں سے گزار کر نغمخانہ خیام کو وہ اپنی نظروں سے دیکھ کر کچھ دیر کے لئے سکون حاصل کر سکتے۔ بستر علالت پر مشقِ سخن جاری رہی اپنی بے چینی، کرب و اذیت کا اظہار رباعیوں میں کرتے رہے۔ شفیق کے انتقال کے بعد شبیر حسن خاں صاحب ایڈووکیٹ نے اپنے اکلوتے اور عزیز از جان چھوٹے بھائی کی دیرینہ آرزو کو تکمیل تک پہنچا دیا۔ 'نغمخانہ خیام' کی طباعت سے یقیناً شفیق مرحوم کی روح کو سکون مل گیا ہوگا شفیق مینائی نے تلامذہ حضرت امیر مینائی کے حالات تلاش کر کے بالاقساط رسائل میں شائع کرائے۔ وہ نثری کام بھی کرتے رہتے تھے۔

اب شفیق مرحوم کی تخلیقی قوتیں ان کے کلام میں ملاحظہ فرمائیں۔

پر کیف و صنیریز فضا سے کشمیر جاں بخش و طرب خیز ہوائے کشمیر
ہم اہل محبت ہیں کریں گے نہ قبول جنت بھی اگر ملے بجائے کشمیر
اپنی شدید علالت کے دوران جو تاثرات ذہن میں چبھتے تھے ان کو یوں بیان کیا۔

چارہ نہیں کوئی بے قراروں کے لئے تسکین کہاں ہے دلفگاروں کے لئے
کل جن کے تصرف میں گلستاں تھا شفیق وہ آج ترستے ہیں بہاروں کے لئے

افتادِ تھمتل سے سہی ہے میں نے آلام میں سعیِ ضبط کی ہے میں نے
درپردہ کسی کا ہے بہارا جس سے ہر غم کو شکست فاش دی ہے میں نے

شفیق مینائی کی غزلیہ شاعری کا نمونہ

طوفاں کی طرت بڑھ لب دریا سے گزر جا
کافی ہے غم دل غم دنیا سے گزر جا
اظہار تمنا بھی ہے اک جرم مجتہ
ممکن ہو تو اظہار تمنا سے گزر جا
بے کیف نہیں تشنگی شوق کی لذت
اے محو طلب ساغر و مینا سے گزر جا
تکمیل طلب ترک طلب ہی میں نہاں ہے
دُنیا کی تمنا ہے تو دُنیا سے گزر جا

ہمت کے دھنی ہیں دل والے ناکام سہی برباد سہی
آئی نہ کبھی ماتھے پہ شکن ہر روز نئی افتاد سہی
ہنگامہ پسند اپنی فطرت ہر حال میں تسکین باقی ہے
راحت نہ سہی آزار سہی نغمہ نہ سہی فریاد سہی

میں چشم تر سے ستارے بکھیر دوں ہر سو
تو مسکرا کے شب ماہتاب پیدا کر

جہاں سے کاروان رنگ و بوا کثر گزرتے تھے
ترستا ہے بہاروں کو وہی ویرانہ برسوں سے

عشق اک بار امانت ہے ہنسی کھیل نہیں
اہل دل نے بھی اٹھایا ہے تو مشکل سے اٹھا

عجب ہے اہل وفا کا مسلک کوئی نہ سمجھایہ راز اب تک
خرہ کی راہوں میں سب سے پیچھے جنوں کی راہوں میں سب سے آگے

کبھی اجالا کبھی اندھیرا انھیں حدوں میں رہا بسیرا
نکل سکا کاروان ہستی نہ منزل روز و شب سے آگے

مری چشم خون یار کیا دیکھتے ہو
مے دل میں زخم نہاں اور بھی ہیں
خموشی کو جب آزمایا تو سمجھے
کہ اسلوب آہ و فغاں اور بھی ہیں
شفیق ان کو شاید یقین وفا ہے
وہ اب مجھ سے دامن کشاں اور بھی ہیں

آنڈسروپ سری واستو۔ احقر

آنڈسروپ سری واستو احقر خلع جناب اشرفی لال سری واستو ۱۲ جنوری ۱۹۲۹ء کو اپنے آبائی مکان واقع محلہ دلاور گنج میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں ہائی اسکول پاس کیا۔ ہائی اسکول تک اردو فارسی بطور مضامین پڑھی اور شاعری میں مولوی تفضل حسین سے جو مشن اسکول میں منیجر تھے مشورہ سخن لیا۔ اس وقت ایک مقامی تعلیمی ادارے میں ہیڈ اکاؤنٹنٹ ہیں۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

یاس کا مخزن ہے دل میں آس کا سامان بھی ہے	یعنی گھر آباد بھی میرا ہے اور ویراں بھی ہے
وہ ہیں نظروں میں مرے اور وصل کا سامان بھی ہے	درد بھی پہلو میں ہے اور درد کا درماں بھی ہے
چشم حق ہیں کو نہیں دشوار کچھ راہ طلب	منزل ہستی بہت مشکل بھی ہے آساں بھی ہے
زندگی کس کی جہاں غم میں عشرت سے کٹی	جس کو دیکھو دہر میں خنداں بھی گریاں بھی ہے

جز عقیدت کیا تو اضع احقر میکس سے ہو
میزباں بھی خانہ دل کا ہے تو ہماں بھی ہے

بشر کی زندگی کیا ہے قفس کا آنا جانا ہے جہاں یہ نار ٹوٹا ختم پھر سارا فسانہ ہے

اونکار سہارے سکسینہ۔ میکیش

جناب اونکار سہارے سکسینہ کے والد ماجد کا نام بابو جگدیش سہارے سکسینہ ہے۔ آپ کی ۱۵ جنوری ۱۹۳۶ء کو ولادت ہوئی۔ اردو بطور خاص پڑھی اور اردو کے ساتھ گریجویٹیشن کیا۔ شعر و شاعری کا شوق ابتدائی زندگی سے ہے۔ آپ کے دادا مکھٹ بہاری لال حیراں حکیم رگھیر سہارے بریاں وشادان جہاں آبادی کے شاگرد تھے۔ اس طرح ذوق شعری آپ کی رگوں میں خون کے ساتھ رواں دواں ہے۔ آپ کی قدیمی سکونت محلہ رنگ محلے میں تھی مگر آپ بذات خود محلہ بہادر گنج میں بس گئے۔ شوگر کین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں بعبہ

اکاؤنٹنٹ ملازم ہیں۔ آپ کے والد بابو جگدیش سہائے سکسینہ خود شاعر نہ تھے مگر صاحبِ ذوق اور سخن فہم تھے بابو اونکار سہائے میکش اولاً اعتباراً الملک حکیم ضمیر حسن خاں صاحبِ دل سے رجوع ہوئے کچھ دن بعد حضرت دل نے اپنے جانشین ولایت شاگرد حضرت عابد مینائی کے سپرد کر دیا۔ میکش صاحب مقامی شاعروں میں ذوق و شوق سے شریک ہوتے ہیں اور مشق سخن سے اپنا مقام بنا لیا ہے۔ حضرت عابد مینائی کی گمشدگی کے بعد ذوق سلیم اور مطالعہ آپ کا رہبر ہے۔ آپ کا رجحان غزل کی طرف زیادہ ہے لیکن آپ قطعات۔ رباعیات۔ نظمیں۔ مہرے اور کبھی کبھی گیت بھی لکھتے ہیں۔ نمونہ کلام حضرت میکش۔

قطعہ

جس کی راہیں نہ کہیں ہوں وہی منزل ہوں میں
جس کے ٹکڑے نہ جڑیں ٹوٹ کے وہ دل ہوں میں
کس سے افسانہ نا کامی تقدیر کہوں
تیرنی محفل میں بھی بیگانہ محفل ہوں میں

کلام حضرت میکش

کوئی آتا ہے جب چمن کی طرف
غنیہ غنیہ سکون پاتا ہے
مسکراتے ہیں جب لب نازک
دل کا ہر زخم مسکراتا ہے

دنیا مجھ کو راس نہ آئی
تسکیں میرے پاس نہ آئی
کل کا بھروسہ کیا ہو میکش
آئی آئی سانس نہ آئی

نغمہ زندگی تمام ہوا
دور صہما سے ایک جام ہوا
مر کے بھی چین کب نصیب ہوئی
تذکرہ میرا صبح و شام ہوا

کوئی مشکل نہ ہو سکی آسان
مختصر ہے یہ میرا افسانہ
بدگماں کیوں نہ ہوں دعاؤں سے
ہر دعا ہے اثر سے بیگانہ

اٹھ رہا ہے وہ جو گشن سے دھواں
 کس لئے کرتی ہیں زحمت بجلیاں
 جل رہا ہے کیا ہمارا آسٹیاں
 پھونک دوں گا خود میں اپنا آسٹیاں
 ایک اک سُرخ مری روداد کی
 بن گئی ہے اک مکمل داستاں
 شکر یہ تیرا نگاہ بے اماں
 بڑھ گئیں کچھ زندگی کی تلخیاں
 ہے یہی کیا کم کہ از راہِ کرم
 اس نے میکش سن لی میری داستاں

محبوب حسن خاں نظر

نظر صاحب کا سن ولادت ۱۹۳۲ء ہے۔ سن شعور ہی سے شعر و شاعری کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ طبیعت رسالتی اگرچہ استعدادِ علمی بہت زیادہ نہ تھی لیکن مطالعہ اچھا تھا۔ شاعری میں استاد کے مرہونِ منت نہیں ہوئے۔ فکر رساکو رہبر بنایا۔ غزل کے جس نئے آہنگ و اسلوب سے نظر نے ادب کو روشناس کرایا وہ انہی کا کام تھا۔ عین عالمِ جوانی بمرچونٹیس سال بلندھرمیں مبتلا ہو کر ۵ جولائی ۱۹۶۶ء میں دنیا کو خیر باد کہہ دیا۔ کلودنگ فیکٹری شاہجہانپور میں ملازم تھے اپنے پیچھے نوجوان بیوہ اور پچھے چھوڑے۔ نمونہ کلام

اک ضو بہت ہے تیرے غمِ صد صفات کی
 دیتا ہوں تیری چشمِ تغافل کو میں دُعا
 میں کیا کروں گاے کے خوشی کا ثنات کی
 اس حادثے نے عمر بڑھادی حیات کی
 اک بار ہی اٹھی تھی نظر التفات کی
 اس جستجو میں ایک جھلک ہے حیات کی
 دیوانے تیرے حد جنوں سے گزر گئے
 زلفیں سنواری ہیں مگر کا ثنات کی
 عرفانِ زندگی نہ ہوا اس کو اے نظر
 جس نے زمیں پہ رہ کے ستاروں کی بات کی

ان کے انداز سے گو جان پہ بن آئی ہے
 کیا کروں ترکِ محبت میں بھی رسوائی ہے

عظمتِ جیب و گریباں بھی نگاہوں میں رہے
 اے جنوں ہوش میں رہنا کہ بہار آئی ہے
 بے وفا کہتی ہے دنیا تو کوئی بات نہیں
 آپ ایسا نہ کہیں یہ مری رسوائی ہے
 یہ بتا دیجیے اس نازِ تبسم کی قسم
 یوں ہی کچھ پھول کھلے ہیں کہ بہار آئی ہے
 اے نظر آئے ہیں ایسے بھی مقاماتِ حیات
 میں نے جب دولتِ کونین بھی ٹھکرانی ہے

رحمت شاہ خاں - رزمی

نادر شاہ خاں کے فرزند رحمت شاہ خاں ۱۹۳۲ء میں پیدا ہوئے۔ نادر شاہ خاں پولیس فورس
 ریلوے میں ملازم تھے۔ تمام عمر بسلسلہ ملازمت وطن سے باہر رہے۔ رزمی نے بھی اپنے والد ماجد کے
 ہمراہ مختلف مقامات میں قیام کیا اور گھریلو تعلیم حاصل کرتے رہے۔ بارہ سال کی عمر میں ساید پوری
 سے محروم ہو گئے کسی نہ کسی طرح ہائی اسکول پانچ کر کے والد مرحوم کی جگہ ملازمت حاصل کر لی شعر و سخن
 سے دلچسپی اوائل عمر سے تھی۔ حضرت عابد مینائی جانشین حضرت دل کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہو کر
 مشورہ سخن لینے لگے۔ ایک مجموعہ کلام 'شاہد فطرت' طبع ہو چکا ہے آپ کا تبادلہ جب ہردوئی کا
 ہوا تو وہاں کی ادبی سرگرمیوں میں ڈوب گئے لیکن قضا ساتھ ساتھ رہی پہلی جنوری ۱۹۸۱ء کو اپنے
 آہنی پنجوں میں دبوچ کر رزمی کو اڑائے گئی ہردوئی میں مدفون ہوئے۔ نمونہ کلام

پینے کا ہو گا اذن عام آج نہیں توکل سہی
 ایسی بھی ہوگی ایک شام آج نہیں توکل سہی
 اس کی نوازشوں پہ ہے رزمی مجھے تو اعتماد
 بگڑے ہوئے بنیں گے کام آج نہیں توکل سہی
 مجھ کو ہر ایک غم ہے گوارا
 اتنا کہہ دو کہ تو ہے ہمارا
 مجھ کو دھوکا ہوا ہے یہ اکثر
 جیسے تم نے کہیں سے پکارا
 درمیکدہ اور اہل طریقت
 یہ کیا انقلاب آج ہم دیکھتے ہیں

مطبع اللہ خاں حسرت کمالی

مطبع اللہ خاں صاحب حسرت کمالی کے والد ماجد منشی رفیع اللہ خاں صاحب مرحوم پولیس آفیسر تھے۔ ان کے دوران ملازمت حسرت صاحب ۱۸ جنوری ۱۹۲۷ء کو مراد آباد میں پیدا ہوئے۔ منشی رفیع اللہ خاں صاحب ۱۹۲۷ء میں پنشن لے کر شاہجہانپور آگئے۔ آبائی سکونت محلہ لکراکلاں کی تھی مگر وہاں کی بودوباش ترک کر کے محلہ قاضی خیل میں مکان تعمیر کیا اور رہائش اختیار کی۔ والد کی میت ملازمت ختم ہونے کے وقت حسرت صاحب آٹھ سال کے تھے۔ ناظرہ قرآن اور ابتدائی اردو ختم کر کے اسکول میں داخلہ لیا۔ ۱۹۲۹ء میں اسلامیہ ہائر سکولری اسکول سے انٹرنس ۱۹۵۲ء میں گاندھی فیض عام ڈگری کالج شاہجہانپور سے بی۔ ایس۔ سی۔ ۱۹۵۵ء میں الہ آباد بورڈ سے منشی کامل ۱۹۵۵ء میں ایم۔ ایس۔ سی (ریاضی) کے امتحانات پاس کئے اور ۱۹۵۷ء میں ایم۔ اے (اردو) میں امتیازی حیثیت سے کامیاب ہوئے۔ حسرت صاحب کے والد صاحب نے احباب کے مشورے پر کھنڈ ساری کا کاروبار کیا جس میں اپنی کاروباری نا تجربہ کاری کے سبب ناکام رہے۔ کل جمع شدہ پونجی ناکام کاروبار کی نذر ہو گئی ان حالات میں حسرت صاحب کو ملازمت کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اسلامیہ ہائی اسکول ملیر کوٹلہ میں مدرس ہو گئے۔ دوران ملازمت علی گڑھ سے بی۔ ایڈ کی سند حاصل کی اور ملازمت سے مستعفی ہو کر شاہجہانپور آگئے۔ مختلف مدارس میں ریاضی اور سائنس کے استاد رہے اب مستقلاً اسلامیہ انٹر کالج میں ریاضی کے واحد لکچرر ہیں۔ مطبع اللہ خاں صاحب حسرت کو بچپن ہی سے اردو زبان سے خاص دلچسپی رہی۔ ختم قرآن کے بعد طلسم ہو شربا۔ فسانہ آزاد۔ داستان امیر حمزہ۔ فسانہ عجائب۔ قصہ گل بکاوی اور باغ و بہار کا مطالعہ کیا۔ سائنس کے طالب علم ہونے کے باوجود آپ نے اردو میں مہارت و عربی سے واقفیت حاصل کر لی شاعری کا آغاز ملیر کوٹلہ کے دوران قیام ہوا۔ حضرت کمال تلہر کوٹلوی کے آگے رانوںے تلمذ تہہ کیا اور گوہر تخلص اختیار کر کے وہاں کی ادبی و شعری زندگی میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۵۵ء میں ملازمت سے مستعفی ہو کر جب شاہجہانپور آگئے تو اپنے استاد حضرت مال ملیر کوٹلوی کی اجازت سے شہر کے ذی استعداد اور صاحب علم و فن استاذی ارشاد حسین رف حضرت پیارے میاں رشید کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہو گئے۔ حضرت پیارے میاں رشید کے ایما پر گوہر تخلص ترک کر کے حسرت کمالی اختیار کر لیا۔ ان کے کلام میں فکر کی گہرائی

ہے۔ کلام بطور نمونہ قارئین کے پیش نظر ہے۔

غزل

تشنہ تشنہ نظریں ہیں داغ داغ دامن ہے
سو گئے تو چونکا یا چس دیئے تو بہکا یا
جب کرم تھا ساقی کا خم لٹھائے جاتے تھے
یاد ہے تری دل میں جلوہ ہے زگا ہوں میں
آج تک خفا مجھ سے تھے فقط کرم فرما
وہ جنوں کے صحرا ہیں یہ وفا کا گلشن ہے
دل عجیب رہبر ہے دل عجیب رہزن ہے
بوند بوند پہ اب تو میکشوں میں ان بن ہے
پچھے پچھے رہبر ہے آگے آگے رہزن ہے
آہ وہ تھمگر بھی اب تو مجھ سے بدظن ہے

شاعری جسے کہیے آپ سے ہو کیا حسرت
وہ عطائے فطرت ہے اور قدرت فن ہے

گلستانوں سے وابستہ نہ ویرانوں سے وابستہ
چمن کے زمزمے منت کش ارباب دانش ہیں
میرے احوال غم پہ آپ طننا مسکراتے ہیں
سلیقہ سیکھ لیں اہل چمن تمہیں گلشن کا
یہ روداد بیاباں ہے یہاں کانٹے ہی کانٹے ہیں
ابھی ہے شوق ناچختہ ابھی لذت ہے سوزش میں
ہے تعمیر نشیمن دل کے ارمانوں سے وابستہ
بیابانوں کے ہنگامے ہیں دیوانوں سے وابستہ
دو عالم کی حقیقت ہے ان افسانوں سے وابستہ
اسی حد تک یہ دیوانے ہیں فرزانوں سے وابستہ
گل وریحان کے عنوان ہیں گلستانوں سے وابستہ
مسیحا زخم دل کب تک نمکدانوں سے وابستہ

تن آسانوں کو کیا معلوم لطف زندگی حسرت
یہ وہ شے ہے جو رہتی ہے پریشانوں سے وابستہ

سید احمد سحر شیدی

جناب سید احمد سحر کے والد ماجد کا نام سید اسحاق میاں ہے۔ محلہ علی زئی کے رہنے والے
ہیں۔ آپ کی ولادت ۱۵ اگست ۱۹۳۵ء کو ہوئی۔ مدرسین اعلم سے منشی اور مقامی کالج سے
بی۔ اے کے امتحانات پاس کئے۔ سٹی بورڈ شاہجہانپور میں سپرنٹنڈنٹ روشنی کے عہدے پر فائز

ہیں۔ اپنے حقیقی ماموں اور شاہجہاںپور کے صاحب علم و فن حضرت استاذی سید ارشاد حسین عرف
پیارے میاں رشید مرحوم سے مشورہ سخن کیا۔ مجموعے آئینہ سحر ۱۹۸۳ء سحر رنگ ۱۹۸۶ء سحر
نشاں ۱۹۹۰ء متاع نور سحر ۱۹۹۳ء شائع ہو چکے ہیں۔ کئی مجموعوں پر انعام بھی ملا۔

اشعار
اہل وفا کے دل میں ہے جب تک لہو کا نام
روشن رہے گا اس چمن رنگ و بو کا نام

ہماری نسل کتابوں میں پڑھ کے چوٹے گی کہ آدمی کو کبھی پیار آدمی سے تھا

پاؤں کے نیچے تو زمین نہیں لوگ کرتے ہیں آسماں کی بات
جام میں آفتاب اترے تو کچھ چھڑے تو فروغ جاں کی بات

کہاں دیکھی تھی ایسی گرمی بازار دلی میں کہاں تھا بمبئی میں اس سے پہلے شور و شر ایسا

دستار اپنی اپنی سنبھالے ہوئے تھے لوگ ایسے ہیں ہوش کس کو کسی کی ردا کا تھا

لئے پھری ہے مجھے قریہ قریہ کا وکسر دل ملانہ کوئے محبت سے راستہ بہتر

اک نہ اک موجد خون گزرے ہے سر سے شب و روز
ان حوادث نے بس اک میرا ہی گھر دیکھا ہے

کہاں چلے گئے ان بستیوں کو چھوڑ کے لوگ نہ صورتیں وہ کہیں ہیں۔ نہ صحبتیں باقی

شمع کا شعلہ جب لہرایا اٹھا اک بیتاب ہجوم
آخر شب تک جلتے مرتے دیکھے ہیں دیوانے چند

لہو سے ہوتا ہے روشن چسراغ بزم خیال
سخنوری بھی عبادت نہیں تو پھر کیا ہے

ہمت یہ ایسے طائر زخمی کی آفریں
اڑنے کو بے قرار ہے گو پر بربیدہ ہے

رات کٹی جا رہی ہے انتظار صبح میں
یہ چراغ زندگی ہنس ہنس کے جلتا جائے ہے

لاکھ تیور بدل کے بات کہی آگیا پھر بھی التماس کارنگ

ہمارے عہد میں نامعتبر وہی ہیں جنہیں
ذرا خیال کچھ اپنے حسب نسب کا ہے

اپنی نظر سے کل کا ناقد پر کھے گافن پاروں کو
کل تک تو یہ منظر نامہ یکسر دھندلا جائے گا
غزل

مکانوں سے دھواں آہوں کا رہ رہ کر نکلتا ہے
گلی کوچوں سے ہو کر جب کوئی لشکر نکلتا ہے
نہ ڈالو قتل و خون کا بیج اس زرخیز مٹی میں
کہ ہر سر کے عوض اس کھیت سے لشکر نکلتا ہے
کئے دیتی ہے شل اعصاب کو یہ نفرت انگیزی
سما جائے تو پھر مشکل سے دل کا ڈر نکلتا ہے
نظر آتا ہے کیوں سارا جہاں اس کو حریف اپنا
جو وہ جھوٹی انا کے خول سے باہر نکلتا ہے

کہیں کم قامتوں کی بھیڑ میں گم ہونہ جاؤں میں
جسے دیکھو وہ اندازے سے کچھ بڑھ کر نکلتا ہے

عجب شہر خموشاں ہے دلِ خانہ خراب اپنا
کہ ایک اک قبر سے یادوں کا اک لشکر نکلتا ہے
جسے ارمان ہو آگے بڑھ کے آئے اور قلم کر لے
ہزاروں میں نمایاں ہے سحر جو سر نکلتا ہے

عزیز احمد خاں - عزیز

عزیز احمد خاں صاحب کے مورث اعلیٰ ولایت افغانستان سے بسلسلہ تجارت رشیم وارد ہند ہوئے۔ یہاں کی آب و ہوا اور شادابی نے اس طرح متاثر کیا کہ یہیں کے ہو رہے۔ آپ نسباً علی زئی پٹھان ہیں۔ آبادی شہر کے وقت بانی شاہجہا پور نے ہر قبیلے کو الگ الگ بسایا تھا۔ آپ کے اجداد بھی اپنے ہم قبیلہ علی زئیوں میں آئے۔ عزیز صاحب کے جد کے حقیقی ماموں جناب عبدالواحد خاں صاحب ساکن محلے ترین بہادر گنج لاؤلد تھے ان کے انتقال کے بعد وسیع جائیداد جس میں متعدد مکانات اور چودہ^{۱۳} مسلم مواضع شامل تھے وراثت میں ان کو پہنچے یہ علی زئی کی سکونت ترک کر کے مرحوم ماموں کے عالی شان مکان میں منتقل ہو گئے۔ ان کی نسل اب تک اسی مکان میں قیام پذیر ہے۔ عزیز احمد خاں عزیز کے والد ماجد کا نام حامد علی خاں صاحب ہے۔ عزیز صاحب کی ولادت ۱۹۳۵ء میں ہوئی رواج کے مطابق اردو فارسی گھر ہی پر ایک مولوی صاحب سے پڑھی۔ انگریزی کے لئے اسلامیہ کالج میں پڑھ کر انٹر پاس کیا۔ ۱۹۵۶ء سے شوق شاعری ہے۔ ابتدا میں حضرت رباب رشیدی شاہجہا پوری سے مشورہ سخن کیا۔ اصناف سخن میں آپ کو رباعی سے از حد دلچسپی ہے۔ حضرت شفیق مینائی مرحوم خلف اعتبار الملک حضرت دل شاہجہا پوری کے بعد اس صنف میں آپ کا مخصوص مقام ہے۔ یوں تو دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی فرماتے ہیں۔ غزل میں بھی آپ کو امتیاز حاصل ہے۔ نہایت خوش اخلاق۔ متواضع اور خوش خیال انسان ہیں۔ شہرت کے طالب نہیں ورنہ، آپ کا ہندوستان کے ممتاز شاعروں میں شمار ہوتا۔ رباعیوں کا ایک انتخاب جلد ہی طبع ہو کر منظر عام پر آنے والا ہے۔

بطور نمونہ کلام چند رباعیات - قطعات اور غزلیں پیش ہیں -

ماضی کے اندھیروں سے سبق لینا ہے تاریخ کا موضوع ادق لینا ہے
دیکھا تو بہت مانگ کے لیکن اب ہم یہ سوچ کے اٹھے ہیں کہ حق لینا ہے

غموں میں رہ کے جینا آگیا ہے محبت کا قرینہ آگیا ہے
زہے قسمت کہ منزل سر تو کر لی مگر دانتوں پسینہ آگیا ہے

خدا نے بخشی ہے مجھ کو یہ نعمت عظمیٰ ہر ایک طنز کو میں ہنس کے ٹال دیتا ہوں
کسی سے بات ہوئی بھی جو ترش ٹوٹی سے اسے بھی دل سے میں فوراً نکال دیتا ہوں

غزلیں

اے پرستار طلب اس کا گلہ ہی کیا ہے راہبر کھو گئے اس راہ میں راہی کیا ہے
آپ پڑھئے تو کتاب غم ہستی کو بغور ورقِ دل کے سوا اور جلا ہی کیا ہے
ہم مٹے دل بھی مٹا رسم وفا بھی بدلی اور مٹنا کسے کہتے ہیں تباہی کیا ہے
پھر کوئی زخم دل زار دھواں دے اٹھا افقِ دل پہ یہ ہلکی سی سیاہی کیا ہے
غلشِ دل بھی وہی اشک مسلسل بھی وہی حاصل اس مرے جینے کا الہی کیا ہے
وقت لگتا ہے کسی زخم کو بھرتے بھرتے کم سوادوں کو مگر اس کا پتہ ہی کیا ہے

گردشِ وقت کی پُرشور ہواؤں سے عزیز

صورتیں مٹ گئیں نقشِ کف پاہی کیا ہے

کس نے ہم کو مٹایا اس اہتمام کے ساتھ ہمارا صبح سے رشتہ رہا نہ شام کے ساتھ
ہم ان کی بزم کے قابل نہیں، یہ کیا کم ہے ہمارا نام تو آتا ہے احترام کے ساتھ
جو ہم ملے تو ملے تم سے آئینے کی طرح جو تم ملے تو ملے ہم سے انتقام کے ساتھ
ہمارے اور تمہارے ہیں اب الگ رستے یقین رہ نہیں سکتا خیالِ خام کے ساتھ

عزیزِ فرق ہے دونوں کے ٹوٹنے میں بہت

شکستِ دل کو نہ جوڑو شکستِ جام کے ساتھ

جناب اسرار حسین - اتیر

نام اسرار حسین اور تخلص اتیر ہے۔ والد ماجد کا نام ارادت اللہ صاحب آپ کی ولادت ۲۶ جولائی ۱۹۳۶ء کو اپنے آبائی مکان محلہ ہمٹھ گڑھی میں ہوئی انٹر میڈیٹ تک تعلیم حاصل کی۔ اشفاق علی خاں اشفاق مرحوم سے مشورہ سخن ان کی حیات تک جاری رکھا۔ نظم۔ غزل۔ رباعی۔ قطع وغیرہ پر طبع آزمائی فرماتے ہیں۔

نمونہ کلام :-

آج آوارہ مسافر اپنے گھر میں آگئے	جتنے قطرے تھے لہو کے چشم تر میں آگئے
ناتراشیدہ سہی ہم سنگ لاقیمت تو تھے	کیا ہوا جائے کہ دست بے ہنر میں آگئے
آسماں کی وسعتیں جن کے لئے اک مسئلہ	وہ پرندے بھی فریب بال و پر میں آگئے
ڈریہ لگتا ہے کہ بازو شل نہ ہو جائیں کہیں	جتنے پتھر تھے ہماری رہگزر میں آگئے

پیکر وہ ڈھالے کہ دہن بولنے لگے	معراج فن یہی ہے کہ فن بولنے لگے
پاؤں لہو لہان ہیں چہرہ ہے گرد گرد	یارب زبان دے کہ تھکن بولنے لگے
اے کاش یہ بھی ہو کبھی دوران گفتگو	میں چپ رہوں تو اس کا بدن بولنے لگے

ایک یہ پیکر ہے تیرا ایک وہ پیکر بھی تھا
مجھ سے پہلے سنگ بھی تھا اور کف آذر بھی تھا

محمد احمد خاں - سرور رومانی

محمد احمد خاں سرور رومانی خلیفہ جناب محمد خاں صاحب یوسف زئی ساکن محلہ ہمند جنگہ ۳۱ جولائی ۱۹۳۶ء کو پیدا ہوئے علی گڑھ سے ادیب کامل اور اردو میں ایم۔ اے ہیں۔ آغاز شاعری ۱۹۳۸ء بقول سرور رومانی صاحب فن شاعری میں اب تک کسی سے مشورہ نہیں لیا۔ خود ہی اپنے معائب و محاسن سمجھتے ہیں۔ زندگی میں بہت سے ایسے آئے اور نشان چھوڑ گئے۔ کلام میں حسن و مال کا رنگ جھلکتا ہے۔ پیشہ درس و تدریس ہے۔ نارمل اسکول درول میں ٹیچر ہیں۔

کلام بقدر دیوان موجود ہے۔ نمونہ کلام
یہ آنکھیں بھیگ جائیں اس کے امکانات تو کم ہیں
یہ آنکھیں اتنی جذباتی کہاں ہیں جس قدر ہم ہیں

ایک مغموم سے تقدس کے واقعی ترجمان ہوتے ہیں
ایسے رُخسار جس پہ اشکوں کے خوبصورت نشاں ہوتے ہیں

زندہ رکھے ہوئے تھا مجھے درد کا خلوص زخموں کا اندمال مری جان لے گیا

اس تبسم میں بلا کی تمکنت پائی گئی آنسوؤں کو پی کے جب بھی مسکرایا ہے کوئی

میں نے اس سے مانگے تھے پروقارِ غم لیکن اس نے میکر دامن میں کچھ اداسیاں کھدیں

درک گیا ہے مرے دل کا آئینہ یوں تو مگر جو بال پڑا ہے زراہین سا ہے

اختیار حسن خاں - اختر

اختیار حسن خاں اختر ابن اعجاز حسن خاں نبار و ہیلہ پٹھان ساکن محلہ سنزنی رٹاٹر ڈپارچ
میں آرمی کلوڈنگ فیکٹری شاہجہانپور نے ۱۹۴۱ء میں مڈل کیا۔ ابتدائی اردو فارسی مولوی قاری
محمد الدین صاحب سے پڑھی۔ ۱۹۴۵ء سے شاعری کا شوق ہے۔ پہلے اپنے ماموں محمود حسن خاں
بسمل سے اکتساب فن کیا بعد ان کی رحلت کے جناب اسرار حسن اسیر کے حلقہ تلامذہ میں داخل
ہوئے طنز و مزاح کے علاوہ غزل بھی کہتے ہیں۔ طبیعت موزوں پائی ہے۔ نمونہ کلام
منزلِ عشق سے فاتحانہ گزر زہر پی ہم نشیں رقص کردار پر
تیری عظمت سے انکار کیوں کر کریں یہ دنیا بار تارے یہ شمس و قمر

بھید کھل جائے گا مشکلوں کا ابھی زور بازو مگر صرف پیکار کر

درد عالم کو شریک جسم و جاں کرتے رہے ہم خود اپنی کم نگاہی کا کسے الزام دیں
دوسروں کے غم کو اپنا غم بیاں کرتے رہے ظلمتوں پر جب اجالوں کا گماں کرتے رہے
اپنی خودداری کو ہم خود رائیگاں کرتے رہے انجمن میں بیٹھ کر اختر امیر شہر کی

اغیار کی عادت ہے شعلوں کو ہوا دینا میں راہ تمنا میں جس وقت بھٹک جاؤں
شورش کدہ دل میں اک آگ لگا دینا تم نقش کفِ پائے منزل کا پتا دینا

طاہر تلہری

جناب طاہر تلہری قصبہ تلہر ضلع شاہجہانپور کے ایک دیندار گھرانے میں یکم رمضان المبارک ۱۹۳۶ء کو پیدا ہوئے۔ چھ سال کی عمر میں پڑھنے بٹھائے گئے۔ تین سال میں ناظرہ قرآن ختم کیا اور اردو و فارسی کی چند کتابیں پڑھ کر مقامی اسکول میں داخلہ لیا جہاں ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کی۔ خانگی حالات کی نزاکتوں نے مزید تعلیم کا موقع نہیں دیا۔ کاروبار میں مصروف ہو گئے۔ قصبے کے سرکردہ بزرگ عالم و شاعر مولانا لیاقت حسین صاحب کے آگے زانوئے تلمذتہ کیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ اپنے وجدان سلیم پر بھروسہ کر کے خود ہی فن شاعری کی منزلیں طے کرتے رہے۔ غزل کی طرف میلان طبع زیادہ رہا۔ آپ کا انتخاب کلام 'پہلا پتھر' کے نام سے ۱۹۶۲ء میں طبع ہو کر منظر عام پر آچکا ہے جو عوام و خواص میں مقبول ہوا۔ آپ کا کلام ملک کے مقتدر رسائل میں برابر چھپتا رہا ہے۔ مقامی اور غیر مقامی مشاعروں میں بھی شریک ہوتے رہے ہیں۔ قصبہ تلہر اور قصبہ میران پور کٹرہ میں آپ کے تلامذہ ہیں۔ حضرت طاہر تلہری نے اپنی ڈگری آپ بنائی ہے اور روایتی شاعری سے ہٹ کر شعر کہتے ہیں۔ نہایت متواضع، دوست نواز، خوش اخلاق اور نخلص انسان ہیں۔ آپ کا دوسرا انتخاب کلام جلد ہی طبع ہو کر منظر عام پر آنے والا ہے بطور نمونہ کلام قارئین کے پیش نظر ہے۔

نخل خوابوں کے امیدوں کے شجر بھی کاٹے
 کس قدر مضحکہ انگیز ہے انساں کا تضاد
 دست و پا ہی نہیں حالت نے پر بھی کاٹے
 مہر و مہ سے تو بڑھی اور بھی تاریکی دل
 خواہش سایہ کرے اور شجر بھی کاٹے
 کچھ وہی جانتا ہے اپنے دکھوں کا عالم
 وہ کرن دے جو اندھیروں کی سپر بھی کاٹے
 جس کو باہر بھی اداسی ملے گھر بھی کاٹے

ہائے اس دور کے انساں کا مقدر طاہر
 ہوش منزل بھی نہیں اور سفر بھی کاٹے

مستقبل بشر سے بڑا بدحواس ہوں
 میں کیا میری بساط ہی کیا ہے اس اس ہوں
 لوگو میں اس صدی کا ستارہ شناس ہوں
 صحرا کی تشنگی تو کوئی مسئلہ نہیں
 جس کی کوئی دلیل نہیں وہ قیاس ہوں
 مجھ پر نگاہ کر میں سمندر کی پیاس ہوں
 چہرے سے کھل گیا میکر باطن کا سارا حال
 محسوس ہو رہا ہے کہ میں بے پیاس ہوں

طاہر میری کجی کا ہو احساس کیوں اسے
 نغموں کی چاندنی ہوں نہ پھولوں کی باس ہوں

باڑھ آئی گاؤں کو دریا بہا کر لے گیا
 روح میں صدیوں کا سناٹا بسا کر لے گیا
 ایک پیاسا دوسرے پیاسے کو آکر لے گیا
 ذہن کی الماریوں میں دھول سی اڑنے لگی
 میں دیار و شہر سے صحرا اٹھا کر لے گیا
 رہ گیا قائم پھر اس کی پاکبازی کا بھرم
 کوئی الفاظ و معانی سب چرا کر لے گیا
 پھر وہ اک شیطان سے خود کو بچا کر لے گیا

کوڑیوں کے مول طاہر بک گئی جنس ہنر
 مال مفلس ہر کوئی قیمت گھٹا کر لے گیا

نسیم خاں نسیم

محمد نسیم خاں نسیم خلیف محمد شیر خاں شفق ساکن محلہ جلال نگر کی شاعری کا آغاز ۱۹۵۰ء میں ہوا

دو سال بعد اعتبار الملک حضرت دل شاہ بھہا پوری کے سامنے زانو سے تلمذ تہہ کیا۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۵۹ء کو حضرت دل کے رحلت کر جانے کے بعد حضرت پیارے میاں رشید سے ان کی وفات تک اصلاح لیتے رہے۔ ۱۹۶۶ء میں ایک انتخاب کلام موج نسیم کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ ان کے تلامذہ کی کثیر تعداد ہے۔ ان میں اختر شاہ بھہا پوری محبوب جمال صفر بھارتی جاوید نسیمی وغیرہ۔ بزم دل شاہ بھہا پوری کے اعلیٰ عہدہ دار رہے۔ عروض اور فنی نکات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کے کلام میں کلاسیکی رنگ نمایاں ہے۔ ملک کے کئی رسائل کی مجلس ادارت سے وابستہ رہے۔

مدرسی کے بعد کلودنگ فیکٹری میں ملازم ہوئے اور ترقی کر کے چارج مین کے عہدہ

تک پہنچے۔ نمونہ کلام

عجب عالم ہے میرے گلستاں کا	نہ دور گل نہ موسم ہے خزاں کا
ہر اک ذرہ غبارِ کاروں کا	پتا دیتا ہے منزل کے نشاں کا
خیال آتا ہے اکثر اشیاں کا	قفس میں بھی ہوں میں گلشنِ بدامن
کہ میں خود راہبر ہوں کارواں کا	نہیں مجھ کو تلاشِ گام و رہبر
ہر اک تیور نگاہ بے زباں کا	کوئی سمجھے تو ہے تفسیرِ محشر
قفس پر بھی گماں ہے اشیاں کا	نہ پوچھو مجھ سے میعادِ اسیری

جھکا دو اے نسیم اپنی جبین کو
بھرم رکھ لو کسی کے آستاں کا

زندگی قہرِ خدا ہو جیسے	کسی لغزش کی سزا ہو جیسے
مجھ پہ احسان کیا ہو جیسے	مطمئن یوں وہ ستم ڈھا کر ہیں
شاخ پر پھول کھلا ہو جیسے	لب نازک پہ تبتم کی نمود
مجھ کو منزل کا پتا ہو جیسے	ہوں کچھ اس طرح میں سرگرم سفر
پھول صحرا میں کھلا ہو جیسے	یادان کی دل ویراں میں ہے یوں
آزمالو ہمیں چاہو جیسے	ہم نہ چھوڑیں گے وفا کا دامن
درد خود اپنی دوا ہو جیسے	یوں غلش میں بھی سکوں ہے دل کو

غنجہ چٹکا تو یہ محسوس ہوا تم نے پیغام دیا ہو جیسے
 ان کے بدلے ہوئے تیور توبہ سامنے میرے قضا ہو جیسے
 اُن کا انداز تغافل بھی نسیم
 اک توجہ کی ادا ہو جیسے

آج اس چشمِ حسیں کے غیظ کی حد ہوگی
 سوچتا ہوں گردشِ دوراں سے کہوں صاف صاف
 اس نے جو کچھ بھی کہا اس کا کہیں چرچا نہیں
 میں بھی جاسکتا نہیں اور وہ بھی آسکتے نہیں
 میری ہر منت، گزارش، التجار د ہوگی
 ظلم کی حد ہو نہ ہو اب صبر کی حد ہوگی
 بات جو میں نے کہی تھی وہ زباں زد ہوگی
 بیچ کی دیوار ہند و پاک سرحد ہوگی
 مل گیا گنجینہ، معنی لبوں کو اے نسیم
 جب زباں میری کلید قفلِ ابجد ہوگی

ترے کوچے میں سب پر پھول برسے
 ہمیں نے بھیک بھی جلووں کی مانگی
 پتہ دیتے ہیں قدموں کے نشانات
 جسے کہئے مرا عہدِ جوانی
 چلا ہوں اس لئے طوفانِ بہ طوفان
 خلوصِ دل اگر شامل نہ ہوتا
 پریشاں ہے مری چشمِ تجسس
 مگر ہم ایک پتھر کو بھی تر سے
 ہمیں محروم بھی تابِ نظر سے
 کوئی گزرا ہے پہلے بھی ادھر سے
 گئی وہ دھوپ اب دیوار و در سے
 بہت نزدیک ہے ساحلِ ادھر سے
 پلٹ آتی دُعا بابِ اثر سے
 مجھے آواز دی تم نے کدھر سے
 مری منزلِ شناسی اللہ اللہ
 نسیم آگے ہوں اپنے راہبر سے

سید رونق رضا۔ رونق

سید مہدی حسن مرحوم و معذور ساکن موضع ٹسوہ (ضلع بریلی) کے اکلوتے بیٹے سید رونق رضا رضوی۔ رونق بی۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی ایڈوکیٹ نے شاہجہانپور میں توطن اختیار کر لیا اور اسی شہر کے باشندہ ہو گئے ۲۱ نومبر ۱۹۳۸ء کو ولادت ہوئی۔ ۱۹۵۶ء سے شعر موزوں کرتے ہیں۔ حضرت رشید رام پوری سے مشورہ سخن کیا۔ آپ کا انتخاب کلام 'آئینے اکیلے ہیں' طبع ہو چکا ہے۔ عزیزہ شان معراج ملک کی مشہور شاعرہ شریک حیات ہیں۔

نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

جس کا اب ثانی نہ ہو گا عمر لا حاصل کے بعد
سنگ بن کر کون بیٹھے فرصت ساحل کے پاس
میں کہ شرمندہ بہت ہوں آ کے بھی منزل کے پاس
میں نے جھیلی ہیں بہت تنہائیاں محفل کے پاس
اپنی تنہائی سجاد ہی ہے تری محفل کے پاس

میں نے وہ لمحہ سجا رکھا ہے اپنے دل کے پاس
آؤ مر کے آج زعم موج دریا دیکھ لیں
فاصلے اور وقت نے خوابوں کے موتی چن لئے
آگیا ہے خود سے تنہا گفت گو کرنے کا فن
خامشی میں رنگ بھر کر میں نے ہر احساس کا

قید سے چھوٹے تو جانا بال و پر سے بھی گئے
ہم سر راہ سفر سمت سفر سے بھی گئے
لطف ہم دوشی گیا شاخ شجر سے بھی گئے
اس طرح جا گا کہ ہم خواب سحر سے بھی گئے
بے زباں پہلے بھی تھے اب چشم تر سے بھی گئے

وسعتوں کی دھن میں ہم سونے کے گھر سے بھی گئے
بارہ اندر سے اٹھی آنندھیوں کے شور میں
دو پرندے اس طرح بچھڑے اندھیری رات میں
لمس بن کر کل ترے دست حنائی کا خیال
دل بھر آیا ریت سی آنکھوں میں کھٹکی رات بھر

عبدالواجد انور جمال

عبدالواجد انور جمال ابن جناب عبدالماجد محمد میاں شفق بدایونی ثم شاہجہانپوری اپنے آبائی وطن بدایوں شریف کے محلہ سید واڑہ میں جولائی ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوئے۔ آپ سیدنا حضرت

ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اٹھائیسویں پشت میں ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے بعد مدینہ فیض عام شاہجہانپور سے فارسی میں نشی اور عربی میں مولوی کی تکمیل کے بعد گاندھی فیض عام کالج سے انٹرن کر کے علی گڑھ چلے گئے جہاں سے براہ راست چند دوستوں کے ساتھ پاکستان کی راہ لی۔ کراچی میں رہ کر تکمیل تعلیم کی ایم۔ ایس سی کے بعد ملازمت کر لی۔ اس وقت وہاں اکاؤنٹ آفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔ شاعری وراثت میں ملی ہے۔ شاہجہانپور میں حضرت عابد مینائی کے ممتاز شاگرد رہے۔ خود حضرت عابد نے حضرت انور جمال کی صلاحیتوں اور جوہروں کا اس طرح اعتراف کیا ہے۔

جانتا ہوں جمال خوشگو کو اللہ اللہ یہ طرز و فکر بلند

ہیں امیر سخن جناب شفق ماہر فن شعر ہے فرزند

حضرت انور جمال کا انتخاب کلام 'تالش جمال' عنقریب زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آنے والا ہے۔

انفار

نمونہ کلام

چاہتا میں بھی ہوں کچھ دل کے پھپھولے چھوڑوں
دل کے ٹوٹے ہوئے شیشے کو کہاں تک جوڑوں

تیرا ارشاد ہے اے دوست کہ میں شعر کہوں
پھر یہ احساس ستاتا ہے مجھے رہ رہ کر

عہد آدم کے ہر اک دور میں تھے دار و رسن
لوگ دہراتے بھی رہتے ہیں احادیث کہن

ستم و جور و تشدد بھی نئی بات نہیں
کفر و ایماں کے تصادم کی روایات بہت

تیرگی تو کبھی تنویر بنی ہے نہ بنے
فکر و احساس کی زنجیر بنی ہے نہ بنے

ظلم انسان کے انسان پہ ہوتے ہی رہے
کتنے شداد یہاں ہار کے، جی چھوڑ گئے

دل ہے سینے میں مگر دل میں کوئی نور نہیں
سعی کامل ہو تو مقصود نظر دور نہیں

مادی دوڑ میں ہے روح سے عاری دنیا
پھر بھی مایوس نہ ہو راہِ محبت میں جمال

جب ہوش و خردنا کام ہوئے تب جذب جنوں سے کام پڑا
 میں جوش تمنا کے صدقے دیوانہ میرا نام پڑا
 زنجیر تھے ریشم سے گیسو مخمور نگاہیں جادو تھیں
 اڑنے کو سمیٹے تھے بازو، صیاد کا جھ پر دام پڑا
 جو وقت پڑا تھا بیت گیا اب یاد کرنے سے کیا حاصل
 کس شخص نے کب تک ساتھ دیا کس شخص سے کتنا کام پڑا
 کیا شکل بنائے پھر تا تھا کیا حالت تھی معلوم نہیں
 جس سمت سے گزرا دیوانہ اک حشر اٹھا کہہ رام پڑا
 مسلسل دردِ حرماں سے کسی قابل نہیں رہتا
 سدا کو داغ بن جاتا ہے دل پھر دل نہیں رہتا
 جہاں کشتی لگاتے ہیں وہیں طوفان آتا ہے
 اگر ساحل بھی ہوتا ہے تو وہ ساحل نہیں رہتا
 شبِ فرقت کسی کی یاد آتی ہے تو کیا کہیے
 دل حساس مدت تک کسی قابل نہیں رہتا

آرام کا باعث ہے کبھی غم کا سبب ہے
 کیوں پوری نہیں ہوتی ہیں مانگے سے دعائیں
 معصوم اداؤں کا تصور بھی عجب ہے
 کیا تیری خُدائی میں کوئی اور بھی رہے

ارشاد احمد خاں - ساعر وارثی

ارشاد احمد خاں ساعر وارثی کے والد ماجد کا نام ضمیر احمد خاں ہے۔ محلہ ایمن زئی کے رہنے والے
 تھے۔ ولادت ۱۹۲۹ء میں ہوئی۔ ۱۹۵۶ء سے شاعری کا آغاز ہوا۔ ۱۹۵۸ء میں جانشین حضرت
 دل جناب عابد حسین عابد مینائی کے سامنے زائفے تلمذ تہہ کیا۔ سٹی بورڈ کے محکمہ واٹر ورکس میں
 ملازم ہیں۔

بات ذرا سی الجھاتے ہو نئی نئی تاویلوں میں
 اتنی فرصت ہی کس کو ہے جائے اب تفصیلوں میں
 ان آنکھوں میں رنگ جیا کے یوں لگتا ہے جیسے
 پچھلے پہر سورج کی کرنیں تیر رہی ہوں جھیلوں میں
 سانسوں کی مہکار ہے کیسی اس اجرٹی پگڈنڈی پر
 شاید میری آہٹ پا کر چھپ گیا کوئی ٹیلوں میں

دن کے ہنگاموں سے چھٹ کر کوئی تنہا ہو گیا
 آہٹوں کی نرم لہریں ذہن کو چھونے لگیں
 جانے کیا دیکھا تصویر میں وہ چہرہ کھل اٹھا
 رات بھگی خواہشوں کا رنگ گہرا ہو گیا
 دل میں پھر کوئی کرن پھوٹی اجالا ہو گیا
 اس کے ہونٹوں کا تبسم بھی سنہرا ہو گیا

کھلے کچھ اور بھی پہلو حیات بہم کے
 ہے داغ داغ چمن میں گلوں کا پیرہن
 یہ التفات کی خوشبو بکھرنے جائے کہیں
 گھٹائیں غم کی جو دل پر برس گئیں جم کے
 سلگ رہے ہیں مری طرح زخم موسم کے
 سمجھ رہا ہوں تقاضے سکوت پیہم کے

بے برگ ہو گیا ہے جو فصل بہار میں
 شب بھر جو تیرگی سے نبرد آزما رہی
 ساغر متاع لفظ و بیاں کس کو سوچئے
 پوچھو صبا سے ایسے شجر کی اداسیاں
 وہ شمع جانتی ہے سحر کی اداسیاں
 رہزن ہوئی ہیں ذہن و نظر کی اداسیاں

محبوب حسن - جمال

محبوب حسن نام مگر محبوب جمال سے معروف ہیں۔ والد ماجد کا نام الحاج احمد حسن صاحب محلہ
 خلیل شرقی کے ساکن ہیں ۱۵ جولائی ۱۹۲۹ء کو ولادت ہوئی۔ حضرت اثر بدایونی اور ساغر وارثی سے
 شرف تلمذ حاصل ہے۔ آرڈیننس کلوڈنگ فیکٹری میں ایک ذمہ دار عہدے پر فائز ہیں۔

شام سے جلتے رہو یونہی سحر ہونے تک
 خواب کیا کیا نہ بنے ہم نے سحر ہونے تک
 بقدر ظرف کسی شے کا التفات نہیں
 کہ اب وہ پہلی سی رسم تعلقات نہیں
 تمہارا ذکر نہیں ہے تمہاری بات نہیں
 دل و نگاہ میں ماضی کے واقعات نہیں
 کوئی نیند سے اٹھا ہوا بھی جیسے آنکھ مل کے
 ابھی بجھ کے رہ گئے ہیں جو مری مژہ پہ چل کے
 وہی سُرمئی اندھیرے وہی عنبریں دھندلکے
 اک اضطراب کا سماں ہے آرزو کیا ہے
 رگوں میں آتش سیال ہے لہو کیا ہے

سلسلہ غم کا ہے یہ زلیلت بسر ہونے تک
 کہکشاں سے کبھی تاروں سے تری مانگ بھری
 خوشی کا ذکر نہیں ہے غموں کی بات نہیں
 نجانے کون سا عالم دلوں پہ گزرا ہے
 حدیث اہل و فاسن کے کیوں پریشاں ہو
 خیال و فکر میں فردا کی روشنی ہے جمال
 نیو نمود صبح دلکش یہ حسیں حسیں دھندلکے
 وہی اشک، اشک غم ہیں وہی آبروے دل ہیں
 مرے رازداں ہیں اب بھی مرے ہم سفر ہیں اب بھی
 کسے بتائیں تمناے رنگ و بو کیا ہے
 کہیں بھی چین سے جو بیٹھنے نہیں دیتا

جو اس کو پانا ہی مقصود زندگی ہے جمال
 تو پھر یہ فیصلہ ترک آرزو کیا ہے

یوسف علی خاں گوہر

والد کا نام مظہر علی خاں ہے۔ محلہ ایمن زئی جلال نگر میں ۱۲ اپریل ۱۹۳۹ء کو پیدا ہوئے و اجبی تعلیم پائی بی۔ آئی۔ ایم کی سند لے کر میڈیکل پریکٹس شروع کی اور آرڈیننس کلودنگ فیکلٹی شاہجہانپور سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ آپ کے بڑے بھائی اظہر علی خاں جوہر اعتباراً ملک حضرت دل شاہجہانپوری کے تلامذہ میں شامل تھے۔ یوسف گوہر صاحب کو بھی شوق شاعری پیدا ہو گیا اور ۱۹۵۲ء سے باقاعدہ شعر کہتے ہیں۔ افسانہ نگاری سے فطری لگاؤ ہے۔ اب تک بہت سے افسانے ملک کے رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ بزم افسانہ شاہجہانپور کے ۱۹۵۶ء سے جنرل سکریٹری ہیں۔ افسانہ خوانی کے پابندی سے جلسے منعقد کرتے ہیں۔ آپ

خوش مزاج مخلص اور خوش خیال فنکار ہیں۔ کلام نمونہ ذیل میں درج ہے۔

متفرق اشعار

جب نیا موسم نیا انداز لے کر آئے گا نشتر ان کی یاد کے دل میں چھو کر جائے گا

زندگی میں پھر کوئی آئے گا شاید انقلاب اب تصور میں وہ صبح و شام پھر آنے لگے

ہر ایک چہرہ مجھے اجنبی سا لگتا ہے نجانے بات ہے کیا آج کے اُجالوں میں

وہ باوجود ترک تعلق کے آج بھی مشفق لگے رفیق لگے آشنا لگے

رسوا ہوں ان کے عشق میں ہر شہر ہر گلی یوں بھی نہ دوستوں کو کسی کی دُعا لگے

زندگی غم کا سمندر ہے یہ مانا ہم نے اس سمندر سے تو باہر بھی نہ جایا جائے
میں بھی آئینہ ہوں ہے جھوٹ سے نفرت مجھ کو میری جانب بھی کوئی سنگ اٹھایا جائے
اب تو شہروں میں نہیں کچھ بھی بجز شور و شر شہر سے دور کوئی گاؤں بسایا جائے

محبوب حسن۔ انجم

محبوب حسن انجم خلیف جناب محمود حسن ساکن محلہ لودھی پور ۳۰ دسمبر ۱۹۳۹ء کو پیدا ہوئے۔ انٹر میڈیٹ پاس کر کے آرڈیننس کلودنگ فیکٹری شاہجہانپور میں ملازم ہو گئے۔ اندرون چارج مین کے عہدہ پر فائز ہیں۔ شعر و شاعری کا شوق ہے۔ محمد نسیم خاں نسیم شاہجہانپوری کے شاگرد ہیں۔ نہایت دیندار آدمی ہیں۔ نعت گوئی کی طرف زیادہ رجحان ہے۔ نمونہ کلام۔

بندہ حق نہ جہاں میں کبھی تنہا ہوگا جو خدا کا نہیں کوئی بھی نہ اس کا ہوگا
ذوق نظارہ سلامت ہے تو انشاء اللہ اپنے رُخ سے انھیں پردے کو ہٹانا ہوگا

وقت کا اب یہ تقاضا ہے کہ اے اہل جنوں دل کا ہر راز زمانے سے چھپنا نا ہوگا
 حشر میں دیکھ کے شرمندہ عصیاں انجم
 مجھ پہ بے حد کرم و لطف خدا کا ہوگا

نعت پاک

شمع باطل کو بجھانے کے لئے آپ آئے نور حق بن کے زمانے کے لئے آپ آئے
 منزل دہر میں بھٹکے ہوئے انسانوں کو جادہ حق پہ لگانے کے لئے آپ آئے
 بندگی کا ہو کہ جینے کا قرینہ کچھ ہو سارے آداب سکھانے کے لئے آپ آئے
 کفر و ایمان میں ہے کیا فرق خصوصی انجم
 سارے عالم کو بتانے کے لئے آپ آئے

جناب رام کشن زیا

آپ کے والد کا نام جناب ہردواری لال شرما تھا۔ اور محلہ آفریدی شاہجہانپور کے ساکن تھے
 ۱۹۳۱ء میں پیدا ہوئے جو نرہائی اسکول تک تعلیم پائی۔ مولانا صدیق حسن اسعد شاہجہانپوری
 مقیم پاکستان سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ آپ کا کلام بطور نمونہ قارئین کے لئے درج ذیل ہے
 غزل

ان کا ملنا ہے گو دوستی کے لئے آسرا ملے گا زندگی کے لئے
 آج کے دور میں اعتبار وفا خوبصورت فریب آدمی کے لئے
 نور جب آپ کا حق نے پیدا کیا ہر جہیں جھک گئی بندگی کے لئے
 منت جام صہبا گوارا نہیں میرے ساقی مجھے تشنگی کے لئے
 دامن زہد کل تک تو بے داغ تھا آج تیار ہیں میکشی کے لئے
 شاید اب آگیا ہے پیام اجل کاش آج بے وہ دو گھڑی کے لئے
 تشنہ لب کی طلب کا یہ اعجاز ہے میکدہ کھل گیا میکشی کے لئے
 عشق میں غم کے آثار زیا نہیں صنبط بھی چاہئے عاشقی کے لئے

اس زمانے میں کسی کا بھی کوئی یار نہیں
وہی سوزش ہے وہی درد وہی بے تابی
جس کی تقدیر میں ہوتا ہے اُسے ملتا ہے
سب قفس ہی میں بہاروں کا زمانہ گزرا
وہ وفادار نہیں کوئی وفادار نہیں
دل ابھی تیرے خیالوں سے سبکسار نہیں
کون کہتا ہے زمانے میں وفادار نہیں
میری تقدیر میں کیا عشرت گلزار نہیں
مُفت زیبا ہوئے سے آزاد قفس اچھا تھا
اب یہ ماتم ہے کہ پہلا سا وہ گلزار نہیں

سید صابر علی - قیصر شکیلی

سید صابر علی قیصر شکیلی خلیف اکبر سید محمد ولی میاں ساکن محلہ تارین جلال نگر ہم جنوری
۱۹۳۱ء کو پیدا ہوئے۔ علی گڑھ جامعہ اردو سے ادیب ماہر اور ادیب کامل کے امتحانات پاس
کئے۔ انگریزی تعلیم انٹری تک حاصل کی۔ بچپن سے شوق شاعری رہا۔ اعتبار الملک حضرت دل -
پرنس الشعراء حضرت اصغر - حضرت پیارے میاں رشید شاہ بھانپوری سے یکے بعد دیگرے
مشورہ سخن کیا۔ حضرت شکیل بدایونی اور حضرت نسیم شاہ بھانپوری سے بھی شرف تلمذ حاصل ہوا۔
اور کچھ غزلوں پر مشورہ بھی لیا۔ سلسلہ قادریہ سہروردیہ میں اپنے عم حقیقی حکیم سید صادق علی
قادری رزاقی سے بیعت ہیں۔ آمدی کلودنگ فیکٹری میں ملازم ہیں۔ اصناف سخن میں غزل
نظم - قطعہ رباعی - لغت اور سلام وغیرہ پر یکساں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ صاحب تلامذہ ہیں۔
نمونہ کلام

غزل

کیوں منہ دیکھی بات کرو ہو تم کو رہا کب میرا درد
دل میں گواک مدت سے اب کم کرتا ہے پھیرا درد
وقت نے کس کا دکھ جانا ہے قائل سوگ نہیں کرتا
چاندنی راتوں کے متانے دھوپ کا کیا احساس کریں
بانٹنا چاہو تم، تو اب بھی دل میں ہے بہتر درد
اب بھی مگر جب جب اٹھتا ہے کر دیتا ہے سویرا درد
وقت ہے وہ جلاد کہ جس کو میرا درد نہ تیرا درد
زیست کے معنی جب جانیں گے جب ڈلے گا گھیرا درد
تم تو بس دل ہی لوٹو ہو، تم سے بڑھ کے لٹیرا درد
نمید اڑائے خون رلائے، چھینے سکھ دکھ دے قیصر

لیوں پر ہے صدائے آفریں کیوں
نہیں ممکن کوئی تعبیر جن کی
بدلتی رت برستی بارشوں میں سے
فسانہ اپنا قیصر نے کہا ہے

مرے دشمن ہوئے ہیں نکتہ چیں کیوں
نظر آتے ہیں وہ خواب حسیں کیوں
سلگتی ہے یہ جسموں کی زمیں کیوں
ہو آئیں تیز چل کر مرگ گئیں کیوں

رباعیات

دینا ہے خود اک درس زلمنے کے لئے
کہتا ہوا جاتا ہے یہ جانے والا

ترتیب حیات ہے فسانے کے لئے
آیا ہے یہاں کون نہ جانے کے لئے

قسمت کے ستاروں کی یہ تفصیل ہیں
اومست شباب تیری آنکھوں کی قسم

ہستی کے شب و روز کی تمثیل ہیں
ڈوبا ہوں میں جن میں یہی وہ تجھ میں ہیں

محبوب حسن - محبوب

حضرت محبوب حسن محبوب ابن شیخ رفیع اللہ صاحب ساکن محلہ غلیل شرقی ۱۰ جولائی ۱۹۳۶ء
کو پیدا ہوئے۔ تعلیمی اعتبار سے بلا اسناد ہیں مگر مطالعہ وسیع ہے۔ حضرت قیصر شکیلی سے مشورہ
سخن کرتے ہیں۔ پیشہ خیاطی ہے۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

دیئے ہیں زخم جو اس نے شمار کون کرے
امیر شہر کے گلشن کے خار بھی ہیں گلاب
ہر ایک شخص کے اپنے الگ مسائل ہیں
ترے لئے جو پیا میں نے زہر رسوائی

مروتوں کی رواتار تار کون کرے
مگر غریب کے بچے کو پیار کون کرے
کسی کے درد کا خود کو شکار کون کرے
تو ہی بتا کہ اب اس کا اتار کون کرے

مصاحبت ہے یہی اب اس کی تمنا نہ کرو
آج کے دور میں ممکن نہیں پہلے کی طرح
روشنی جس پہ پڑے گی وہ پھر جائے گا

تم جسے پا نہیں سکتے اسے چاہا نہ کرو
پھر کسی موڑ پہ مل جائیں گے سوچا نہ کرو
اب تقاضا ہے کہ آئینہ دکھایا نہ کرو

جب وہ نازک لبوں کو کھولے گا
 ہوش کب ہوگا کون بولے گا
 ظلم پر اور کیا کرے گا غریب
 منہ چھپا کر کے خوب روئے گا
 گھر سے باہر قدم نکالو تو
 جس کو چلنا ہے ساتھ ہوئے گا

رباب رشیدی

سلمان احمد رباب رشیدی کی ولادت ۱۰ جنوری ۱۹۴۴ء کو قصبہ پوایاں ضلع شاہجہانپور کے باعزت اور ممتاز خاندان میں ہوئی۔ ان کے والد ماجد جناب حکیم غلام جیلانی اسیر صرف اپنے وقت کے طبیب حاذق نہیں صاحب علم بھی تھے۔ وضعدار و بامروت۔ متواضع اس قدر کہ دور و نزدیک مشہور تھے۔ ۱۹۵۰ء کے فرقہ وارانہ فسادات کے سبب جو شاہجہانپور کے قصبات و مواضع میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے ترک سکونت کر کے حکیم صاحب نے بمعہ خاندان شہر میں سکونت اختیار کر لی رباب رشیدی کا بچپن قصبے اور لڑپن شہر میں گزرا۔ ۱۹۵۱ء میں سایہ پدری سے محروم ہو گئے والد ماجد ۱۹۴۹ء ہی میں عالم جاوداں کو روانہ ہو چکی تھیں۔ قبلہ دادا محترم اور غم حقیقی کی نگرانی میں مروجہ تعلیم حاصل کی۔ انٹرنس کا امتحان پاس کر کے تعلیم سے فراغت حاصل کر لی اور کاروباری زندگی میں داخل ہو گئے مگر شرافت نفسی اور احباب پرستی نے کاروبار سے بھی فارغ کر دیا۔ شاعری ورثہ میں پائی تھی طبیعت بھی موزوں تھی شعر و شاعری کا شوق پیدا ہو گیا۔ حضرت نحمد رشید خاں رشید رامپوری کے دامن فیض سے وابستہ ہو گئے لیکن چند سال بعد ہی حضرت رشیدی کی وفات پر سلسلہ مشورہ سخن منقطع ہو گیا۔ چوں کہ ذہن رسا اور طبیعت میں مادہ شاعری ہے اپنے وجدان سلیم پر اعتماد کر کے شعر کہتے رہے مشق سخن اور گہرے مطالعے نے شاعری کے رموز و نکات سے واقف کرادیا۔ شاہجہانپور کے ممتاز شاعروں کی صف اول میں شمار ہوتے ہیں۔ شہر کے بیشتر معروف شاعر اور چند شاعرات کو آپ سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ ان دنوں زیادہ تر لکھنؤ میں قیام رہتا ہے۔ مجموعہ ”ابر سفید“ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

جب ہو گئے خود اپنی نظر کا شکار لوگ
 آئینے توڑنے لگے بے اختیار لوگ

بھگی رتوں کا قحط پڑا جب سے شہر میں
اک خواب ہو کے رہ گئیں ساری راتیں
صحرا مزاج ہو گئے باغ و بہار لوگ
گننا میوں کی نذر ہوئے و صعدار لوگ
ذوق سفر کی داد تو دیتا نہیں کوئی
سمتوں کا یہ ظلم ذرا ٹوٹنے تو دو

رباعیات

اک دل ہی فقط شب کو کہاں جاگے ہے
کچھ سلسلے یوں دائرے بن جاتے ہیں
سویا ہوا ہر درد نہاں جاگے ہے
لگتا ہے مرے ساتھ جہاں جاگے ہے

مایوس نہ ہو صاحب اعزاز ہوں میں
مجھ میں اسے وہم تو پھر اس نے کہا
ارباب ہم کے لئے اعجاز ہوں میں
یہ وہم نہیں وقت کی آواز ہوں میں

وسعت صحرا کہاں دیوار و در میں کھو گئے
کیسی کیسی صورتیں تھیں عکس بن کر رہ گئیں
ہم تو اپنے شہر میں اپنے ہی گھر میں کھو گئے
کیسے کیسے لوگ تھے لیکن سفر میں کھو گئے
یہ بھی منظر ہیں کہ جن پر حیرتیں ہی حیرتیں
مدتوں کے بعد جب گزرے دیار شوق سے
وہ بھی منظر تھے جو میری چشم تر میں کھو گئے
دل کے سناٹے سکوت بام و در میں کھو گئے
سوچتے ہی سوچتے گرد سفر میں کھو گئے

مولانا بدر الدین عاقل

آپ محمد قاسم علی صاحب کے بیٹے اور محلہ سنرنی شاہبہا پور کے ساکن ہیں۔ یکم مئی
۱۹۳۰ء کو پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم شہر کے عربیہ مدارس عین العلوم اور مدرسہ سعیدیہ میں حاصل کر کے
دارالعلوم دیوبند سے فاضل دیوبند کی سند حاصل کی۔ الہ آباد بورڈ سے منشی۔ کامل، عالم اور
فاضل کے امتحانات سے فراغت حاصل کی۔ سلطان پور میں جامعہ اسلامیہ کے پانچ سال
تک صدر مدرس رہے۔ ۱۹۳۵ء میں والدہ محترمہ کے انتقال کے سبب سے جامعہ اسلامیہ

سلطان پور کو خیر باد کہہ کر وطن واپس آگئے اور جولائی ۱۹۵۱ء سے مدرسہ عین العلم شاہجہانپور میں صدر مدرس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

شاعری کا سلسلہ ۱۹۵۱ء سے جاری ہے۔ ابتدا میں مولانا انوار احمد انوار سے مشورہ سخن کیا اور ان کے ہی مشورہ سے حضرت اسعد شاہجہانپوری مقیم کراچی پاکستان سے ان کی حیات تک بذریعہ مراسلت استفادہ کرتے رہے۔ حضرت عاقل کا ہم عصر شعرار میں اہم مقام ہے آپ ایک خوش اخلاق اور سنجیدہ انسان ہیں۔ آپ کے مزاج کا اثر آپ کی شاعری میں نمایاں نظر آتا ہے۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

غزل

چاک ہو جائے گی پھولوں کی قبا میرے بعد	خود اتر جائے گا یہ رنگِ حنا میرے بعد
خونچکاں ہوگی بہاروں کی فضا میرے بعد	آسماں سے وہ امیدوں کا لبو برسے گا
اب نہ بھٹکے گا کوئی راہ نما میرے بعد	میں نے تاریک فضاؤں کو صنیا بخشی ہے
دیکھیے کون اٹھے مرے خدا میرے بعد	مجھ سے زندہ ہے ابھی معرکہ دار و رسن
کتنے ہونٹوں پہ میرا نام رہا میرے بعد	کتنے سینوں نے جلائے تیری یادوں کے چراغ
کون بخشے گا محبت کو جلا میرے بعد	کون سلجھائے گا گیسوے دو عالم عاقل

اے تغافل کیش تجھ کو ننگِ دوراں کر دیا	لغزش پیہم نے تیسری چاک داماں کر دیا
پارہ پارہ تیرا ہر تار گریباں کر دیا	آہ، خود بینی نے تجھ کو نذر طوفاں کر دیا
عظمت اسلاف کو تو نے پشیمان کر دیا	ہوش میں آ، تاجکے غرق مئے کبر و غرور
ذرہ ناچیز کو بہر درخشاں کر دیا	ہاں، اسی عالم میں تو نے اب سے پہلے بارہا
میرے ہرزخم جگر کو تو نے خنداں کر دیا	اے نگاہ کیف زاتیرے کرم کا شکریہ

عظمت رفتہ کا وہ اعجاز عاقل یاد کر

جس نے ہر غنچے کو گل ہر گل کو خنداں کر دیا

اسرار حسین خاں - تبسم

اسرار حسین خاں صاحب تبسم غلت جناب ابوالحسن خاں مرحوم ۲۵ جولائی ۱۹۳۰ء کو محلہ ہمند جلال نگر میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کر کے آرمی کلوڈنگ فیکٹری میں ملازمت کر لی۔ بفرغت زندگی بسر کر رہے ہیں۔ حضرت عابد مینائی جانشین حضرت دل کے شاگردوں میں ہیں۔ کل ہند سطح کے مشاعروں میں آپ اپنے مخصوص ترنم کے سبب بھی اکثر مدعو کئے جاتے ہیں۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

کیا کیا عجیب رنگ بدلتی ہے زندگی
گو حادثات وقت نے پتھر بنا دیا
لوگو قدم اٹھاؤ ذرا احتیاط سے
ہونٹوں پر ہم نے جب سے تبسم سجایا
مٹی میں مل کے پھولتی پھلتی ہے زندگی
آنکھوں میں میرے پھر بھی مچلتی ہے زندگی
دریا کی طرح راہ بدلتی ہے زندگی
آئینہ دیکھ دیکھ کے جلتی ہے زندگی

ہر غلش میں اک سکون مستقل پاتے رہے
بے نیاز پند و اعظمتے ہم اہل میکہ
رہگزار عشق کی اللہ سے دشواریاں
شدت طوفاں کا ہوتا ہے تبسم کیا اثر
اپنا دامن آپ ہم کانٹوں سے الجھاتے رہے
زہد و تقویٰ ساغزو مینا سے ٹکراتے رہے
دل نے سمجھایا ہمیں ہم دل کو سمجھاتے رہے
اپنی کشتی آپ ہم طوفاں سے ٹکراتے رہے

سید نسیم طاہر زیدی - نگار و ترشول

سید نسیم طاہر زیدی نام۔ اردو میں نگار اور ہندی میں ترشول تخلص ہے۔ آبائی وطن پہانی (ہردوئی) اور تالیخ پیدائش ۱ ستمبر ۱۹۳۰ء ہے۔ تقریباً ۱۵-۱۶ سال سے شاہجہانپور میں مستقل سکونت ہے۔ مکان خرید کر بس گئے ہیں۔ آپ کے والد ماجد کا نام سید طاہر حسین زیدی ہے۔ پہانی کے شرفار اور صاحب حیثیت گھرانوں میں آپ کا گھرانہ ہے۔ انٹر سائنس کے بعد ڈاکٹری میں ایل۔ ایم ایس کی سند حاصل کر کے ڈاکٹری کو پیشہ بنالیا۔ شہر کے کامیاب ڈاکٹروں میں

شمار ہے۔ نہایت ذہین۔ طباع اور باشعور جوان ہیں۔ تقریباً دس سال سے شعر و شاعری کا شوق ہے۔ اس درمیان میں کئی ناول۔ افسانے اور ڈرامے بھی لکھ چکے ہیں شاعری کا سرمایہ بھی بقدر ایک دیوان کے اکٹھا ہو چکا ہے۔ طنز و مزاح میں طبیعت بہت رسا ہے۔ سنجیدہ شاعری بھی کرتے ہیں۔ ہندی اردو دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں۔ مطبوعات میں ”یہ خون زنگ لائے گا“ اور ”میرا پیارا ہندستان“ دو طویل نظمیں ہیں اردو میں کبھی کبھی راقم الحروف اور ہندی میں دامودر سروپ جی و دروہی سے مشورہ سخن کیا ہے۔

نمونہ کلام

نیک فال

اس قدر کیوں غمزہ ہو کیوں ہو اس درجہ نڈھال
جب منگیتر ہو جواری کیوں نہ ہو رنج و ملال
یہ تو اچھی بات ہے اس کو سمجھ لے نیک فال
اور وہ ہارا تو ٹل جائے گا چولھے کا وبال

اک سہیلی نے کیا اپنی سہیلی سے سوال
ایک پل وہ چپ رہی پھر یوں سہیلی سے کہا
دوسری نے یہ سنا تو ہنس کے بولی اے بہن
جیت جانے پر کسی ہوٹل سے کھانا آئے گا

گاریوں ڈرتے ہیں بیگم گار سے اک اچکا جیسے تھانیدار سے

بہروپیا

اک پھٹا کرتا پھٹی دھوتی کہیں سے مانگ لا
ایک صدی بھی فراہم کر قریب الختم سی
دوسری میں قاعدے سے کوئی ستی باندھ دے
رکھ تجوری میں انھیں اب سوچتی ہے کیا کھڑی
ٹیکس کے لائق نہیں ہوں یہ دکھانا ہے مجھے
پہنچے آخر تھر تھراتے لڑ کھڑاتے ہانپتے
بولاتم کو سیٹھ بولوں یا کہوں بہروپیا
ہو کسی آفت کے مارے تو کروں تھانے کو فون
حسب نوٹس جو رقم واجب ہوئی دیدتے

سیٹھ یہ بولا سٹھانی سے بھلی مانس ذرا
ڈھونڈھ اک چیل جو لگتی ہو کسی مزدور کی
ایک ہو جس میں کمائی ایسی عینک چلے
لے یہ ہیرے کی انگوٹھی اور یہ سونے کی گھڑی
آج انکم ٹیکس کے دفتر میں جانا ہے مجھے
اپنے حلیے کو بدل کر سیٹھ پیدل چل دیئے
پہلے چونکا دیکھ کر افسر مگر پھر ہنس دیا
یا مذاق بن کے آئے ہو یہاں اک کارٹون
آپ کی وہ زرد امپالا کدھر ہے بولے

اختر علی خاں - اختر

اختر علی خاں نام - اختر تخلص - عام طور پر آپ اختر شاہجہاںپوری کے نام سے معروف ہیں۔ آپ کے والد ماجد کا نام یعقوب علی خاں ہے اور محلہ رنگین چوپال کے ساکن ہیں۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو آپ کی ولادت ہوئی۔ انٹر میڈیٹ تک تعلیم حاصل کر کے آرڈیننس کلوڈنگ فیکٹری شاہجہاںپور میں ملازم ہو گئے اور اب تک ملازمت سے وابستہ ہیں شعر و سخن کا شوق ہوا تو خان اختر بدایونی اور نسیم شاہجہاںپوری کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور مشق سخن سے خوب سے خوب تر کہنے کی کوشش جاری رکھی۔ آرڈیننس کلوڈنگ فیکٹری میں سالانہ کل ہند سطح کا مشاعرہ کرانے میں آپ کی کاوشیں قابلِ داد ہیں۔ فیکٹری کی بزم ادب کے جنرل سکریٹری بھی ہیں۔ شہر میں بھی آپ کے دم سے ادبی نشستیں منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ کلام بطور نمونہ درج ذیل ہے۔

خون ناحق سے منقش بام و در ایسے نہ تھے	آج جیسے ہیں کبھی خوف و خطر ایسے نہ تھے
بس یہی منزل یہی جادہ یہی تھے مرحلے	فرق اتنا ہے کہ پہلے ہم سفر ایسے نہ تھے
ذہن و دل کو موسموں نے اس طرح بدلا کہ لوگ	انتظارِ شام میں وقت سحر ایسے نہ تھے
سایہ سایہ رونقیں تھیں سایہ سایہ جنتیں	اپنے سارے سے کبھی عاری شجر ایسے نہ تھے
خود سری خود آگہی خود اعتمادی آگئی	آپ کی قربت سے پہلے ہم مگر ایسے نہ تھے

وقت رخصت ہم بھی اختر آنسوؤں کو پنی گئے
ہر نظر ہم پر تھی ہم بھی بے ہنر ایسے نہ تھے

چھپا کر سادہ لفظوں میں غضب کی تلخیاں رکھ دیں	غزل میں ہم نے اپنے عہد کی محرومیاں رکھ دیں
تری آواز نے بڑھتے ہوئے میرے قدم روکے	مری منزل قریں آئی تو تو نے بیٹھیاں رکھ دیں
غبارِ مصلحت سے اٹ چکے ہیں آج سب چہرے	مزاجوں سے کھرچ کر وقت نے ہمدردیاں رکھ دیں
مجھے اندھے یقیں کا آج خمیازہ بھگتنا ہے	شعور و فہم کی جس نے اڑا کر دھجیاں رکھ دیں
یہ کس نے آج چپکے سے باندا زرقیقانہ	میری جلتی ہوئی آنکھوں پہ اپنی انگلیاں رکھ دیں

کہیں ایسا نہ ہو حرفِ تلی بوجھ بن جائے
کسی کے سامنے اختر یہ کیوں مجبوریاں رکھ دیں

اسی سبب تو ہر ایک شخص دلفگار سا تھا
 نہ جانے کون سا مقتل میں حادثہ گزرا
 ہمیں سے جرات تقلید دوستانہ نہ ہوئی
 سکوت سطح سمندر تھا جانگداز بہت
 ترے خیال میں گم تھا کہ میں مسائل میں
 تو آگیا تو لگا تیرا انتظار سا تھا
 وہ ایک شخص کہ اختر کہیں جسے لوگو
 خدا گواہ وہی شخص باوقار سا تھا

حکمت شاد

حکمت شاد خلت جناب فضل علی کی ولادت ۱۹۴۲ء میں ہوئی۔ والد کی آمدنی اچھی تھی ناز و
 نعمت میں پرورش پائی۔ تعلیم واجبی ہے۔ شعر و شاعری کا شوق اوائل عمر سے ہے۔ جدید رنگ
 اختیار کیا ہے۔ کسی سے مشورہ سخن نہیں لیتے ہیں۔ مشق سخن سے شعر کہنے کا سلیقہ آگیا ہے۔ آرمی
 کلوڈنگ فیکٹری میں ملازم ہیں اور تاجر بھی ہیں۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

سبز پتے گرے پیر زخمی ہوئے اور باد صبا دیکھتی رہ گئی
 میں بھی تنہا رہا وہ بھی تنہا رہا بھری بھری مگر زندگی رہ گئی
 رنگ و نکلت تمازت ہنک کہکشاں برف کھیلنا ان کی فطرت یہاں
 پیار کی جھیل کی سطح پر سوچے پھر یہ کیوں صرف بیخ بستگی رہ گئی
 تیری آنکھوں کا زہراب بھی پی چکا درد ہی درد ہے میں بچ بس گیا
 حادثے بن گئے ہیں رفیق سفر کون سی چیز کی اب کمی رہ گئی

روٹھ کر مجھ سے اساس دیدہ تر چھین لو
 عالم اسباب کو بے چہرہ کرنے کے لئے
 میری آنکھوں سے سبھی پر کیف نظر چھین لو
 ہو سکے تو چہر گئی شاہ خاور چھین لو
 شاد کے ہاتھوں سے لوگو بڑھ کے پتھر چھین لو
 لکھتے لکھتے تھک گیا ہو گا حکایات جنوں

ممكن نہیں رہا کہ مجھے تم بھلا سکو
 آئینہ حیات بھی دھندلا کے رہ گیا
 قید تعینات سے چھوٹے تو یہ لگا
 اب اپنے دل سے میرے اشعار کی طرح
 لمحات غم میں چشم و رخ یار کی طرح
 ہر شخص جی رہا ہے سے گنہ گار کی طرح

خالد علوی

طردار و صاحب طرز شاعر جناب خالد علوی کی ولادت ۱۰ نومبر ۱۹۳۲ء کو محلہ محمد زئی کے ایک صاحب ثروت تاجر اور علم دوست خاندان میں ہوئی۔ والد ماجد کا اسم گرامی جناب محمد مصطفیٰ علوی ہے پیدائش سے سن شعور تک کا زمانہ بے فکری اور فارغ البالی ہی گزارا لیکن تجارت کے نشیب و فراز نے پانسہ پلٹ دیا۔ بدقت دسواں درجہ پاس کر کے تلاش معاش میں ترک وطن کر کے پہلی بھیت پہنچے۔ سرزمین پھیلی بھیت نے پناہ بھی دی اور بزم گاہ شاعری میں مقام بھی بخشا۔ 'ماہنامہ' کا دفتر جس میں آپ ملازم تھے شاعروں اور ادیبوں کا جلسہ گاہ بھی تھا۔ نوخیز شعرائے پہلی بھیت بھی آتے جاتے تھے اور کہنہ مشق سخنور بھی۔ خالد علوی بچپن ہی سے شعر موزوں کرنے لگے تھے عم حقیقی محمد مجتبیٰ کیف کی رہنمائی حاصل تھی جب وہ پاکستان ہجرت فرما گئے تو استاد کی جگہ پر کرنے کے لئے الحاج حضرت نشاط پہلی بھیتی سے مشورہ سخن لیا جنھوں نے زائد از تین سال فن شعر و ادب میں مشورہ دیا اس درمیان میں گھر کے حالات بھی سدھر گئے آپ تکمیل تعلیم کے لئے ترک ملازمت کر کے شاہجہانپور واپس آگئے۔ یہاں بھی شعر و شاعری کا سلسلہ جاری رہا مقامی طور پر حضرت رباب رشیدی شاہجہانپوری سے رجوع ہوئے اور بقدر ضرورت رہنمائی حاصل کرتے رہے۔ آج محمد اللہ خود صاحب تلامذہ ہیں اور شعرائے شہر میں بنظر احترام دیکھے جاتے ہیں۔ تکمیل تعلیم کے بعد گاندھی فیض عام پوسٹ گریجویٹ کالج میں ایک ذمہ دار عہدے پر فائز ہیں۔ خالد علوی جدید شعرا کے نمائندہ شاعر ہیں اور سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں۔ ان کے یہاں جدید و قدیم رنگ کی لطیف آمیزش ہے۔ نمونہ کلام کے بطور چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

زندگی آہیں ترا عہدِ جوانی لاؤں
 فصل اگنے بھی نہ پانی تھی زمیں سوکھ گئی
 کربلا میں کس انداز سے پانی لاؤں
 پھر بتا کیسے قبا تیری میں دھانی لاؤں

ایک پتھر لئے میں سوچ رہا ہوں عسکوی کیسے ٹھہرے ہوئے دریا میں روانی لاؤں

شکوہ کیسا جو گھٹے ہے دل نا کام بہت
تو بھی ہم سا ہی نہیں دست و دریدہ دل ہے
اپنی گستاخ نوائی پہ نہ معتوب ہوا
زندگی، حرف طلب کیسے زباں تک آئے

تم نے شمعیں بھی جلائی تھیں سرشام بہت
ہم تو آئے تھے مگر سن کے ترانام بہت
بے نوائی پہ تراشے گئے الزام بہت
مجھ کو ہے فرصت یک لمحہ تجھے کام بہت

ایک اک قطرہ شبیم کو اٹھانا چاہوں
مجھ کو الزام قدامت بسر و چشم قبول
اس کا انداز کچھ ایسا ہے یقین آجائے
زندگی چاہتی رہتی ہے تغیر عسکوی

پیاس چاہے نہ تجھے پھر بھی بچھانا چاہوں
میں وہی اپنے بزرگوں کا زمانہ چاہوں
اس کی باتوں میں اگر لاکھ نہ آنا چاہوں
اس کے ہاتھوں سے میں اب ہاتھ چھڑانا چاہوں

جناب مختار حسن واصف

مختار حسن نام واصف تخلص والد کا نام مولانا انوار احمد۔ آپ ۲۸ نومبر ۱۹۳۲ء کو پیدا ہوئے۔ اردو۔ فارسی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ اردو میں ایم۔ اے کیا اپنے آبائی مکان واقع محلہ سنزئی میں سکونت پذیر ہیں۔ ۱۹۶۵ء سے آرمی کلوڈنگ فیکٹری میں ملازم ہیں۔ آپ کو شاعری وراثت میں ملی ہے اس لئے شعر گوئی کا شوق اوائل عمری سے ہے۔ اٹھارہ سال کی عمر سے باقاعدہ مشق سخن کرتے ہیں۔ آغاز میں حضرت مولانا اسعد شاہ بھہانپوری کے بذریعہ مراسلت مشورہ سخن کیا جو پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔ جب حضرت اسعد رحلت فرما گئے تو اپنے والد سے رجوع ہوئے جناب واصف نے استاذی حضرت پیارے میاں رشید سے بھی ان کے آخری ایام زندگی میں کچھ روز استفادہ کیا جناب واصف غزل۔ قطعہ۔ رباعی اور نظم پر یکساں توجہ صرف کرتے ہیں۔ نوجوان ابھرتے ہوئے شعرا میں ممتاز ہیں

آپ اپنے والد مولانا انوار احمد انوار کی طرح ملنسار۔ خوش اخلاق اور خوش اطوار ہیں بطور نمونہ
آپ کا کلام درج ذیل ہے۔

غزل

پیش نظر ہیں پھر وہی آثار دیکھنا	کیا رگ گئی ہے وقت کی رفتار دیکھنا
پھر آج ان کی یاد نے تڑپا دیا مجھے	پھر سامنے ہے منزل دشوار دیکھنا
کیا میکدے میں پھر کوئی آنا ہے انقلاب	ساقی سے کیوں اچھتے ہیں میخوار دیکھنا
کتنے دلوں پہ بزم میں بجلی گرا گیا	اُن کا قریب سے مجھے اک بار دیکھنا
پاتے رہیں گے اہل نظر سے خراج داد	ہر ایک دور میں میرے اشعار دیکھنا
واصف ہے گایا وہ اُن کا دم و دماغ	مڑ مڑ کے میری سمت کئی بار دیکھنا

رفیع اللہ وقت

جناب رفیع اللہ وقت خلیفہ شیخ شفاعت اللہ ساکن محلہ مسجد گنج۔ عمر تقریباً چالیس سال۔
مدرسہ سعیدیہ میں مولوی کفایت اللہ مرحوم سے اردو فارسی پڑھی۔ پیشہ خیاطی ہے۔ ۱۹۶۴ء سے شعر
موزوں کرتے ہیں حضرت مولانا انوار احمد صاحب انوار اسعدی سے شرف تلمذ حاصل ہے۔
نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیے۔ حال میں فروری ۱۹۹۴ء میں اس دار فانی سے رحلت فرمائی۔

دل بے چین کو قرار نہیں	دل کی دُنیا میں کچھ بہا نہیں
رنج و غم سے کسے نجات ملی	کون دُنیا میں بے قرار نہیں

اک نگاہ لطف نے آسان کر دی زندگی	جو مصائب دل نے جھیلے وہ نہیں گزرتے گراں
نہ ہوتی دید کی خواہش نہ آرزوے وصال	نظر کے سامنے ہوتا اگر وہ حسن و جمال
ہر ایک غم نہیں ہوتا ہے کیف پرور وقت	کچھ ایسے غم ہیں جو کرتے ہیں زندگی کو نڈھال
منع کیوں کرتے ہو تم آئے نہ دُنیا میں بشر	کیا خبر کس سیپ میں قطرے سبب بن جائے گہر

جناب شبیر احمد - شاعر و جدانی

شبیر احمد نام شاعر و جدانی تخلص ہے آپ کے والد محترم کا نام امیر احمد صاحب، محلہ بارہوزئی اول میں رہتے ہیں۔ آپ ۱۹۳۲ء میں پیدا ہوئے۔ اردو میں ایم۔ اے ہیں مقامی ڈسٹرکٹ بورڈ کے ایک اسکول میں مدرس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ شاعری کی ابتداء ۱۹۶۲ء سے ہوئی۔ دوران قیام مراد آباد حضرت قمر مراد آبادی اور حضرت قمر کے شاگرد حضرت گوہر عثمانی اور شاہجہانپور میں حضرت رباب رشیدی سے مشورہ سخن کیا۔ تقریباً ۲۲ سال سے مشق سخن جاری ہے۔ موجودہ نسل کے شعراء میں صاحب فہم ہیں۔ سوچ سمجھ کر شعر موزوں کرتے ہیں۔ کلام میں دلکشی اور ستھرا پن ہے۔ نمونہ کلام

اب جیسے سوچتے ہیں کبھی سوچتے نہ تھے	وہ ہم نہ تھے کہ اتنے کڑے مرحلے نہ تھے
آنکھوں کا اضطراب ہے ہر لو کے آس پاس	جیسے کبھی چراغ گھروں میں جلے نہ تھے
رفقاریں ہوش نہ سانسوں میں تازگی	کیا راہ ہیں کسی بھی جگہ ہم رُکے نہ تھے
ہر آئینے کو وقت نے دھندلا دیا تو کیا	ہم بھی تو اپنا عکس کبھی دیکھتے نہ تھے
تو نے نگاہ پھیر کے احسان ہی کیا	دُنیا کے تجربات کو ہم مانتے نہ تھے
صدیوں سے جو ملا تھا وہ لمحوں میں کھو دیا	یوں تو متاعِ غم تھی کبھی بانٹتے نہ تھے

غزل ۲

کتنے ظلمت کدوں سے گزرا ہوں	تب کہیں روشنی میں آیا ہوں
دھیرے دھیرے لوں میں اُتروں گا	اجنبی دیس کا اجالا ہوں
نرم شاخوں سے خشک پتوں تک	پھر سنورتا ہوں پھر بکھرتا ہوں
صرف گلشن نہیں مری منزل	اُڑنے والوں کے ساتھ رہتا ہوں
کوئی نزدیک ہے نہ کوئی دور	کچھ دنوں سے بہت اکیلا ہوں
گھر کی تاریکیاں گھسیٹ بھی نہیں	اور میں ہوں کہ بچھنے والا ہوں
چاندنی عکس آئینے پتھر	سب کہیں دور چھوڑ آیا ہوں
ایک آئینہ اور عکس ہزار	میں اسے کیسے توڑ سکتا ہوں

مرغوب حسن خاں - فضا

نام مرغوب حسن خاں - تخلص فضا - والد ماجد کا نام حبیب حسن خاں صاحب مرحوم - محلہ میہان شاہ کے رہنے والے ۱۵ مارچ ۱۹۲۲ء کو ولادت ہوئی - منشی و کامل نیربی - اے کے امتحانات پاس کئے - ۱۹۵۴ء سے شعر گوئی کی ابتداء ہوئی ضیاء اسعدی مرحوم سے مشورہ سخن کیا - غزل - قطعہ - نعت وغیرہ میں طبع آزمائی کرتے ہیں - نمونہ کلام

سب کے چہروں پر ملا اک دوسرا چہرہ مجھے
میرے غم کا شکر یہ اب آگیا جینا مجھے
دل کی دھڑکن اس طرح دیتی رہی دھوکا مجھے
پھر اسی انداز سے پوچھو کہ پہچانا مجھے
آج وہ بھی کہہ رہے ہیں اپنا دیوانہ مجھے

مفلسی سے کم سے کم یہ فائدہ پہنچا مجھے
بے نیاز رنج و راحت ہو گئی ہے زندگی
ایسا لگتا تھا کہ جیسے ہو تری آواز پا
نرم و نازک انگلیاں رکھ کر مری آنکھوں پہ تم
درحقیقت ہے یہ معراج محبت اے فضا

ڈوبتے وقت بھی میں اس کو صدا دے نہ سکا
مصاحبت کہتی رہی آدامن ساحل میں آ
مدھ بھری آنکھوں کی مستی اور کیا لے جائے گی
کیا اسی جانب مجھے کوئی صدا لے جائے گی
کچھ خس و خاشاک تو بارشس بہا لے جائے گی

جان پیاری تھی مگر جان سے پیاری تھی انا
میری خودداری مجھے طوفاں سے الجھائے رہی
دن کا سُکھ راتوں کی نیندیں بھی اڑا لے جائیگی
پھر مجھے کوسے ملامت کا خیال آنے لگا
غم بھی کم ہو جائے گا جی بھر کے رونے دو مجھے

نور ضیاء الدین - نور

نور ضیاء الدین نور خلیف مولوی اسماعیل ذبیح پیش امام ابن مولوی خلیل الدین رازی ساکن
قصبہ تلہر ضلع شاہجہانپور ۳۱ جنوری ۱۹۲۲ء کو عدم سے وجود میں آئے - ابتدائی تعلیم حسب رواج
گھر پر ہوئی - ہندی ادب میں ڈبل ایم - اے ہیں اور اردو بی - اے تک حاصل کی - شاعری وراثت
میں پائی - شاعری کا آغاز ۱۹۵۹ء سے ہوا - قصبہ تلہر کے جید عالم اور فن شاعری کے مسلمہ استاد

حضرت لیاقت حسین لیاقت سے فن کے رموز و نکات سیکھے بسلسلہ ملازمت شاہجہانپور کا رخ کیا آرڈننس کلودنگ فیکٹری میں ایک ڈمہ دار عہدہ پر فائز ہوئے۔ نصیب سے شریک حیات بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ، قابلہ اور اردو فارسی نیز انگریزی ادب میں فاضلہ محترمہ شریا حزیں انعام خداوندی کے طور پر بخشی گئی۔ ہندی اردو دونوں زبانوں کے مقبول و معروف کوی شاعر ہیں۔ ہندی میں دوہے۔ گیت۔ چھند اور کنڈلی میں شہرت رکھتے ہیں۔ اردو میں تقریباً ہر صنف پر طبع آزمائی فرمائی ہے۔ تخلیقات بقدر دیوان دونوں زبانوں میں موجود ہیں جو عنقریب کتابی شکل اختیار کرنے والی ہیں۔

نمونہ کلام ملاحظہ کیجئے۔

ہم پہ کچھ لطف و کرم اس طرح فرمائے گئے
ہر قدم پر مورد الزام ٹھہرائے گئے
خون دے دے کر چکایا لمحے لمحے کا حساب
پھر بھی جینے کی سزا میں دار پر لائے گئے

روش دہریہ روتا ہے دل
آئینہ رو برو احساس کا ہے
پیار و اخلاص و وفاسب باطل
اور میں ششدر و حیران و مجمل

وہ پیاس ہے ہر شخص کو اپنی ہی پڑی ہے
خورشید حقیقت کی بہت دھوپ کڑی ہے

شریّا خاتون حزیں

شریّا خاتون حزیں دختر جناب ریاست اللہ قریشی ۱۳ اپریل ۱۹۴۴ء کو پیدا ہوئیں۔ والدین سے تقسیم ہند کے بعد بوسیلہ ملازمت پاکستان ہجرت کر گئے۔ سید اطہر علی صاحب اپنے نانا کی آغوش محبت میں پرورش پائی اور تعلیم حاصل کی۔ جامعہ اردو سے ادیب کامل امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ جی۔ ایف۔ کالج شاہجہانپور سے بی۔ اے، بعدہ بی۔ ایڈ اور آگرہ یونیورسٹی سے زبان انگریزی اور جغرافیہ میں ایم۔ اے کیا۔ مقامی گریڈ کالج میں لکچرر ہیں۔ شعر و شاعری کا مواد طبیعت میں موجود تھا۔ اردو فارسی کے گہرے مطالعہ نے شعر موزوں کرنے میں بھرپور تعاون دیا۔ فطری طور پر زود رنج ہیں جس کا اثر شاعری نے قبول کیا اور رنگ و ثنائیت پیدا کر دیا۔ ابتداء میں مولانا لیاقت حسین

تلہری سے اس کے بعد اپنے خالو حضرت مغموم نقوی مقیم کراچی اور آخر میں حضرت نکبت شاہجہاںپوری سے مشورہ سخن کیا۔ شریک زندگی کے معاملے میں قدرت نے بہت فراخدلی سے کام لیا۔ شاہجہاںپور کے مقبول شاعر حضرت نور تلہری آپ کے شوہر ہیں۔ ذہین و طباع اور سوچ سمجھ کر شعر کہتی ہیں۔ نمونہ کلام ذیل میں درج ہے۔

درد بھر دے جو مری زلیست کے پیلنے میں کیا ہے ایسی بھی کوئی شے کسی مینانے میں
کبھی ابھر میں تھیں صدا بن کے تمھاری یادیں گونج باقی ہے ابھی ذہن کے غم جانے میں

نشر غم مے سینے میں اتر جانے دو دل کے زخموں کو ذرا اتر نکھر جانے دو
منشر زلیست ہے اپنی تو نشیمن کیسا اب یہ تنکے بھی ہواؤں میں بکھر جانے دو

آنکھوں سے کب اشکوں میں بہانے کے لئے ہیں یہ غم تو رگ جاں میں بسانے کے لئے ہیں
تعبیر تو ہوتی نہیں تقدیر میں ان کی کچھ خواب تو آنکھوں میں بسانے کے لئے ہیں

ہر تمنا میں غم یا س لئے بیٹھے ہیں ہم یہ کس درد کا احساس لئے بیٹھے ہیں
کیسے افسانہ غم کا کریں آغاز سزیں ہاتھ میں صفحہ قرطاس لئے بیٹھے ہیں

ہم قلم ہستی میں گرے چرخ بریں سے مدت سے گرفتار ہیں سانسوں کے بھنور میں

بے وفازلیست بھی نکلی کسی گل رُو کی طرح مل گئے خاک میں ہم ٹوٹ کے آنسو کی طرح
اب تو پھرتے ہیں بھٹکتے ہوئے صحرا صحرا اڑ گیا دل کا سکوں پھول کی خوشبو کی طرح

یوں نوازا تو نے اے ساقی مینانہ مجھے دے دیا میکہ لہو سے بھر کے پیمانہ مجھے

فصیح اکمل قادری

فصیح اکمل قادری خلف مولانا انوار میاں ساکن محلہ جلال نگر کی ولادت ۱۹۲۲ء میں ہوئی اردو فارسی کا بقدر ضرورت اکتساب علم کیا۔ دسویں کلاس سے ترک تعلیم کے لئے کچھ اسباب نے مجبور کر دیا۔ مطالعہ اور مشق نے نثر اور نظم دونوں میں نکھار پیدا کر دیا۔ نہایت ذہین اور طباع ہیں۔ آج کل بمبئی میں مقیم ہیں۔ نمونہ کلام

انگلیاں

(۱) مشرب فکر کی تمییل کہن کرتی رہیں
نقش احساس مکمل ہو جتن کرتی رہیں
ہر ستمگر نے یہ چاہا کہ لہو ہو جائیں
انگلیاں زحمت بیداری فن کرتی رہیں

(۲)

حادثے نقش بہ دیوار تو ہوتے ہی رہے
ان کو اسلوب کے پیکر میں تراشا کس نے
آئینے لمحوں کے عکاس تو ہو سکتے تھے
عکس کو فکر کا آئینہ دکھایا کس نے

(۳)

وقت حالات کے خاکوں میں تو ڈھل سکتا تھا
ان کون حالات کے خاکوں کو جڈا کر سکتا
ہر بدلتی ہوئی تہذیب میں سو روپ سہی
کون اس روپ کو آئینہ نما کر سکتا

(۴)

رہ گزاروں کا ہر اک ذرہ مہ و مہر سہی
درس خورشید سے فیض آشنا ہونے کے لئے
کاوش نور شناسی بھی ضروری تھا بہت
قلب تعمیر میں اعجاز سمونے کے لئے

(۵)

روح کا کرب جو محسوس ہوا پہلے پہل
سب سے پہلے دل فطرت سے ہم آہنگ ہوئیں
وہ تمنائیں کہ تھیں سر بگریبان خیال
انگلیوں کا ہے یہ صدقہ کہ وہ صد رنگ ہوئیں

مشرب فکر کی تمییر کہن کرتی رہیں
انگلیاں زحمت بیداری فن کرتی رہیں

حکیم عبدالواسع رشک

حکیم عبدالواسع رشک شاہجہانپوری بن جناب عبدالماجد محمد میاں شفیق بدایونی ثم شاہجہانپوری
۱۹۳۵ء میں اپنے آبائی وطن بدایوں شریف میں پیدا ہوئے اردو فارسی اور عربی حسبِ رواج
قدیم اپنے گھر میں حاصل کی اور ہائی اسکول پاس کر کے لاہور (پاکستان) ہجرت کر گئے جہاں سے
طبابت کی سند حاصل کر کے کراچی منتقل ہو گئے۔ آج کل کراچی کے مشہور اور کامیاب طبیوں میں شمار
ہوتے ہیں آپ سیدنا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اٹھائیسویں پشت میں ہیں آپ کا
خاندان بدایوں میں اب تک ذی علم اور قابل احترام مانا جاتا ہے۔ شاعری و رثہ میں پائی ہے۔ حضرت
ابراہیم گنوری کے ممتاز شاگرد ہیں ماشار اللہ صاحب تلامذہ ہیں۔ نمونہ کلام

روز ازل سے تابہ ابد آبدیدہ ہوں	اس جرم میں کہ بندہ غلعت رسیدہ ہوں
ہر لفظ پر ہے زیر و زبر کا موازنہ	مضمون زندگی ہوں مگر خط کشیدہ ہوں
محنت کے خون اور پسینے کے روپ میں	اس دور بے ثبات میں آفت رسیدہ ہوں

ان کے بغیر دل ہی نہیں اختیار میں	بس ہو اگر تو آگ لگا دوں بہار میں
مختاریوں میں جس کے انداز الاماں	سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں اختیار میں
ہے زندگی نمونہ دوزخ بنی ہوئی	اے رشک جل رہا ہے نشیمن بہار میں

چھڑے نہ ہمیں کاوشس انداز مشاہیر	ہم معترض حلقہ ارباب سخن ہیں
صورت ہے مگر خاک پہ کھینچی ہوئی صورت	ہم لوگ مشیت کا تقاضہ نہیں فن ہیں
پہنچے نہ کوئی جو شس میں فریاد و فغان تک	ہم لوگ ابھی دشمن تشریح کہن ہیں

اے رشک تباہی ہے مقدر تو ہوا کیا
ہم اہل وطن۔ شرح وطن۔ جان وطن ہیں

تعمیر میں جسم اور ہے تاثیر میں جاں اور	یہ کیسی خدائی ہے یہاں اور وہاں اور
جلووں سے تو کچھ اور نکھرتی ہے محبت	کیوں چھپتے ہو تم ایسے کہ ہوتے ہو عیاں اور

ہم فکر زلیخا کے طرفدار نہیں ہیں لیکن ترادر چھوڑ کے جائیں بھی کہاں اور
ہاں رشک وہی رشک جسے بھول گئے تم
آج اس کی غزل میں ہے غم سودوزیاں اور

ایوب حسن خاں - اثر

ایوب حسن خاں اثر ابن منشی مقبول حسن خاں ساکن محلہ دلازاک، شاہجہانپور کی ولادت
۱۰ اگست ۱۹۳۵ء کو ہوئی۔ تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ذریعہ معاش کے طور پر
آرڈیننس کلودنگ فیکٹری شاہجہانپور سے وابستگی اختیار کی۔ آپ کو شاعری اور نثر دونوں
میدانوں میں یکساں دلچسپی ہے۔ عرصہ دراز سے تخلیقات ملک کے رسائل و جرائد میں شائع
ہو رہی ہیں۔ نئی نسل کے شاعر ہیں۔ اشعار میں جدت اور فکر تازہ ہے۔ مسلسل مشق اور
مطالعہ آپ کے رہز اور رہنما ہیں۔ ۹ نمونہ کلام

مجھے گا راہِ محبت کا ہر دیا یوں بھی
خبر یہ کیا تھی چلے گی کبھی ہوا یوں بھی

نہ دوستوں سے غرض اور نہ دشمنوں سے گلہ
میں ایک عسیر اسیرانا رہا یوں بھی

ہنسی بھی آتے ہوئے اب لبوں پہ ڈرتی ہے
مٹی ہے زندہ دلی کی مجھے سزا یوں بھی

میں تیرگی کو کبھی روشنی نہ کہہ پایا
چھٹے ہیں مجھ سے کئی میرے آشنا یوں بھی

وہی تو ملتا ہے قیمت میں جو بھی ہوتا ہے
میں کر سکا نہ کسی سے کوئی گلہ یوں بھی

انہیں اندھیروں سے چھوٹے گی روشنی اک دن
دل شکستہ کو سمجھایا بار بار یوں بھی

اثر فضول ہے بے لوث دوستی کی اُمید
کہ آج دہر میں نایاب ہے وفا یوں بھی

دھوپ سے گردشِ دوراں کی بچائے رکھنا
مجھ پہ اے ماں کی دعاؤں یونہی سائے رکھنا
خود کو احساسِ ندامت سے بچانے کے لئے
دل کے زخموں کو زمانے سے چھپائے رکھنا
دوستوں پر کشِ آلام سے دل چور سہی
پھول ہونٹوں پہ تبسم کے کھلائے رکھنا
ہو مٹانا ہی اگر وقت کے ماتھے کا کلنک
پیار کے دیپ سہراہ جلائے رکھنا
جس طرف دیکھو لپکتے ہوئے شعلے ہیں اثر
کتنا دشوار ہے دامن کو بچائے رکھنا

رونق علی مصور

رونق علی نام مصور تخلص مگر اب صرف رونق مصور ہیں اور دنیا سے ادب میں اسی نام کے پہچانے جاتے ہیں۔ رونق کو مصوری سے گہری دلچسپی ہے۔ اسی کو پیشہ بنا لیا۔ بعد میں شوقِ شاعری ہوا تو ذہن و دل اور انگلیوں سے بیک وقت کام لینے لگے۔ محلہ ملّا خیل میں اپنے آبائی مکان کو بطور اسٹوڈیو بھی استعمال کرتے ہیں اور بطور رہائش گاہ بھی۔ آپ کے والد ماجد کا نام رعایت اللہ صاحب ہے اگست ۱۹۴۶ء میں ولادت ہوئی۔ اسکول میں دسویں درجہ تک تعلیم پائی مگر مطالعہ اور مشقِ سخن نے شاعری کو جلا بخشی۔ صاف سحرے شعر کہتے ہیں اور روایتی زبان و بیان استعمال نہیں کرتے اچھوتے اور نئے خیالات قلب بند کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ شعرا کی ابھرتی ہوئی نسل میں چھوٹے قد کے ہوتے ہوئے بڑے نظر آتے ہیں۔ ابتداء میں شاہجہا پور کے معتبر شاعر حضرت

رباب رشیدی سے مشورہ سخن کیا اب اپنے کلام پر خود ہی نظر ثانی کرتے ہیں۔ نمونہ کلام
گرتے ہوئے مکاں کو کہاں تک بچاؤں گا
ڈوبا تو ایک رسم انا چھوڑ جاؤں گا
تم بھی کسی کی سمت نہ پتھرا چھپانا
اب جو بچھڑ رہے ہیں تو کیوں ہو اُداس اُداس
پوچھیں گے لوگ ترک تعلق کا جب سبب
میں نے یہ سوچ کر نئے پودے لگائے ہیں

قطعہ

صبحیں بیوہ ہو گئیں اور شام کے منظر جلے
کیا تمہارے پاس ہے اس کا بھی کوئی اندراج
نفتوں کی آگ میں اخلاص کے پیکر جلے
عصمتیں کتنی لٹیں اس سال کتنے گھر جلے

محمد شمیم انصاری - شمیم

نام محمد شمیم انصاری تخلص شمیم ہے۔ آپ کے والد ماجد کا نام حسمت اللہ انصاری ہے۔
محلہ تارین جلال نگر کے ساکن ہیں۔ آپ کی ولادت ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔ کسی اسکول و کالج میں باقاعدہ
تعلیم حاصل نہیں کی مگر اپنے ذوق و شوق اور ذہانت کی بدولت سند یافتہ لوگوں سے زیادہ علمیت
حاصل کر لی۔ مطالعہ بہت وسیع ہے۔ ایک عرصہ تک دہلی میں بسلسلہ کار و بار قیام کیا اور
اسی قیام کے دوران شاعری سے فطری لگاؤ کو بڑھا دیا۔ اصناف سخن میں غزل، رباعی، قطعہ،
نظم، تراویح، نعت، مرثیہ اور سلام پر یکساں عبور رکھتے ہیں۔ مادر زاد شاعر ہیں مشورہ سخن
میں کوئی شامل نہیں۔

نمونہ کلام

ہو کے خاموش تو اب شعلوں پہ برفاب نہ رکھ
میں پھر اک عمر بھٹکتا ہوں نوحہ بن کر
اے مرے دوست مجھے تھنڈا القاب نہ رکھ
تار احساس پہ اس طرح سے مضرب نہ رکھ
شب گزیدہ ہوں مرے سامنے ہتھاب نہ رکھ
میری قسمت میں ازل سے رہی کرنوں کی قبا

اس سر اسیمہ نگر سے کوئی بوسہ بھی چسرا
اپنی قسمت کی لکیروں کو بدلنے کے لئے
کیا خبر پھرا نہیں راہوں سے گزر ہو تیسرا
جس کے سارے میں کوئی پھول نہ کھلنے پائے
صرف کاشکول میں زہراب ہی زہراب نہ رکھ
تو صحیفوں پہ نئے طور سے اعراب نہ رکھ
اپنی راہوں میں سلگتے ہوئے گرداب نہ رکھ
شجر یاس کو اس طرح بھی شاداب نہ رکھ
تجھ پہ لازم ہے ہر اک جسم کی تقدیس شمیم
اپنی نظروں میں فقط منبر و محراب نہ رکھ

متفرق اشعار

میں کہ الفاظ کی وادیوں کا خدا قرن شعلوں میں جلتا رہا
کاغذ و پتھروں پیڑ کی چھال پر خون روتی رہی ہیں مری انگلیاں

اب تک جو چل رہا تھا مسافر کے ساتھ ساتھ
اس چاند پر بھی لگ گئے پہرے گھٹاؤں کے

شمیم میں نے خود اپنے کو یہ دُعا دی ہے
میں سو بھی جاؤں تو صدیوں مزاسُخن جاگے

کبھی نظر میں زمانے کی وسعتیں کم تھیں
سمٹ گیا ہوں تو اب ذات کا حصار بہت

گزر کے جس سے مرے گھر میں چلی آئیں
کوئی تو شہر میں ایسا بھی راستہ ہوتا

سیدہ شفق آرا۔ شان معراج

والدین نے شفق آرا نام دیا۔ اور عرفیت شان معراج رکھی۔ آپ نے عرفیت کا جزو شان بطور تخلص استعمال کیا۔ والد صاحب کا نام سید اشفاق حسن میاں ہے محلہ تارین ٹیکلی میں رہتے ہیں مگر آبائی مکان محلہ تاجوخیل میں تھا۔ آپ کے بزرگوں کا شرفار و امرار شاہ بھہانپور میں شمار ہوتا تھا۔ آج بھی آپ کا خاندان ممتاز ہے۔ شان معراج صاحبہ کی ولادت ۲۲ جولائی ۱۹۴۷ء کو

ہوئی۔ روہیلکھنڈ یونیورسٹی سے ایم۔ اے (اردو) فرسٹ ڈویژن فرسٹ پوزیشن کے ساتھ پاس کیا۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات کے موضوع پر تحقیقی کام کر رہی ہیں شاعری ۱۹۷۲ء سے کر رہی ہیں اور حضرت رباب رشیدی شاہجہانپوری کی ممتاز شاگردہ ہیں۔ ہندوستان گیر شہرت کی مالک ہیں۔ ملک کے طول و عرض میں کل ہند سطح کے مشاعروں کے توسط سے گوم چکی ہیں۔ ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر اکثر آپ کا پروگرام ہوتا ہے۔ ملک کے بیشتر موقر جریدوں میں کلام شائع ہوتا ہے ادب برائے زندگی کی قائل ہیں۔ آپ کو غزل سے زیادہ دلچسپی ہے مگر دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کرتی ہیں۔ انتخاب کلام "ساحل سیپ سمندر" شائع ہو چکا ہے۔

نمونہ کلام

قطعہ

اشکوں کا سفر دل سے ہے پلکوں کے افق تک
فختار ہے وہ شخص جو دل کھول کے رو لے
یہ راہ میں رک جائیں تو ناسور سمجھے
ہنستے جو نہ پا لے اسے مجبور سمجھے

قطعہ

نظارے عام تھے میری نظر کے دامی میں
نگاہ ساتھ نہ دے پائی خواہش دل کا
طلب نے میری حیا سے شکست کھائی تھی
خودی نظر کے ہر اک زاویے پہ چھانی تھی

کبھی کبھی تری چاہت پہ یہ گماں گزرا
بچھڑ کے شام رہی طول عبس تک گویا
کہ جیسے سر سے ستاروں کا سا تباں گزرا
وہ میرا ضعف نظر تھا کہ تیرا عکس جہاں
ٹھہر گیا تھا جو لمحہ وہ پھر کہاں گزرا
چراغ ایسے جلا کر بجھا گیا کوئی
وہ کون تھا کہ جو منظر کے درمیاں گزرا
تمام دید کا عالم دھواں دھواں گزرا
جنوں شوق میں سجدوں کی آبرو بھی گئی
مجھے خبر نہ ہوئی کب وہ آستاں گزرا
چھپا کے سو گئی منہ دن میں رہ گزار خیال
جوشب ہوئی تو خیالوں کا کارواں گزرا

کیسے کیسے دلنشیں خوابوں کے منظر لے گیا
چاندنی راتوں سے وابستہ تھیں بزم آریاں
میری آنکھوں سے کوئی نیندیں چرا کر لے گیا
آج وہ یادوں کی دستاویز جھوٹی ہو گئی
چاند کیا ڈوبا کہ راتوں کا مقدر لے گیا
کوئی اس بستی کے نقشے سے مرا گھر لے گیا

مدتوں سے ہیں اڑانیں ایک ہی منظر میں قید نوح کر جب سے وہ میری سوچ کے پر لے گیا
 آئینوں سے دور وقت آئینہ داری کو شان
 لوگ کہتے ہیں کہ کوئی آئینہ گر لے گیا

فرزانہ شفق - فرزانہ

فرزانہ شفق - فرزانہ بنت جناب عبدالماجد محمد میاں شفق بدایونی ثم شاہبہما پوری بمقام شاہبہما پور
 محلہ بارہ روزی دوئم میں مئی ۱۹۴۹ء میں پیدا ہوئیں۔ جی۔ جی۔ آئی کالج سے انٹر۔ گاندھی فیض کالج
 سے بی۔ اے اور علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم۔ اے (انگریزی) کے امتحانات پاس کئے۔ فرزانہ شفق
 نسباً صدیقی اور سیدنا ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اٹھائیسویں پشت میں ہیں۔ آپ کا تعلق ایک
 ذی علم گھرانے سے ہے۔ شاعری ورثہ میں پائی ہے۔ والد ماجد اور دو بھائی عبدالواسع رشک
 و عبدالواجد انور جمال پاکستان کے معروف شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ فرزانہ صاحبہ کی طبیعت
 موزوں ہے۔ نظم گوہیں۔ گاہے گاہے غزل بھی موزوں کر لیتی ہیں۔ ملک کے جرائد میں آپ کا کلام
 شائع ہوتا رہتا ہے۔ نظم "زندہ باد ہندوستان" بہت سے مدارس میں قومی نظم کی صورت
 میں طلباء گاتے ہیں۔ نوٹہ کلام پیش خدمت ہے۔

پُجَارَن

کیسا چندن پھول کپور	گھر سے لے کر نکلی حور
سا لگری وہ پوجا کی	ہاتھ پہ اپنے رکھی تھی
دل میں پر بھولب پہ ترانا	ایسا دلکش ایسا سہانا
لہریں جیسے راگ سنائیں	کوئل سر میں جھرنے گائیں
چاندنی جیسے چاند کی ٹھنڈی	دریا پر ہے ناچا کرتی
اس نے گایا راگ نرالا	جس میں سوز و ساز بھرا تھا
بولی پر بھو دھن ہے تجھ کو	تو نے جیون بخشا مجھ کو
تیسری ہما اپرن پار	تجھ پہ جگت کا ہے ادھار

جیون تجھ سے جیون تو ہے گل میں تو ہی رنگ و بو ہے
 تیری اچھا میری شکست سب میں بس ہے تیری جھکت
 پتہ پتہ ڈالی ڈالی تیری قدرت سے ہریالی
 اُن بھی تو ہے دھن بھی تو ہے بن بھی تو ہے جن بھی تو ہے
 اوم نرنجن نر آکار سگرے جگت کا پالن ہار
 نیا میری پار لگا دے دل کا ہر دکھ درد مٹا دے

میسرے سوا اب کس کو چوں میں

مجھ میں تو ہے تجھ میں ہوں میں

ڈاکٹر ممنون حسن خاں - ممنون

ممنون حسن خاں ممنون کے والد ماجد کا نام شہتیر حسن خاں ہے محلہ ملّا خیل میں رہتے ہیں
 آپ کی ولادت ۱۹۳۹ء میں ہوئی۔ تعلیمی اعتبار سے آٹھواں پاس ہیں۔ ۱۹۶۲ء سے شاعری کا شوق
 ہے۔ حضرت نسیم شاہ بھہا پوری سے مشورہ سخن فرماتے تھے۔ اور اب حضرت شائغل وجدانی سے
 مشورہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹری آپ کا پیشہ ہے۔

نمونہ کلام

کیوں ابھی سے میں کروں فکر کہ کل کیا ہوگا وہی ہو گا مری قسمت میں جو لکھا ہوگا
 کیا خبر تھی کہ گزر جائے گی ہر شب رو کر جاگتے جاگتے ہر روز سویرا ہوگا
 یاد ماضی کی جو تنہائی میں آئی ہوگی میرے بارے میں ضرور آپ نے سوچا ہوگا
 ہم نے چھوٹے ہیں دلوں پر وہ محبت کے نقوش ہو کوئی دور مگر ذکر ہمارا ہوگا

ایک دن آئے گا ایسا بھی یقیناً ممنون

میرا افسانہ وہ مجھ کو ہی سناتا ہوگا

آپ کا غم بھی رونق دل ہے بس یہی غم بھر کا حاصل ہے
 سچ تو یہ ہے کہ آج کا انسان خود ہی مقتول خود ہی قاتل ہے

کتنی مسموم ہے فضا ئے جہاں سانس لینا بھی اب تو مشکل ہے
 زیست میں انقلاب پاتا ہوں نہ وہ ارمان ہیں نہ وہ دل ہے
 دیکھے کیا مال ہو ممنون
 وہ نظر آج جانبِ دل ہے

شمیم بیگم شمیم

شمیم بیگم شمیم بنت محمد احمد خاں ساکن محلہ علی زئی کی ولادت ۱۹۳۷ء میں ہوئی۔
 جوان بھی نہ ہونے پائی تھیں کہ سر سے والد کا سایہ اٹھ گیا۔ اپنے ذوق و شوق سے تعلیم حاصل کی
 ایم۔ اے (اردو) اور ایم۔ اے ہسٹری کے امتحانات پاس کئے۔ بی۔ ایڈ کی سند لی اور مقامی گریڈ
 اسکول میں ملازمت کر لی۔ شعر و شاعری کا شوق دورانِ تعلیم پیدا ہوا۔ شعر موزوں کرتی ہیں مگر رہبر کوئی
 نہیں ہے اپنے وجدانِ سلیم کو رہبر بنا لیا ہے۔

نمونہ کلام

دل غمیدہ بہلتا ہی نہیں	گویا ما حول بدلتا ہی نہیں
اتنی ویراں تو نہ تھی راہِ وفا	آج اس پر کوئی چلتا ہی نہیں
دیکھ کر مومی دل کا عالم	کوئی ارمان نکلتا ہی نہیں
غم کے جھونکے نہیں آتے جب تک	دل ہے وہ دیپ کہ جلتا ہی نہیں
سامنے ان کے زباں ہے خاموش	کوئی آنسو تو نکلتا ہی نہیں
سوئے سیلاب سفینہ ہے رواں	اب بنگھلے سے سنبھلتا ہی نہیں

نئے حالات ونئی آب و ہوا چاہتے ہیں	جس میں جیسے کا مزہ ہو وہ فضا چاہتے ہیں
موسم گل نہ ہمیں فصل خزاں سے مطلب	کوئی بھی رت ہو گلستاں کی بقا چاہتے ہیں
آپ ہی کیے یہی ہوتی ہے کیا شرط وفا	بے وفا خود ہیں مگر مجھ سے وفا چاہتے ہیں
منہ تکا کرتے ہیں ہم اس کا کوئی شخص بھی ہو	تذکرہ اس سے تمہارا ہی سنا چاہتے ہیں

یہ الگ بات ہے ظاہر نہ کریں ورنہ شمیم
ہم کو معلوم ہے سب ہم سے وہ کیا چاہتے ہیں

سردار آصف - آصف

سردار آصف خلیف جناب صفدر علی خاں صاحب ساکن محلہ مینگی ٹولہ شاہجہانپور ۱۵ جنوری
۱۹۵۳ء کو پیدا ہوئے علمی اعتبار سے بی۔ ایس۔ سی، بی۔ ایڈ، ایم۔ اے (ہسٹری) ہیں۔ یو۔ پی سرکار میں
پنچایت راج آفیسر ہیں۔ شاعری کا شوق بچپن سے ہے۔ فن شعر میں حضرت خالد علوی سے مشورہ لیتے
ہیں۔

نمونہ کلام

وہ شخص کہ قد جس کا بہت ہم سے بڑا تھا
افسوس کہ اس نے بھی مجھے غیپ ہی سمجھا
ہر کوئی گزرتا تھا بہت بچ کے ادھر سے
بیچا تھا جسے میں نے غریبی کے دنوں میں
دیکھا تو کسی اور کے پیروں پہ کھڑا تھا
میں جس کے لئے مدتوں اپنوں سے لڑا تھا
آئینہ لئے راہ میں اک شخص کھڑا تھا
اس گھر میں سنا ہے کہ خزانہ بھی گڑا تھا

ہاتھ سے دیوار سر سے سائباں کوروک لوں
راہ میں حائل تھیں میری انگنت مجھوریاں
میں تو ساحل پر کھڑی اک ریت کی دیوار ہوں
کیا خبر کرنا پڑے اس سے مجھے پھر تصفیہ
کاش میں احساس کے گرتے مکاں کوروک لوں
جی بہت چاہا کہ جلتے میہماں کوروک لوں
کس طرح بڑھتے ہوئے سیل رواں کوروک لوں
بول لینے دوں اسے اپنی زباں کوروک لوں

عظیم
محمد عظیم

محمد عظیم نام اور تخلص بھی عظیم والد کا نام محمد اسماعیل صاحب۔ محلہ بکسریاں کے رہنے والے
ولادت ۵ ستمبر ۱۹۵۳ء کو شاہجہانپور میں ہوئی۔ گھریلو تعلیم اور اسکولی مدارج سے گزرنے کے بعد

اردو مضمون کے ساتھ ایم۔ اے کیا ساتھ ہی الکرٹیکل انجینئرنگ میں ڈپلومہ یافتہ بھی ہیں۔ طبیعت نوزوں ہے چند سال سے شاعری باقاعدہ کرتے اور مقامی مشاعروں میں شریک ہو کر داد و وصول کرتے ہیں۔ جدید رجحان رکھنے والوں میں اہم مقام حاصل ہے۔ آج کل کے نوجوان شعراء استادی شاگردی کے قائل نہیں۔ غالباً اسی طبقہ سے حضرت عظیم بھی تعلق رکھتے ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

غزلے

وہ چشم نم سے ہی آخر جواب دے مجھ کو
کہیں میں دولت احساس بھی نہ کھو بیٹھوں
ابھی تو سنگ ملامت کا زخم تازہ ہے
چلا بھی آگے میں ترک تعلقات کے بعد
تمام شہر تو تاریکیوں میں ڈوبا ہے

کہ سنگ لب ہے تو پھر یوں حسا دے مجھ کو
مرے خدا تو نہ ایسا جواب دے مجھ کو
ابھی یہ ظلم نہ کر مت گلاب دے مجھ کو
ہوں ایک لاش تہہ خاک داب دے مجھ کو
میں کیسے کہہ دوں کہ اک ماہتاب دے مجھ کو

اسے نجات دلانا کسی کے بس میں نہ تھا
تھکا تھا سا پریشان سا پلٹ آیا
جو سوچتا ہوں کبھی میں تو ایسا لگتا ہے
میں جستجوئے مسلسل سے تھک گیا آخر
وہ مجھ سے دور رہا اور رتیں بدلتی رہیں

تھا اپنی ذات کا قیدی کسی قفس میں نہ تھا
کہ آسمان پرندے کی دسترس میرا نہ تھا
وہ کب بسا ہوا میرے نفس نفس میں نہ تھا
کہ اپنے آپ کو پالینا میرے بس میں نہ تھا
مگر بہار کا موسم کسی برس میں نہ تھا

جاوید اللہ خاں - جاوید

جاوید اللہ خاں جاوید خلف جناب صنعت اللہ خاں صنعت یکم جون ۱۹۵۷ء کو متحدہ
ہاڑوزی پیشاوری میں پیدا ہوئے۔ تعلیم انٹر میڈیٹ تک حاصل کی۔ اردو بھی بقدر ضرورت
جانتے ہیں۔ گھر میں شعر و شاعری کا چرچا تھا طبیعت بھی موزوں پائی ہے شعر موزوں کرنے لگے
۱۹۷۸ء سے حضرت نسیم شاہ بھانپوری سے مشورہ سخن کرتے ہیں۔ ان دنوں انڈین ٹرین
ٹائن اینڈ روزن کمپنی کلکٹر بک گنج بریلی میں ملازم ہیں۔ کلام روزناموں اور رسائل میں شائع ہوتا

ہے۔ بیرونی و مقامی مشاعروں میں شوق سے شریک ہوتے ہیں۔

نمونہ کلام

اس دل کو آشنائے نوازش نہ کیجئے
مجھ پر عنایتوں کی یہ بارش نہ کیجئے
اک بار ٹوٹ کر نہیں جڑتے ہیں آئینے
تجدید رسم و راہ کی کوشش نہ کیجئے
پیہم نوازشیں بھی بڑھانی ہیں جو صلے
للتد مجھ کو مائل لغزش نہ کیجئے
لفظ خلوص آج ہے ہمل سا ایک لفظ
معنی میں قید کرنے کی کوشش نہ کیجئے
جاوید ضبط غم کا تقاضہ ہے آپ سے
پلکوں پہ آنسوؤں کی نمائش نہ کیجئے

یادوں کی آندھیوں کا کہیں پھر گزرنہ ہو
بے برگ و بار پھر مرے دل کا شجر نہ ہو
دیتے ہیں وہ دُعا مجھے غمِ دراز کی
لیکن خدا کرے کہ دُعا میں اثر نہ ہو
ممکن نہیں بشر سے گناہوں کا ارتکاب
یارب ترے کرم پہ بھروسہ اگر نہ ہو
غمِ دے کے کر رہے ہیں وہی پریش مزاج
جیسے ہمارے حال کی ان کو خبر نہ ہو
پھر چشم التفات سے وہ دیکھتے ہیں آج
جاوید پھر فزوں کہیں درد جگر نہ ہو

رئیس احمد نعمانی - رئیس

رئیس احمد نعمانی - رئیس خلع جناب شمس الدین کی ولادت ۱۵ مارچ ۱۹۵۸ء کو ہوئی۔ آبائی وطن قصبہ کانٹھ ضلع مراد آباد ہے۔ ابتدائی تعلیم اور حافظہ قرآن مجید کے بعد تحصیل علم کے شوق میں قصبہ سنبھل اور امر وہہ میں کچھ مدت قیام رہا۔ وہاں سے چل کر وادشا ہجہا پور ہوئے یہاں کی سرزمین کچھ اس طرح دامنگیر ہوئی کہ یہیں کے ہو رہے اور عمر کا ایک حصہ اکتساب علم و فن میں صرف کیا۔ حضرت مولانا یوسف علی مدظلہ العالی سے زبان و بیان کے رموز و نکات سیکھے حصول علم کی پیاس نے جب زیادہ بے چین کیا تو عازم لکھنؤ ہوئے جہاں منشی - عالم - دبیر کامل - کامل - فاضل تفسیر - بی۔ اے اور ایم۔ اے کے امتحانات پاس کئے شوق سے

شاعری شاہجہاںپور کی علمی و ادبی صحبتوں میں پیدا ہوا اور پروان چڑھا تھا لکھنؤ کی صحبتوں میں فروغ پایا۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں مشق سخن جاری ہے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے زبان فارسی میں تحقیقی کام کر رہے ہیں۔

اب تک مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف و تالیف کر چکے ہیں۔

- ۱۔ برات معنی : فارسی غزلیات کا انتخاب
- ۲۔ ریاض عقیدت : بتیس شعرا کے اردو کے نعتیہ کلام کا انتخاب
- ۳۔ حدیث حیات : موجودہ بتیس ہندو نثر اد اور ایرانی شعرا کے کلام فارسی کا انتخاب۔

نمونہ کلام

غزلے

توفیق دے خدا تو یہ کار ثواب کر	ہنس کر کبھی شکستہ دلوں سے خطاب کر
پیدا جو کر سکے تو ہمارا جواب کر	کہتے نہیں یہ ہم کہ ہمیں انتخاب کر
دل کی جراحتوں کا نظر سے حساب کر	خجربکف تھا کون نظاروں سے یہ نہ پوچھ
ذرات کی شکستہ دلی کا حساب کر	فرصت ملے جو فکر مہر سے کبھی
اس عصر پاک کی نہ مرتب کتاب کر	ہر باب لکھنا ہوگا بعنوان قتل و خون

وہ اور چارہ سازی ارباب غم رئیس

بندان فریب خوردہ خیالوں کا باب کر

ترنم صنیا۔ ترنم

ترنم صنیا ترنم بنت احمد اللہ خاں کینی ساکن ہمند جلال نگر کی ولادت ۲۵ دسمبر ۱۹۵۹ء کو ہوئی۔ تعلیمی اعتبار سے ایم۔ اے ہیں اور ایک پرائیویٹ گریڈ اسکول کی ریحروا ہیں۔ شوق شاعری ورثہ میں پایا۔ محمد نسیم خاں نسیم سے مشورہ سخن کرتی ہیں۔

کون کہتا ہے گلستاں میں بہا ر آئی ہے	دل فریبی ہے گلوں میں نہ وہ رعنائی ہے
دل بیتاب ہے۔ ہم ہیں۔ شب تنہائی ہے	اتنی روداد محبت ہے فقط اے ہمدم

میرے بارے میں بھی کچھ آپ نے سوچا ہوگا
کچھ تو کیسے کہ مری جان پہ بن آئی ہے
تم ترنم سے خفا ہی کسہی لیکن اس نے
کیا خطا کی ہے کہ یہ جس کی سزا پائی ہے

جس طرح چاہو کلیجہ مرا چھلنی کر دو
تیر لفظوں کے خدارانہ چلاؤ لوگو
مغرب دل کی وہی دھن ہے وہی لہجہ ہے
کچھ تو انداز نئے اس کو سکھاؤ لوگو

منزل شوق ایسی منزل ہے
دل میں موجود۔ دور آنکھوں سے
نہ یہ آسان ہے نہ مشکل ہے
اس جدائی میں قرب شامل ہے

ہم لوگ مشکلات کا حل ڈھونڈتے رہے
کچھ لوگ تھے جو راہِ عمل ڈھونڈتے رہے
وہ خود بشکل سایہ ہمارے تھا ساتھ ساتھ
ہم جس کو اپنے شہر میں کل ڈھونڈتے رہے

آئی ہے جن کو اس وہی لوگ خوش رہیں
اب ہر طرف فضائے چمن ہے دھواں دھواں
ہم تو بھری بہار میں صرف خزاں رہے
جائے کدھر نکل کے کوئی اور کہاں ہے

ہر اشک غم خوشی سے پئے جا رہی ہوں میں
مردہ دلوں کو جینا ترنم کہاں نصیب
روشن وفا کا نام کئے جا رہی ہوں میں
جینے کا شوق ہے تو جئے جا رہی ہوں میں

حضرت عزیز احمد خاں شفق طاہری

اب ادبی حلقوں میں شفق طاہری کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ میران پور کٹرہ تحصیل تلہر ضلع
شاہجہانپور کے ساکن ہیں اور اسی قصبہ میں ایک دینی درسگاہ میں بحیثیت صدر مدرس فائز ہیں۔
مدرسین اعلم شاہجہانپور سے منشی کامل کیا ہے۔ اردو۔ فارسی اور عربی سے واقفیت ہے
ہندی اور انگریزی بقدر ضرورت جانتے ہیں۔ فطرتاً شاعر ہیں۔ بچپن سے طبیعت شاعرانہ پائی

ہے۔ اصناف سخن میں غزل سب سے زیادہ محبوب ہے۔ تقریباً بیس سال سے مشق سخن جاری ہے
حضرت طاہر تلہری سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ آپ روایتی شاعری سے ہٹ کر شعر کہتے ہیں۔
اپنے ہم عصر شعرا میں امتیاز حاصل ہے اور اہل ذوق میں مقبول ہیں۔

نمونہ کلام

تمھاری یاد کے چہرے تھے نرم موسم تھا
تمام دن کے دکھوں کا بدل سگلتے خواب
ملا تو بت کی طرح اور بچپڑ گیا تو خیال
طلوع عصر کی کیسے ہمیں خبر ہوئی
اے قریب سے دیکھا تو یہ ہوا محسوس
لطفیل لمس بھری لذتوں کا ریشم تھا
سلوک نیند کا آنکھوں سے کتنا مبہم تھا
میکر خیال سے وہ شخص کتنا مبہم تھا
ہمارے گھر کی مڈیروں پہ کل کا پرچم تھا
خیال اور حقیقت میں فاصلہ کم تھا

جسے جھلانہ سکا اس کو یاد کیا رکھتا
شفیق وہ بھول گیا جو زباں پہ ہر دم تھا

ہر ایک فنکار نے جو کچھ بھی لکھا خوب تر لکھا
ہر اک نقش کعبہ پانٹشار جاں کا منظر ہے
درختاں کتنے لمحے کر گیا اک برگ جاں رفتہ
رو پہلے رنگ دلکش دائرے ہلکے سبک شوشے
میں ہوں خلعت گزیر یہ کھیل ہے تقدیر کا ورنہ
ہوانے پانیوں پر پانیوں نے ریت پر لکھا
یہ کس کے کانپتے پیروں نے آغاز سفر لکھا
شجر سے اس نے گر کر دائروں میں کس قدر لکھا
کسی نے کتنی فنکاری سے اس کے جسم پر لکھا
سیاہی سے بھی میں نے روشنی کے نام پر لکھا

شفیق کا رنگ کتنے دالہا نہ پن سے نکرا ہے

زمیں و آسماں نے مل کے عنوان سحر لکھا

متفرق اشعار

اتنا قریب ہو کے دکھا جسم و جان سے
موج صبا گزرنہ سکے درمیان سے

زمیں زیر قدم سر پہ آسماں رہا
ہماری قید کو کتنا بڑا مکان رہا

میرا فن ہے تیری تعریف کے شر سے اونچا
میں نے آواز کو لکھا ہے نظر سے اونچا

قمر شاہجہاں پوری

نام : سید محمد طاہر میاں۔

تخلص : قمر شاہجہاں پوری ولد حضرت حافظ صوفی سید ہدایت علی شاہ۔

تاریخ پیدائش : یکم اگست ۱۹۴۲ء لودھی پور شاہجہاں پور۔

ابتدائی تعلیم : تلہ زئی پرائمری اسکول۔ دینیات مدرسہ فیض عام شاہجہاں پور۔

کلکتہ سے : مولوی۔ عالم۔ فاضل درس نظامی۔

ادیب ماہر منشی کامل۔ فاضل ادب علی گڑھ الہ آباد سے۔

اساتذہ : حضرت حافظ سید ہدایت علی شاہ قادری۔ حضرت مولانا حکیم محمد دانش علی فریدی رحمۃ اللہ علیہ
گذشتہ تیس سال سے کانپور میں قیام ہے۔ وہاں مجلس علمائے اہل سنت کے صدر اور ناظم
تعلیمات الجامعہ العربیہ احسن المدارس قدیم کانپور اور نائب قاضی شہر کانپور کے علاوہ مدیر معاون
استقامت ڈائجسٹ کانپور نیز بہت سی علمی و ادبی و مذہبی تنظیموں سے بھی وابستہ ہیں۔

نمونہ کلام :

کسی کی یاد میں جب ہم قلم اٹھاتے ہیں	تمام رات ستارے غزل سناتے ہیں
ہمیں شعورِ غمِ عشق سے ہے آگاہی	کہ ہم چراغ نہیں اپنا دل جلاتے ہیں
سمندوں کا بھی احسان اب نہیں یارو	غبار اٹھتا ہے اور شہر ڈوب جاتے ہیں
خطوط جسم ابھرتے ہیں نور کی مانند	وہ پاس ہوں تو اندھیرے بھی جگمگاتے ہیں

قمر بہت ہیں ندامت کے چند آنسو بھی

اسی سے دامنِ حساس بھیک جاتے ہیں

نشاں مٹے تو نشانات میں شمار ہوا
 اُجڑ گئے تو مکانوں کا اعتبار ہوا
 خدا نہیں تھا یہ احساس بار بار ہوا
 ہمارے جرم سے پتھر گناہگار ہوا
 وفا کہ جس پہ قناعت تھی ہم فقیروں کی
 یہ ایک لفظ بھی دُنیا میں سنگسار ہوا
 تمہارا تاج محل ہو کہ مجھ غریب کا گھر
 جو بن گیا وہی دُنیا میں شاہکار ہوا

کبھی نہ حد سے تجاوز کیا قسمیں نے
 مجھے نشہ بھی باندازہ شمار ہوا

آپ کا مجھ پہ کوئی تازہ کرم ہو جائے
 مدعا یہ ہے کہ پھر کوئی ستم ہو جائے
 روشنی اور بھی کم اور بھی کم ہو جائے
 صرف دامن نہیں احساس بھی غم ہو جائے
 وہ جو آسان سمجھتا ہے وفا کی منزل
 میسر ہمراہ وہ دو چار قدم ہو جائے
 عافیت میں کئی دن سے ہیں زمانے والے
 اُوکھ تذکرہ دیر و حرم ہو جائے
 نئے شاعر کو یہی فکر لگی رہتی ہے
 کوئی مفہوم ہو آسیب قلم ہو جائے
 بے زبانی کو زباں کیسے بناؤں یارو
 کوئی افسانہ نہیں ہے کہ قسم ہو جائے

تربتِ اہل محبت پہ یہ لکھا ہے قسم
 جس کو جینا ہو وہ پامالِ قدم ہو جائے

محمد وسیم - وسیم مینائی

قاضی محمد وسیم - وسیم ابن محمد نسیم خاں محلہ تارین جلال نگر کے ساکن ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں پیدا ہوئے۔ اردو گھر میں پڑھی۔ اسکولی تعلیم واجبی ہے۔ شعر گوئی کا فطری ملکہ ہے۔ والد محمد نسیم خاں نسیم شاہ جہاں پوری کے زیر تربیت ہیں اور انھیں سے مشورہ سخن لیتے ہیں۔ ان کے دادا حضرت سید محمد خاں شفق مرحوم بھی شاعر تھے۔ محمد وسیم قاضی کے عہدہ پر فائز ہیں۔ کلام میں روایتی انداز کے پہلوؤں پہلو جنت اور تازگی بھی ہے۔

نہ سہی کوئی نہیں ہے جو منانے والا خود چلا آئے گا پھر روٹھ کے جانے والا
میرا دروازہ ہواؤں نے ہلایا تو سہی میں تو سمجھا تھا کوئی بھی نہیں آنے والا
قافلے والوں کو کیا منزل مقصود ملے راہ پر خود ہی نہیں راہ بتانے والا
رات بھی ڈھلنے کو ہے تارے بھی بجھنے کو وسیم
سو بھی جاؤ کہ نہیں اب کوئی آنے والا
چند اشعار

اٹھا تو پرچمِ عظمت نشان لے لے گا وہ اپنے ہاتھ میں جس دن کمان لے لے گا
ہوائے تازہ جو دیتا تھا وہ درخت اک دن یہ کیا خبر تھی ہماری ہی جان لے لے گا

دور تک ہم اپنے قدموں کے نشاں چھوڑ آئے ہیں
آنے والے قافلوں کو راستہ مل جائے گا
پہلے خدمت کیجئے ماں باپ کی پھر اس کے بعد
آپ کو خود میری عظمت کا پتا مل جائے گا

اگر ہم بھی چلیں بیساکھیوں پر تو سب ہم کو بھی قد آور کہیں گے
اٹھا لو فائدہ سائے سے ان کے یہ بوڑھے پیڑ کب تک ساتھ دیں گے

مجھے یوں پکارتا ہے ترے نام سے زمانہ
 کہ ہے میسر پیرہن میں ترے پیرہن کی خوشبو
 ہیں وسیم ہر زباں پر ترے نغمہ محبت
 یہ کہاں کہاں گئی ہے ترے فکر و فن کی خوشبو

زندگی مختصر - اور لمبا سفر ہم تڑپتے رہے - شام سے تا سحر
 چارتنگے سہی - آشیاں ہے مگر منتظر ہی رہے - ہم ادھر وہ ادھر
 عشق کی راہ میں - ہر قدم پر خطر
 اے وسیم ان کا غم، مستقل، معتبر

راشد ندیم

نام راشد احمد قلمی نام راشد ندیم والد کا نام ندیم احمد عرف منے میاں - ۲۱ جنوری ۱۹۶۵ء
 کو شاہبہاں پور میں پیدا ہوئے۔ ہائر سکندری سے گریجوایشن تک تعلیم شاہبہاں پور
 میں حاصل کی۔ اس کے بعد روہیلکھنڈ یونیورسٹی سے اردو اور ہندی ادبیات میں ایم۔ اے
 کیا۔ آج کل اسی یونیورسٹی سے اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہے ہیں۔
 ۱۹۸۸ء سے شعر گوئی کا آغاز کیا۔ جناب ساغر وارثی سے مشورہ لیتے ہیں۔
 غزل ہی ان کا ذریعہ اظہار ہے۔ وہ جدید احساس و فکر کو کلاسیکی لب و لہجہ میں ادا کرنے
 کی کوشش کرتے ہیں۔ کلام میں تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ دوسرے جدید شعرا کے
 برعکس ان کے اشعار بے راہ روی اور ابہام سے پاک ہیں۔
 چند غزلوں کے اشعار دیکھئے۔

کہاں کی رسم محبت کہاں کی تعبیریں
 نہ جانے کیا ہوا ہنس مکھ سے اس مصور کو
 کسے خبر کہ مری کھوئی کھوئی آنکھوں میں سے
 بہ ارتعاش سے اب کیوں فضا میں اے راشد
 سسک رہی ہیں کتابوں میں ساری تحریریں
 کہ اضطراب زدہ کردیں ساری تصویریں
 کچھ ایسے خواب ہیں جو ڈھونڈتے ہیں تعبیریں
 تمام شب تو کھنکتی رہی تھیں زنجیریں

اسیروہم ہوئے فرق خیر و شر بھی گیا
 سکھا دیئے ہیں ہمیں وقت نے سفر کے اصول
 نہ کوئی چہرہ نہ منظر نہ کوئی پرچھپائیں
 کوئی نیا تو نہیں یہ سفر خلاؤں کا
 اب اور کس کا تجھے انتظار ہے راشد

یقین گیا تو دعاؤں سے وہ اثر بھی گیا
 تبھی تو دل سے وہ اک شوق ہمسفر بھی گیا
 میں گم ہوا تو وہ سرمایہ نظر بھی گیا
 حد گماں سے تو آگے میں پیشتر بھی گیا
 اٹھا تھا دل میں جو طوفان وہ گذر بھی گیا

ہر شخص جن سے ڈر کے تجھے بس ملال دے
 اس آس نے تو اور بھی بخشش ہیں تلخیاں
 بے چہرگی کی قید میں کب تک رہے گا تو
 مت ڈھونڈ ان ہیں زلیت کے اب گشہ نقوش
 سائے کسی کی یادوں کے ہیں کب سے مضطرب

اے زندگی تو مجھ کو وہ سارے سوال دے
 جو دے سکا نہ ماضی وہ شاید یہ حال دے
 باہر نکل کے خود کو کوئی خدو خال دے
 کر چیں سمیٹ اور فضا میں اچھال دے
 راشد اب ان کو تو کسی پیکر میں ڈھال دے

جب بھی میرا سفر کا ارادہ ہوا
 کچھ تو کم ہوتری تشنگی اے زمیں
 فکر کے دائرے جب سمٹنے لگے
 لفظ مبہم ہوئے ذہن سادہ ہوا

مشعل راہ راشد رہے عمر بھر
 کچھ اندھیروں سے یوں استفادہ ہوا

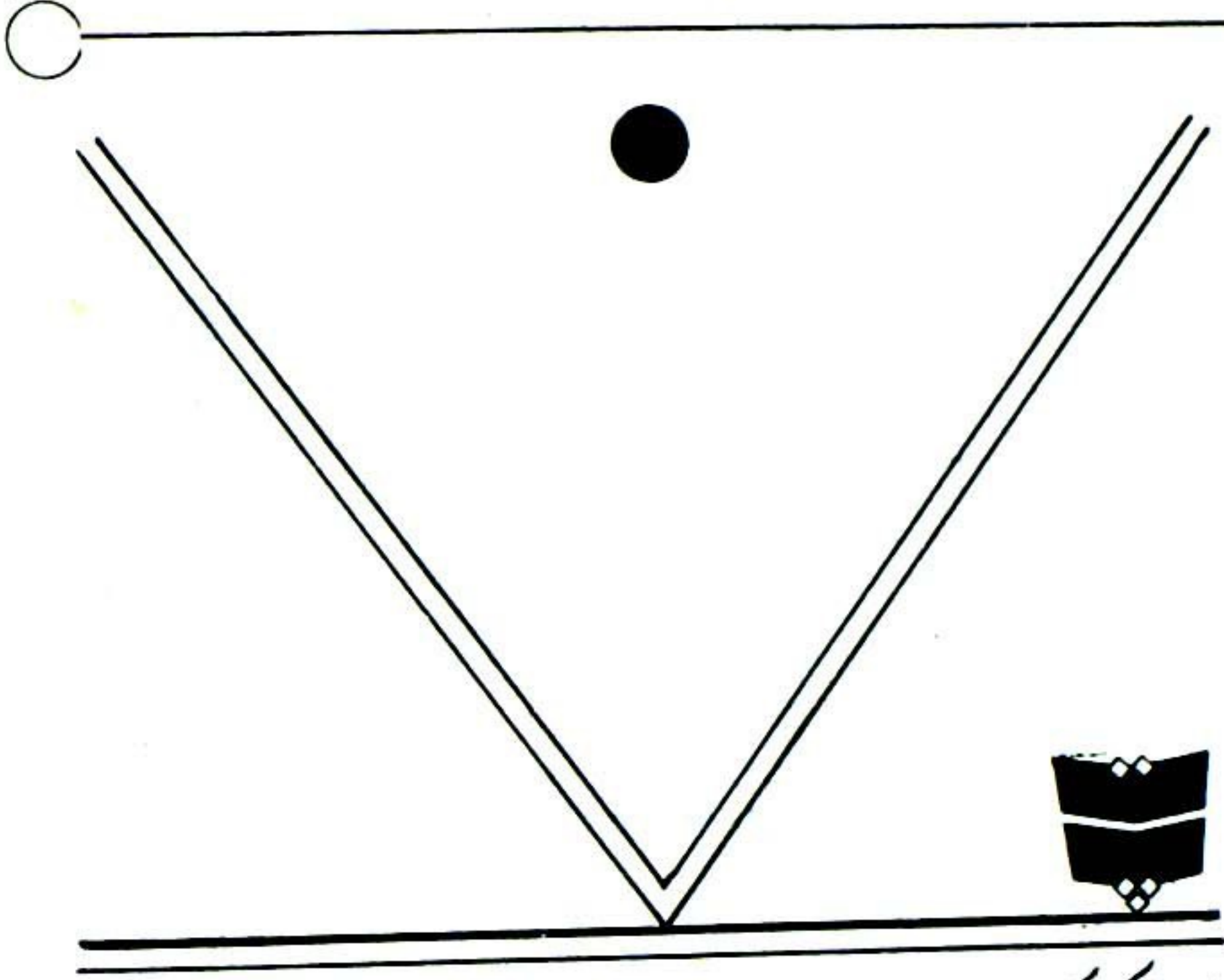
مختصر کتابیات

- اخبارات جو شاہ جہاں پور سے شائع ہوتے تھے -
- ۱- سادات پریس - اخبار المیزان ایڈیٹر سید مقصود علی - از ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۲ء
 - ۲- تربیت، ہفتہ وار ایڈیٹر سید عابد علی - از ۱۹۳۱ء تا ۱۹۵۴ء
 - ۳- سراجیہ پریس سے گلہ سہ سراج سخن شائع ہوتا تھا
 - ۴- گلہ سہ ارمغان ایڈیٹر منشی احسان علی خاں احسان جولائی ۱۸۹۶ء سے دسمبر ۱۸۹۹ء تک
 - ۵- رسالہ مرقع ایڈیٹر شیخ ولی حسن - شیخ ولی حسن کا اپنا پریس تھا
 - ۶- ایڈورڈ گزٹ ایڈیٹر سید مختار احمد میاں مختار از ۱۹۰۲ء تا ۱۹۰۵ء
 - ۷- رسالہ زبان اردو ایڈیٹر نواب ناظم علی خاں ہجر از جنوری ۱۹۱۰ء تا ۱۹۱۳ء
 - ۸- رسالہ شبیہ یار ایڈیٹر احسان علی خاں احسان یہ ارمغان کے ساتھ نکلتا تھا۔

دیگر کتب و رسائل

- ۱- رہنمائے تعلیم لاہور، دل نمبر۔ بابت ماہ اپریل ۱۹۳۲ء جلد ۳، شماره ۳
- ۲- تاریخ شاہجہا پور، تاریخ احسانی قلمی حصہ دوم، مصنف منشی احسان علی خاں احسان
- ۳- رباب زلیت، کتابچہ مرتبہ و مصنفہ فصیح اکمل قادری۔ شاہجہا پور
- ۴- رسالہ زبان اردو، از نواب ناظم علی خاں ہجر
- ۵- رسالہ ارغماں، از منشی احسان علی خاں احسان۔ شاہجہا پور
- ۶- رسالہ بہار بے خزاں۔ بریلی
- ۷- رسالہ جلوۂ یار۔ میرٹھ
- ۸- شعرا اترپردیش حصہ سوم، از جناب عرفان عباسی لکھنؤ
- ۹- تاریخ صبیح، از صبیح الدین میاں شاہ جہا پور
- ۱۰- برات معنی، از رئیس نعمانی
- ۱۱- طلسم افکار، از سید ظہور احمد وحشی
- ۱۲- نغمہ دل، از حضرت دل شاہجہا پوری
- ۱۳- ترانہ دل
- ۱۴- یادگار سلف، از جناب عبید اللہ خاں، بلندسہر
- ۱۵- قلمی بیاضیں اور قلمی یادداشتیں
- ۱۶- خجنانہ جاوید، از سری رام۔ دلی
- ۱۷- الاؤ (پندرہ روزہ) مدیر مبارک شمیم

علم اور عمل



یاد رکھو کہ،

علم کے ساتھ عمل ضروری ہے
نہ عمل کے بغیر علم نافع ہے اور نہ علم کے بغیر
عمل نفع بخش ہے۔

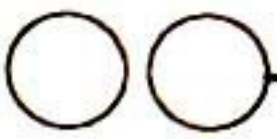
جس علم کی پشت پر عمل موجود نہ ہو
وہ علم جہل ہی کے زمرے میں شامل ہے۔
— حضرت داتا گنج بخشؒ

کشف المحجوب سے



لکھو
اور
اپنے علم کو اپنے دوستوں کے درمیان پھیلانے
اور
جب وقت سرگ آئے تو اپنے
بچوں کو
بطور سیرات سکھانے
کیوں کہ
جب — فتنہ و آشوب کا زمانہ آتا ہے
تو بجز کتاب
کوئی اور مولس و دم ساز نہیں ہوتا

حضرت امام جعفر صادقؑ





مبارک شمیم بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ ان کے دو شعری مجموعے ”نقشِ نوا“ اور ”آب و ہوا“ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ اتر پردیش کے چند منفرد غزل گو شعرا میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کے شعری لہجہ میں کلاسیکی دروہیت اور جدید احساسِ فکر کی لطیف آمیزش ہے۔ دراصل وہ ان ذہین اور وسیع المطالعہ جوان العمر شعرا کی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جو آزادی سے کچھ پہلے شاہجہاں پور کے ادبی اُفق پر طلوع ہوئی تھی، جس میں شبنم رومانی اور حنیف سعیدی جیسے باکمال سخنور بھی شامل تھے۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران مبارک شمیم کے ذوقِ شعری نے مزید تربیت حاصل کی۔ انھیں زبان و فن اور شعری محاورہ پر ایسی قدرت حاصل ہو گئی کہ پھر کسی استاد کے محتاج نہ رہے۔

شاعری کے علاوہ تاریخ خصوصاً روہیل کھنڈ کی تہذیبی تاریخ ان کی توجہ اور مطالعہ کا موضوع رہی ہے۔ اس سلسلہ میں ریڈیو کی ان گنت تقریروں کے علاوہ ان کے کئی مقالے بھی اردو اور ہندی میں شائع ہوئے۔ تذکرہ ”سخنورانِ شاہجہاں پور“ بھی ان کی اسی دل چسپی کا ثمرہ ہے جو انھوں نے دس سال کی تحقیق اور کاوش سے تقریباً پچھتر سال کی عمر میں مکمل کیا ہے۔ اس آئینہ میں اس علمی اور شعری ذوق و شوق کا ایک مرقع ابھر آتا ہے جو گذشتہ دو سو سال میں شاہجہاں پور کی مشترکہ تہذیب کا جوہر رہا ہے۔

